# تاریخِ نظریۂ پاکستان



پروفیسر محمد سلیم

اِدارۂ تعلیمی تحقیق ۞ تنظیمِ اساتذۂ پاکستان

# تاریخِ نظریۂ پاکستان

(مع اضافہ جدیدہ)

پروفیسر سیّد محمد سلیم



ادارہ تعلیمی تحقیق، تنظیمِ اساتذہ پاکستان، لاہور

| | |
|---|---|
| نام کتاب | تاریخ نظریۂ پاکستان |
| مصنف | پروفیسر سید محمد سلیم |
| اشاعتِ اوّل | اپریل ۱۹۸۵ء ایک ہزار |
| اشاعتِ دوم | جولائی ۱۹۸۷ء دو ہزار |

قیمت ● روپے

مہر محمد سعید اختر نے میٹرو پرنٹرز لاہور سے چھپوا کر ادارہ تعلیمی تحقیق تنظیم اساتذہ پاکستان ۸۔ اے ذیلدار پارک اچھرہ لاہور سے شائع کیا۔

# فہرست مضامین

## دوسرا باب



## تیسرا باب

## چوتھا باب

## ساتواں باب

## دسواں باب

## گیارھواں باب

## تیرھواں باب

## چودھواں باب

# اجتماعی اَنا

"ان (واقعات) کے صحیح معنی آپ پر اس وقت آشکارا ہو سکیں گے جب آپ ان کے مشاہدے کے لیے اپنے اندر ایک صحیح اجتماعی اَنا پیدا کر لیں گے۔"

علامہ اقبال
خطبہ صدارت آل انڈیا مسلم لیگ
سالانہ اجلاس منعقدہ الہ آباد۔
۲۹/ ۳۰ ر دسمبر ۱۹۳۰ء

# تقدیم

پروفیسر سید محمد سلیم معروف مصنف ہیں تنظیم اساتذہ پاکستان ان کی چند کتابیں پہلے بھی شائع کر چکی ہے۔ اب ان کی تازہ اور قابلِ قدر کتاب "تاریخ نظریہ پاکستان" پیش کرکے میں خوشی محسوس کر رہا ہوں ادھر قریبی زمانہ میں بعض خاص نقطۂ نظر کے حامل سیاست دانوں نے نظریہ پاکستان کو ہدفِ تنقید بنایا ہے اور رطب و یابس اتنی باتیں بیان کی ہیں کہ

؎ شد پریشان خوابِ من از کثرتِ تعبیرہا

محب وطن حلقوں میں اِس قسم کی تنقیدات سے بڑی بے چینی پائی جاتی ہے اور اس امر کی ضرورت محسوس کی جارہی تھی کہ کوئی اللہ کا بندہ اٹھے اور مخالفین کے اٹھائے ہوئے گرد و غبار کو صاف کر دے اور تحریکِ پاکستان کے محرکات اور مقاصد کو واضح انداز میں بیان کرے۔ یہ کتاب لکھ کر پروفیسر صاحب نے تحریکِ پاکستان کی اہم خدمت انجام دی ہے۔

ان کے نزدیک قیامِ پاکستان کوئی منفرد واقعہ نہیں ہے بلکہ اسلام کی تاریخِ ملی سے منسلک اور مربوط واقعہ ہے۔ وہ قیامِ پاکستان کو ملی تاریخ کے تناظر میں دیکھتے ہیں۔ اسلامی اقدارِ حیات کی جو رَو مدینہ کی اسلامی ریاست سے چلی تھی جو مختلف مراحل سے گزری ہے وہ پگڈنڈی اور میدان، نشیب و فراز مختلف راہوں سے گزرتی ہوئی پاکستان کی اسلامی ریاست کی صورت میں متشکل ہوئی ہے۔ تحریکِ پاکستان درحقیقت مسلمانوں کی ملی تاریخ کے دھارے سے پھوٹی ہوئی ایک شاخ ہے۔ پاکستان پر لکھنے والے تقریباً تمام ہی مصنفین نے اس اہم حقیقت کو نظر انداز کر دیا ہے۔ انھوں نے جدّ و جہدِ آزادی میں مسلمان قوم کے اندازِ فکر کو منفی انداز پر پیش کیا ہے۔ انھوں نے تحریکِ پاکستان کی رُوح کو سمجھا ہی نہیں ہے۔ پروفیسر صاحب کو ایسے تمام مصنفین سے سخت اختلاف ہے۔

اِس کتاب کی تقریب یوں ہے کہ تنظیم اساتذہ پاکستان کی سالانہ کانفرنس سکھر میں ۳۰۔۳۱ دسمبر ۱۹۸۲ء کو منعقد ہوئی تھی۔ اِس میں پروفیسر صاحب نے "جد و جہدِ پاکستان کی صحیح تاریخ" کے عنوان سے ایک مقالہ پڑھا تھا، جس کو سامعین نے بہت پسند کیا۔ اور انھوں نے پروفیسر صاحب سے گزارش کی کہ وہ اِس موضوع پر مفصّل کتاب لکھیں۔ اِس کے بعد پروفیسر صاحب نے یہ کتاب لکھی ہے۔

تاریخِ پاکستان سے متعلق ادب میں اس قابلِ قدر اضافے کو پیش کرتے ہوئے ادارہ تعلیمی تحقیق، تنظیم اساتذہ پاکستان خوشی محسوس کرتا ہے اور پروفیسر سید محمد سلیم صاحب کا بھی شکریہ ادا کرتا ہے کہ انھوں نے حسبِ سابق یہ کتاب بھی ادارہ کو دے دی۔

حافظ وحید اللہ خاں
صدر تنظیم اساتذہ پاکستان

۳۰ مارچ ۱۹۸۵ء

# جہانِ نو

جہانِ نو ہو رہا ہے پیدا وہ عالمِ پیر مر رہا ہے
جسے فرنگی مقامروں نے بنا دیا ہے قمار خانہ

علامہ اقبال

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ہ

# دیباچہ (ثانی)

پاکستان کی تاریخ پر لکھی ہوئی کتابوں میں عموماً منفی نقطۂ نظر پایا جاتا ہے حالانکہ مسلمانانِ ہند و پاکستان کی عظیم تاریخ ساز جدوجہد کو محض منفی ردِعمل بتانا ان کے ساتھ ناانصافی ہے۔ اس لیے اس کتاب میں مطالعہ پاکستان کے لیے مثبت بنیادوں کو نمایاں کیا گیا ہے۔ مزید برآں پاکستان کی جدوجہد کو ملتِ اسلامیہ کی عمومی تاریخ سے مربوط انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ پاکستان کی جدوجہد کا تناظر بھی محدود سیاسی دائرہ کار سے وسیع ہے۔ پاکستان دراصل متحدہ ہندوستان کے مسلمانوں کی دو صد سالہ جدوجہد کا ثمرہ ہے جس میں اہلِ عزیمت علمائے حال فکر و نظر رہنما اور دوسرے متعدد افراد شریک ہیں۔ مختلف گروہوں نے اپنے طور پر اس جدوجہد میں حصہ لیا۔ اس لیے کتاب میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا گیا ہے۔

اس کے لکھنے کی ترغیب ایک خاص وجہ سے ہوئی۔ بعض اغراض مند لوگ آئے دن پاکستان سے متعلق مختلف گمراہ کن شوشے چھوڑتے رہتے ہیں۔ مختلف افراد مختلف اغراض کے تحت جدوجہدِ پاکستان کی تنقیص اور مسخ کرنے کی کوشش میں شریک ہوتے ہیں۔ ضرورت اس امر کی متقاضی ہوئی کہ صحیح صورتِ حال سے باخبر کیا جائے تاکہ عوام پاکستانی ذہنی یکسوئی کے ساتھ تعمیرِ پاکستان میں مشغول رہیں اور غلط پروپیگنڈے سے بدراہ نہ ہوں۔

بہرکیف اہلِ علم کے حلقوں نے اس کتاب کی قدر کی اور تحسین کی۔ جلدی میں ہی اس کے سارے نسخے فروخت ہو گئے ایک عرصہ سے اشاعتِ ثانی کا تقاضا ہو رہا تھا۔ اشاعت کی نوبت ذرا تاخیر سے آرہی ہے۔ یہ کتاب پہلی مرتبہ عجلت میں شائع ہوئی تھی۔ اس میں کافی اغلاط رہ گئی تھیں جن کی نشاندہی مختلف دوستوں نے کی۔ ان کے مطابق اصلاح کر لی گئی ہے میں ایسے تمام دوستوں کا تشکر گزار ہوں۔ اس مرتبہ مسودہ کی تصحیح ایک محترم دوست نے بڑی محنت اور محبت سے کی ہے میں انکا بھی تشکر گزار ہوں۔ اللہ تعالیٰ انکو جزائے خیر دے۔ وما توفیقی الا باللہ

محمد سلیم

اچھرہ۔ لاہور

مورخہ یکم ذیقعدہ ۱۴۰۷ھ

۲۶۔جون ۱۹۸۷ء

# دیباچہ

برصغیر ہندوستان میں پاکستان کا قیام تاریخ کا نہایت اہم واقعہ ہے۔ قیام پاکستان کے اسباب اور محرکات دریافت کرنے کے لیے مؤرخین اور مصنفین نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ ان لکھنے والوں میں ہندو، انگریز اور مسلمان سبھی شامل ہیں۔ ترتیب مضامین اور ذاتی رجحانات کے اختلافات کے باوجود سب کا بیان تقریباً یکساں ہے۔ انگریزی دور اقتدار میں ہندوستان کے مسلمانوں نے انگریزی زبان اور مغربی علوم وفنون سے بے اعتنائی برتی۔ ان علوم کی تحصیل کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ اس کے برخلاف ہندوؤں نے انگریزی زبان اور مغربی علوم وفنون کی تحصیل میں خوب دلچسپی لی۔ ہندو سرکاری ملازمتوں پہ قابض ہو گئے حکومت کے اعلیٰ مناصب پر فائز ہو گئے ایوان حکومت اور درباروں میں جا پہنچے ہندو خوشحال اور آسودہ حال ہو گئے۔ مسلمان ان ملازمتوں سے دور رہے وہ بدحال اور پس ماندہ رہ گئے۔ وہ ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہ گئے ہندو ان سے آگے نکل گئے۔

پھر مسلمانوں میں ایک مرد مصلح سرسید احمد خان دہلوی پیدا ہوا جس کو مسلمانوں کی زبوں حالی پر بہت رنج وغم تھا۔ اس نے اصلاح حال کی کوشش کی اس نے سخت جدوجہد کے بعد مسلمانوں کو انگریزی زبان اور مغربی علوم وفنون کی تحصیل پر آمادہ کر لیا۔ اس نے مسلمانوں کی تعلیم کے لیے علی گڑھ میں مغربی تعلیم کے لیے کالج قائم کیا۔ مسلمانوں کے دلوں میں انگریزوں کے خلاف جو نفرت موجود تھی اس نے اس کو بھی دور کیا۔ اس کی کوششوں کے نتیجے میں حالات بدلنے لگے۔ بتدریج مسلمانوں نے مغربی علوم وفنون کی تحصیل شروع کر دی۔

مسلمان تعلیم پا کر جب میدان میں آئے اس وقت تک تمام سرکاری ملازمتوں پر اور تمام معاشرتی اور ثقافتی اداروں پر ہندو قابض ہو چکے تھے۔ وہ ہرگز اپنے غلبہ اور بالادستی سے دست بردار ہونے کے لیے تیار نہیں تھے۔ وہ متحدہ ہندوستان میں انگریز کی جانشینی کے خواب دیکھ رہے تھے۔ بعض ہندو انجمنوں نے اپنی قوم کے اندر مسلمانوں کے خلاف معاندانہ اور جارحانہ

پیدا کر دیا تھا۔ ان کو بتایا گیا تھا کہ مُسلمانوں نے اپنے دَورِ اقتدار میں ہندوؤں پر مظالم کیے تھے۔ اس لیے وہ اب مسلمانوں سے تاریخ کا انتقام لینا چاہتے تھے۔ انگریز سے آئینی اقتدار کی ایک دو قسطیں جب ان کو مل گئیں اور حکومت میں ان کو شریک کیا گیا تو انھوں نے مُسلمانوں کے خلاف ایسے اقدامات کیے جن سے مُسلمانوں کا مذہب، ان کی تہذیب، ان کی ثقافت، ان کی معاشرت سب خطرے میں پڑ گئے۔ مزید برآں مُسلمانوں کو خوف زدہ اور مرعوب کرنے کے لیے ملک میں جا بجا فسادات کی آگ بھڑکائی گئی۔

آغازِ کار میں مُسلمان اپنے حقوق طلب کرتے تھے۔ اور اپنی تہذیب اور ثقافت کا تحفظ چاہتے تھے۔ سیاسی معاملات میں ہندوؤں کے ساتھ مصالحت اور مفاہمت پیدا کرنا چاہتے تھے۔ مگر جب مُسلمانوں نے محسوس کیا کہ ہندوؤں کا رویّہ سخت سے سخت تر ہوتا جا رہا ہے تو مصالحت اور مفاہمت کی ساری کوششیں خاک میں مل گئیں۔ ان کے رویّے سے خصوصاً آئے دن کے فسادات سے مُسلمانوں کے اندر علیٰحدگی کے رجحانات اُبھرنے شروع ہوئے۔ ہندوؤں کے انتہا پسندانہ رویّہ سے متاثر ہو کر مسلمانوں کی قیادت نے بھی علیٰحدگی کے رجحان کو قبول کر لیا۔ بالآخر اُنھوں نے جداگانہ وطن پاکستان کا مطالبہ پیش کر دیا۔ ہندوؤں نے اس کی شدید مزاحمت اور مخالفت کی۔ انگریز بھی اپنے تخلیق کردہ متحدہ ہندوستان کے ٹکڑے ہوتے دیکھنا پسند نہیں کرتا تھا۔ مگر تمام مخالفتوں کے علی الرغم مُسلمان پاکستان حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

نقطۂ نظر کی شدت و خفت اور الفاظ کی کمی اور بیشی کے ساتھ یہ وہ داستان ہے جو عموماً ہمارے اہلِ علم مصنفین سناتے ہیں۔ اس کے بعد وہ چند منطقی نتائج نکالتے ہیں۔ مثلاً

۱۔ قیامِ پاکستان میں بنیادی جھگڑا ملازمتوں کے حصول کا تھا۔ جب مُسلمان ملازمتوں اور حقوق کے حصول میں ناکام رہے تو انھوں نے علیٰحدگی وطن کا مطالبہ پیش کر دیا۔

۲۔ تحریکِ پاکستان کے لیے کوئی مثبت بنیاد موجود نہیں ہے۔ منفی بنیادوں اور انتقامی جذبے سے ساری جنگ لڑی گئی ہے۔

۳۔ تحریک پاکستان کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہے مسلمان رہنما مسلمان عوام کے جذبات کو بھڑکانے کے لیے خواہ مخواہ اسلام کو بیچ میں گھسیٹ لائے۔

یہ وہ اعتراضات ہیں جن کو ہندو اور انگریز مصنفین اپنی کتابوں میں بیان کرتے ہیں۔

یہ ساری داستان غلط مفروضوں پر قائم ہے۔ غلط انداز پر مرتب کی گئی ہے اس لیے نتائج بھی غلط برآمد ہوئے۔ یہ نتائج تو بدیہی طور پر بھی غلط ہیں۔ غور و فکر سے غلطی واضح ہو جاتی ہے۔

۱۔ منفی بنیادوں پر وقتی اور عارضی ہنگامہ تو کھڑا کیا جا سکتا ہے لیکن پاکستان جیسی عظیم الشان قومی تحریک منفی بنیادوں پر ہرگز کھڑی نہیں کی جا سکتی ہے۔

فروغ شعلہ خس یک نفس ہے    ہوس کو پاس ناموس وفا کیا

ایک ایسی تحریک جس نے اپنوں اور غیروں کی شدید مخالفتوں اور مزاحمتوں کے باوجود جداگانہ وطن حاصل کر لیا۔ ایسی قومی تحریک ہرگز منفی بنیادوں پر استوار نہیں کی جا سکتی۔

۲۔ منفی اور عارضی بنیادوں (مقاصد) پر ایک گروہ کو اور ایک طبقہ کو تو متحرک کیا جا سکتا ہے۔ لیکن وسیع و عریض خطوں میں پھیلی ہوئی اور مختلف زبانیں بولنے والی کروڑوں پر مشتمل قوم کو جس کے کثیر افراد کا کوئی مادی مفاد اس تحریک سے وابستہ نہ ہو، ہرگز متحرک اور متحد نہیں کیا جا سکتا۔ اتنی بڑی قوم کو صرف مثبت تہذیبی اور روحانی اقدار کی بنیادوں پر ہی متفق اور متحد رکھا جا سکتا ہے۔ بادل نہ سارے آسمان پر پھیل سکتا ہے اور نہ ہمیشہ قائم رہ سکتا ہے۔

۳۔ فلسفہ بتاتا ہے اور تاریخ اس کی تائید کرتی ہے کہ قوموں کی زندگی میں مثبت اور مستحکم بنیادیں وقتی اور عارضی طور پر نہیں پیدا کی جا سکتی ہیں۔ مثبت اور مستحکم بنیادیں وہ ہوتی ہیں جو قوم کے افراد کے دلوں میں قدیم سے موجود ہوتی ہیں۔ البتہ کبھی کبھی فراموشی اور خوابیدگی کا دور ان پر طاری ہو سکتا ہے قومی مقاصد کے ذریعہ قومی رہنما خوابیدہ افراد کو بیدار کرتے ہیں۔ وہ ساکن ہوتے ہیں ان کو متحرک اور سرگرم عمل بناتے ہیں۔ اس طرح قومی مقاصد کو فروغ دیتے ہیں۔ نادان لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ قومی مقاصد کو اور قومی بنیادوں کو ان رہنماؤں نے تخلیق کیا ہے۔

تاریخ کے یہ اسباق مذکورہ بالا نتائج کو رد کر دیتے ہیں ۔ اصل بات یہ ہے کہ یہ ساری داستان ہی دانستہ طور پر غلط مرتب کی گئی ہے ۔ اس میں حقائق سے چشم پوشی کی گئی ہے ۔ اس لیے قیام پاکستان کی مذکورہ بالا داستان کو صحیح تسلیم نہیں کیا جا سکتا ۔

## غلطی کے اسباب

اب یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ اتنے بڑے بڑے مصنف اور محقق ایسی فاش غلطی میں کس وجہ سے مبتلا ہو گئے ۔ ان سے ایسی غلطی کیوں سرزد ہو گئی ۔ انھیں اپنی غلطی کا احساس کیوں نہیں ہوا ۔ اس کے چند اسباب بالکل واضح ہیں ۔

۱۔ ہندوستان میں مسلمان صدیوں تک حکمرانی کرتے رہے ہیں ۔ بعض حکمران اور امراء بلاشبہ بڑے عادل اور نیکوکار تھے ۔ اجتماعی اور انفرادی زندگی کے چند گوشے بلاشبہ اسلامی احکام کی روشنی میں سرگرم عمل رہتے تھے تاہم یہ ایک حقیقت ہے کہ یہاں ترکوں اور مغلوں کی قومی حکومت رہی ہے ۔ اسلام کی صحیح آئینی اور دستوری حکومت یہاں کبھی نافذ نہیں رہی ۔ اس وجہ سے یہاں کے بسنے والوں نے اسلامی نظام حیات کو مکمل شکل میں کبھی نہیں دیکھا ۔ نہ اسلام کے تصور قومیت سے وہ آشنا ہو سکے ۔ نہ اسلامی نظام حیات کی نعمتوں اور برکتوں سے وہ پوری طرح مستفید ہو سکے ۔ مسلمانوں کی ایک مخلوط قسم کی حکومت سے ان کا سابقہ رہا ۔ اس لئے غیر مسلموں نے نہ اسلام کو سمجھا اور نہ مسلمان قومیت کو سمجھا ۔

۲۔ انگریز کی استعماری حکومت نے اپنے دور اقتدار میں مغرب سے درآمد کردہ لادینی نظام حکومت اور وطنی تصور قومیت کو ہندوستان کے طول و عرض میں رائج کر دیا ۔ معیشت ، معاشرت ، سیاست اور تعلیم میں مغرب کے لادینی تصورات کو نافذ کر دیا ۔ حکومت کے ذرائع اور وسائل نے ان کے حق میں زبردست پروپیگنڈا کیا ۔ ساری فضا ان تصورات سے گونجنے لگی ۔ ہندوؤں نے ان تصورات کو جوں کا توں قبول کر لیا ۔

آغاز میں مسلمانوں نے ان اجنبی تصورات کی پُر زور مخالفت کی۔ وہ اپنی تہذیب کو ترک کرنے اور مغربی تہذیب کو اختیار کرنے کے لیے آمادہ نہیں تھے۔ مگر ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں انھوں نے شکست کھائی، انگریزوں نے انھیں بری طرح کچلا۔ بعد میں ایک مدت تک تو وہ ڈرے ہوئے اور سہمے ہوئے رہے۔ پھر وہ پریشان نظری اور پراگندہ فکری میں مبتلا ہو گئے۔ معاندانہ ماحول سے وہ متأثر ہوتے بغیر نہ رہ سکے۔ ان کا ذہن ماؤف ہو گیا۔ ان کی عقل سقیم ہو گئی۔ ان کی فکر کند ہو گئی۔ ان پر ذہول شخصیت اور خود فراموشی کا دورہ طاری ہو گیا۔ اپنی تاریخ، اپنی تہذیب اپنی انفرادیت اور اپنے ملی تشخص کو پسِ پشت ڈال کر وہ بھی اس پروپیگنڈا سے متأثر ہو گئے۔ انھوں نے بھی اہلِ اقتدار کی ہاں میں ہاں ملانا شروع کر دی۔ انھوں نے بھی مغربی تصورات کو قبول کر لیا۔

اب تمام مؤرخین اور مصنفین اس دور کو جب ہندوستان کی دونوں بڑی قوموں نے مغربی تصورات قومیت اور لادینی نظامِ حیات کو قبول لیا تھا، متفق علیہ بنیاد قرار دیتے ہیں۔ اور اس بنیاد پر اپنی تصنیفی عمارت تعمیر کرتے ہیں۔ درحقیقت وہ غلط بنیاد پر غلط عمارت تعمیر کرتے ہیں۔

چاہیے تو یہ تھا کہ انگریزی استعمار کے اس مختصر سے دور کو بنیاد بنانے کے بجائے وہ ملتِ اسلامیہ کی ہزار سالہ درخشندہ تاریخ کو پیشِ نظر رکھتے۔ انھیں نظر آتا کہ مسلمان ایک نظریاتی قوم ہیں۔ اسلامی نظریہ قومیت وطنی قومیت سے مطابقت نہیں رکھتا ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں کی زندگی میں وطنی قومیت کا تصور ایک درآمد کردہ تصور ہے۔ اس لیے اجنبی ہے اور اسلامی مزاج سے غیر ہم آہنگ ہے۔

۲۔ ایک دوسری قسم کی کوتاہ بینی اور کوتاہ نظری میں بھی یہ بزرگ محققین اور مصنفین مبتلا ہو گئے۔ سب لوگ انگریز کے قائم کردہ خطوطِ راہ پر چلتے ہوئے جدوجہد آزادی کا آغاز ۱۸۵۷ء سے کرتے ہیں۔ مسلمانوں کی جدوجہد آزادی کا آغاز بھی وہ اسی سنہ سے شروع کرتے ہیں۔

یہ مسلمانوں کے ساتھ صریح ناانصافی ہے۔ یہ تاریخ کو مسخ کرنا ہے۔ جنگ پلاسی ۱۷۵۷ء کے بعد انگریزوں نے بنگال (ہندوستان) میں پہلی مرتبہ اپنی حکومت قائم کی مسلمانوں نے آزادی کی جدوجہد اسی وقت سے شروع کر دی۔ جو بلا انقطاع کامل ایک صدی تک جاری رہی۔ یہ مسلمان بادشاہوں کی جنگ نہیں تھی۔ بلکہ مسلمان عوام کی اور مسلمان علماء کی جنگ تھی جو جذبہ جہاد سے سرشار ہو کر میدان کارزار میں انگریز کے خلاف نبرد آزما رہے۔ کامل ایک صدی (۱۷۵۷ء-۱۸۵۷ء) کی یہ جدوجہد انگریزوں نے پردوں میں چھپا دی۔ ذہنوں سے محو کر دی کتابوں سے غائب کر دی۔ اب حالت یہ ہے کہ انگریز ہو، ہندو ہو، مسلمان ہو سب جدوجہد آزادی کو ۱۸۵۷ء سے شروع کرتے ہیں۔ سب انگریز کی بنائی ہوئی ڈگر پر چل رہے ہیں۔ سب ہی کوتاہ نظری اور کوتاہ بینی کا شکار ہو گئے کسی کا ذوق تجسس گم شدہ صدی کے واقعات دریافت کرنے اور ماضی کو کریدنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ کیا نظریاتی مسلمان قوم یک لخت نظریہ بھول گئی تھی؟ کیا مسلمان قوم حاکمیت سے معزول ہو جانے کے بعد غفلت کی نیند سو گئی تھی؟ کیا ان کے اندر کوئی حرکت پیدا نہیں ہوئی؟

مختصراً یہ وہ اسباب ہیں جن کی بنا پر یہ فاضل مصنفین اور لائق محققین نظریہ پاکستان اور تحریک پاکستان کا فہم حاصل کرنے میں ناکام رہے۔ تحریک پاکستان کے حقیقی محرکات دریافت نہ کر سکے۔ اور اسی باعث جدوجہد پاکستان کی صحیح تاریخ لکھنے سے قاصر رہ گئے۔

اس کتاب میں پیش نظر قیام پاکستان کی صحیح مگر مختصر تاریخ لکھنا ہے۔ بعید اور قریب عوامل کی نشان دہی کرنا ہے ہندوستان میں دستوری اصلاحات کا ارتقاء یا مسلم لیگ کی تاریخ لکھنا پیش نظر نہیں ہے۔ میرا مقصود نظریہ پاکستان کا ارتقاء دکھانا ہے۔

سید محمد سلیم۔ نواب شاہ

۱۲ ستمبر ۱۹۸۴ء

## پہلا باب

# اسلام کا نظامِ زندگی اور بعد کے تغیرات

## نظریہ پاکستان

نظریہ پاکستان نظریہ اسلام اور نظام اسلام کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ نظریہ پاکستان اوّل روز سے پاکستان کے ساتھ وابستہ ہے۔ پاکستان کا تصور پیش کرتے وقت علامہ اقبال نے فرمایا تھا۔

"ایک ایسا خطہ زمین درکار ہے جہاں اسلامی اقدار حیات کو انفرادی تشکیل سیرت اور اجتماعی کردار سازی کا پورا موقعہ حاصل ہو۔"

پاکستان کے مطالبہ کے زمانہ میں جو بات بار بار کہی جاتی تھی وہ یہ تھی کہ

"اسلامی تہذیب اور ثقافت کے تحفظ کے لیے پاکستان درکار ہے۔"

۱۹۴۶ء کے تاریخی انتخابات میں تو ہر شخص کی زبان پر یہ نعرہ تھا کہ

"پاکستان کا مطلب کیا، لا إلہ الا اللہ محمد رسول اللہ"

پاکستان بن جانے کے بعد پہلے وزیر اعظم لیاقت علی خاں نے امریکہ کا دورہ کیا تھا۔ وہاں اُنھوں نے امریکی کانگریس کو خطاب کیا تھا۔ وہاں اُنھوں نے کہا تھا کہ "پاکستان کا قیام اسلام کے لیے ایک لیبارٹری (دارالعمل) ثابت ہوگا۔" پاکستان کے پہلے وزیر اعظم کا یہ پہلا ذمہ دارانہ بیان تھا جس میں امریکہ کے اندر پاکستان کا تعارف اسلام کے حوالہ سے کرایا گیا تھا۔

ن بیانات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اوّل روز سے پاکستان اور اسلام لازم ملزوم
ہیں پاکستان ظرف ہے اور اسلام مظروف ہے۔ ہم کہتے ہیں بادل برس رہا ہے۔ حالانکہ پانی برستا
ہے ۔ بادل پانی کا ظرف ہے۔ اس لئے جب بھی نظریہ پاکستان کا لفظ بولا جاتا ہے تو اس سے نظریہ
اسلام مراد ہوتا ہے۔

بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ نظریہ پاکستان کا لفظ پاکستان بن جانے کے بعد سے استعمال
ہونے لگا ہے۔ یہ بات درست نہیں ہے۔ نظریہ پاکستان کا لفظ قرارداد پاکستان پاس ہو جانے کے
بعد ۱۹۴۰ء سے مستعمل ہے۔ قائداعظم خود کبھی نظریہ پاکستان Ideology of Pakistan
اور کبھی نظریہ اسلام Ideology of Islam. کے الفاظ استعمال کرتے تھے۔[1] فضل کریم
خان درانی مدیر مارننگ نیوز لاہور نے ۱۹۴۴ء میں ایک کتاب لکھی تھی، Meaning of
Pakistan اس میں تو یہ لفظ بار بار استعمال ہوا ہے۔

## اسلام کا نظام زندگی

اسلام دوسرے مذاہب کی طرح بزرگوں سے سنی سنائی روایات کا مجموعہ نہیں ہے۔
اسلام اللہ کی نازل کردہ کتاب قرآن مجید اور اللہ کے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت
پر مبنی ضابطہ حیات اور نظام زندگی ہے۔ یہاں ہر چیز محفوظ ہے۔ یہاں ہر چیز روز روشن کی طرح
نمایاں ہے۔

مذہب کا جو تصور اس وقت عام طور پر دنیا میں رائج ہے، اس کے اعتبار سے اسلام
ایک مذہب سے بہت کچھ زیادہ ہے۔ یہ محض خالق اور بندے کے درمیان تعلق کا نام نہیں ہے۔
یہ محض پوجا پاٹ، گیان دھیان کے رسومات پر مشتمل نہیں ہے۔ اسلام کا تصور مذہب وسیع بھی
ہے اور عمیق بھی ہے۔ درحقیقت یہ انسانوں کے لیے دنیا میں کامیاب زندگی بسر کرنے کا ایک
جامع نظام ہے۔ انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں پر یہ حاوی ہے۔ یہ دنیاوی زندگی اور آخرت کی

[1] ے

زندگی دونوں پر حاوی ہے۔ یہ دونوں میدانوں میں کامیاب زندگی بسر کرنے کی راہ دکھاتا ہے۔ اس لیے اسلام کا تصور مذہب دوسرے مذاہب کے تصورات سے یکسر مختلف ہے، اسلام کو سمجھنے کے لیے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔

کتاب و سنت کا اسلام چھ اجزاء پر مشتمل ہے۔

۱۔ **عقائد** ــــــ اللہ، رسالت، آخرت کے متعلق بنیادی عقائد۔ انسان اور کائنات کی حیثیت، مقصود و مآل زندگی وغیرہ عقائد یہ وہ بنیادی چٹان فراہم کرتے ہیں جس پر اسلامی زندگی کی عمارت تعمیر ہوتی ہے۔

۲۔ **عبادات** ــــ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، جہاد وغیرہ۔
عبادات سے فائدہ عقائد کا اعادہ اور استحضار ہے۔ تاکہ وہ ہر وقت ذہن میں تازہ رہیں۔

۳۔ **فقہ** ــــــ ان عقائد کی بنا پر ایک نئے قسم کا انسان اور نئے قسم کا معاشرہ وجود میں آتا ہے۔ اسلام اس انسان کی پرورش کرتا ہے۔ اور تکمیل کرتا ہے۔ انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تمام پہلوؤں کے متعلق بنیادی اور اصولی احکام دیتا ہے۔ معیشت، معاشرت، معاشیات، سیاسیات، بین الاقوامی تعلقات، تعلیم و تربیت دعوت و تبلیغ کے متعلق احکامات دیتا ہے۔

۴۔ **عدلیہ** ــــــ قانون، حدود اللہ، تعزیرات اور جنایات وغیرہ کے متعلق احکامات دیتا ہے۔

۵۔ **اخلاق** ــــــ اخلاق حسنہ اور آداب زندگی کی تعلیم دیتا ہے۔ اخلاق مذمومہ اور منکرات و فواحشات سے روکتا ہے۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا حکم دیتا ہے۔

۶۔ **احسان** ــــــ چھوٹے بڑے ہر کام میں اخلاص اور نیت مقصود اصلی ہے۔ ہر کام میں خدا کی رضا مقصود اور مطلوب ہونا چاہیئے۔

ان اجزاء پر ایک نظر ڈالنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ رواجی تصورات مذہب

سے اسلام کہیں ارفع اور اعلیٰ ہے۔ اسلام ایک تہذیب ہے۔ ایک تمدن ہے، ایک جامع نظام حیات ہے۔ اسلام بنی نوع بشر کی تمام ضرورتوں کا کفیل ہے۔ تہذیب و تمدن کے ہر گوشہ میں اسلام رہنمائی فراہم کرتا ہے۔ اسلام ایک خود مکتفی وحدت ہے۔ اسلامی نظام کے تمام اجزاء باہم مربوط ہیں۔ اسلام کی بہار یک تنجی ہے۔ دوسری تہذیبوں کی طرح نہ تالیفی مجموعہ ہے نہ ترکیبی آمیزہ ہے۔ اور سب سے مستزاد بات یہ ہے کہ اسلام جن اصولی احکام پر مبنی ہے وہ زمان و مکان کی محدودیت اور فرسودگی سے برتر و بالا ہیں۔ وہ حی وقیوم خداوند تعالیٰ کے بھیجے ہوئے ابدی احکام ہیں۔

اسلام پر گفتگو کرنے والے ہر شخص پر ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ پہلے وہ اسلام کے تصور مذہب کو اچھی طرح سمجھ لے۔ اسلام کے نظام حیات کی وسعت اور گہرائی کا پوری طرح ادراک حاصل کرے۔ تب زبان کھولے۔

اسلام کے تصور تاریخ کے مطابق یہ دین حق سب سے پہلے، حضرت آدم علیہ السلام پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا تھا جو اس دنیا میں سب سے پہلے انسان تھے۔ ان کے بعد نسل انسانی اس کرۂ ارضی پر پھیلی ہے۔ اس وقت سے یہ دین حق دنیا میں جاری ہے۔ وقتاً فوقتاً انبیاء کرام آتے رہے اور اس دین حق کو جلا دیتے رہے۔ اس دین کو آخری جلا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ ملی ہے۔ ان پر یہ دین مکمل ہو گیا۔ آج ہدایت الٰہی کی کتاب صرف قرآن مجید اور ہدایت الٰہی کا اسوہ صرف سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ جو کچھ اس کے باہر ہے وہ ضلالت ہے۔ فماذا بعد الحق الا الضلال۔

## اسلام کا تصور قومیت

اس دین کو اور اس نظام کو دل و جان سے ماننے والے افراد مومن اور مسلمان کہلاتے ہیں۔ اور اس دین کو رد کر دینے والے افراد کافر کہلاتے ہیں۔ مومن اور کافر ہرگز دونوں برابر

نہیں ہیں۔ پہلے انسان اور پہلے نبی حضرت آدم علیہ السلام کو دنیا میں بھیجتے وقت اللہ تعالیٰ نے درج ذیل ہدایات دی تھیں۔

"ہم نے کہا کہ تم سب یہاں (جنت) سے اتر جاؤ۔ پھر میری طرف سے جو کوئی ہدایت تمہارے پاس پہنچے، تو جو لوگ میری اس ہدایت کی پیروی کریں گے، ان کے لیے کسی رنج اور خوف کا موقعہ نہیں ہوگا۔ اور جو لوگ اس کو قبول کرنے سے انکار کردیں گے، اور ہماری آیات کو جھٹلائیں گے، وہ آگ میں جانے والے ہیں، جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ (البقرہ : ۳۸، ۳۹)

یہ آیات بتاتی ہیں کہ ہدایت الٰہی نے انسانوں کو دو گروہوں میں تقسیم کردیا ہے —— مومن اور کافر۔ یہ تقسیم اول روز ہی کردی گئی تھی۔ ہر نبی نے اپنے زمانے میں یہ تقسیم برقرار رکھی حضرت شعیب علیہ السلام نے ان دو گروہوں کو جدا جدا ملت سے تعبیر کیا۔

"اس کی قوم کے سرداروں نے جو اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں مبتلا تھے، اس سے کہا کہ اے شعیب! ہم تجھے اور ان لوگوں کو جو تیرے ساتھ ایمان لاتے ہیں اپنی بستی سے نکال دیں گے۔ ورنہ تم لوگوں کو ہماری ملت میں واپس آنا ہوگا۔ شعیب نے جواب دیا۔ کیا زبردستی ہمیں پھیرا جائے گا، خواہ ہم راضی نہ ہوں۔ ہم اللہ پر جھوٹ گھڑنے والے ہوں گے اگر ہم تمہاری ملت میں واپس پلٹ آئیں، جبکہ اللہ ہمیں اس سے نجات دے چکا ہے۔" (اعراف : ۸۸، ۸۹)

حضرت یوسف علیہ السلام اس سلسلہ میں فرماتے ہیں: "واقعہ یہ ہے کہ میں نے ان لوگوں کی ملت چھوڑ دی جو اللہ پر ایمان نہیں لاتے اور آخرت کا انکار کرتے ہیں۔ اور اپنے بزرگوں ابراہیم اسحاق اور یعقوب کی ملت اختیار کی ہے۔"

(یوسف : ۳۸)

یہ آیات واضح طور پر بتاتی ہیں کہ گزشتہ زمانہ میں بھی مسلمانوں کی ملت جداگانہ تھی

اور کافروں کی ملت جداگانہ۔ مدینہ منورہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامی ریاست قائم کی۔ اس کے لیے دستور تیار کیا۔ اس میں مسلمانوں کو ایک اُمت اور یہودیوں کو دوسری اُمت قرار دیا۔ (سیرت ابنِ ہشام) یہی تقسیم اور یہی اصطلاح اُمتِ محمدیہ میں برقرار ہے اور آج تک استعمال ہوتی ہے۔ حضرت حسن بصری کا قول ہے۔ الکفر ملۃ واحدۃ والاسلام ملۃ واحدۃ۔ اسلام ایک علیحدہ ملت ہے۔ کفر ایک دوسری ملت ہے۔ مسلمانوں میں جو شخص علم و فضل میں برتر مقام حاصل کر لیتا ہے اس کو خطاب سے نوازتے ہیں۔ مثلاً کہتے ہیں ظفر الملۃ والدین۔ جدید دور میں اسلامی ملت کو اسلامی قومیت سے تعبیر کرنے لگے۔ بہرکیف اسلام ایک جداگانہ ملت ہے اور جُداگانہ قوم ہے۔

اسلام کا تصورِ قومیت آفاقی ہے اور عالمگیر ہے۔ کسی خطہ کسی ملک کسی نسل کا فرد ہو کلمہ شہادت پڑھ لینے کے بعد وہ دینِ اسلام میں داخل ہو جاتا ہے اور اسلامی قومیت میں برابر کا شریک ہو جاتا ہے اسلام میں عقیدہ یعنی نظریہ حیات کا اقرار حصولِ قومیت کے لیے کافی ہے۔

دنیا کی دیگر اقوام کا مسلک حصولِ قومیت کے بارے میں اسلام سے بالکل مختلف ہے۔ یہودیت میں حصولِ قومیت کے لئے یہودی نسل کا ہونا ضروری ہے ہندوؤں میں قومیت کے حصول کے لیے ہندو رسوم و رواجات میں شرکت کافی ہے۔ عقیدہ کے اقرار کی ضرورت نہیں ہے۔ یورپ میں حصولِ قومیت کے لیے ہم وطنی کی شرط کافی ہے۔ وہاں نہ عقیدہ سے دلچسپی ہے نہ نظریہ حیات سے۔ البتہ اشتراکی روس اس بات کا دعوے دار ہے کہ اس کے یہاں قومیت کے حصول کے لیے ہم وطنی کے ساتھ اشتراکی نظریہ حیات پر ایمان لانا ضروری ہے۔

## خودمختار آزاد معاشرہ

اسلام کے جامع نظامِ حیات اور جُداگانہ قومیت کا منطقی تقاضا یہ ہے کہ اس کے لیے ایک آزاد اور خودمختار معاشرہ قائم ہو۔ ایک آزاد ریاست اور مملکت ہو جہاں اس کے احکام

نافذ العمل ہوں۔ اسلام کے مکمل نفاذ کے لیے ایک آزاد ریاست کا وجود ناگزیر ضرورت ہے۔ محکومی اور مقہوری کی حالت میں اسلام کے بیشتر اجزاء پر عمل درآمد ممکن نہیں ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔ الملک والدین توأمان، دین اسلام اور اسلامی ریاست دونوں جڑواں بھائی ہیں۔ نظام اسلام پر عمل درآمد کے لیے آزاد معاشرہ اور آزاد ریاست کا قیام ایک طبعی ضرورت ہے۔ فقہاء کرام کے نزدیک اسلامی ریاست کا قیام فرض کفایہ ہے۔

۱۳ سال مکہ مکرمہ میں محکومی اور مقہوری کی زندگی گزارنے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ کے سازگار ماحول میں پہنچے تو آپ نے وہاں اسلامی ریاست قائم کر دی۔ اسلامی سنہ کا آغاز ہجرت سے ہوتا ہے۔ ہجرت اسلامی ریاست کے قیام کے مترادف ہے اس سے اسلام میں ریاست اور حکومت کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔ اور آپ خود اس ریاست کے سربراہ بنے۔ وہاں آپ نے پوری طرح اسلامی احکام نافذ فرمائے۔ وہاں آپ نے صحیح اسلامی معاشرہ قائم فرما دیا۔ تب اللہ تعالیٰ نے مشہور آیت نازل فرمائی "آج میں نے تمہارا دین مکمل کر دیا" تکمیل دین اس وقت ہوئی جب دین کی تکمیل، تنفیذ اور اشاعت کے لیے ایک جداگانہ خطہ مل گیا۔ اور ایک آزاد معاشرہ قائم ہو گیا ایک آزاد ریاست قائم ہو گئی۔ علامہ شبیر احمد عثمانی مدینہ کی اسلامی ریاست کو "پہلا پاکستان" قرار دیتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

> "مشیئت الٰہی کے زبردست ہاتھ نے آخر کار اپنے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخی ہجرت سے مدینہ طیبہ میں ایک طرح کا پاکستان قائم کر دیا۔"[1]

آپ کے انتقال فرما جانے کے بعد آپ کے جانشین خلفاء راشدین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم آپ کی بتائی ہوئی سنت کے مطابق حکمرانی کرتے رہے۔ اس دور میں اسلام کا نظام اپنی پوری تابانی کے ساتھ جلوہ گر ہوا۔ قول و عمل، صورت و معنی دونوں اعتبارات سے یہ صحیح اسلامی

---

[1] خطبات عثمانی۔ از علامہ شبیر احمد عثمانی۔ ص ۱۴۰۔
ہاشمی بک ڈپو۔ بازار سریان والا۔ لاہور۔ ۱۹۴۶ء

معاشرہ تھا اور یہ صحیح اسلامی ریاست اور حکومت تھی لوگ دین حق کی نعمتوں سے مستفید ہو رہے تھے۔ زمین پر بسنے والوں پر اللہ تعالیٰ کی رحمتیں اور برکتیں نازل ہو رہی تھیں۔

## اسلامی نظامِ حیات میں تغیرات

جلدی ہی جدید نظامِ خلافت وحکومت پر قدیم ملوکیت حملہ آور ہو گئی۔ اس کے باعث اسلامی نظامِ حیات میں دوررس تغیرات نے جنم لینا شروع کر دیا۔ اسلامی نظامِ حیات کے خصائص اور امتیازات بتدریج متغیر ہونے شروع ہو گئے۔ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں۔

"یہ ایک افسوس ناک حقیقت ہے، مگر حقیقت ہے، کہ اسلامی دعوت کی وسعت جو انسانی زندگی کے ہر گوشے تک وسیع تھی، وہ گھٹتے گھٹتے صرف چند عقائد اور چند عبادات تک محدود ہو کر رہ گئی۔ بنی اُمیہ نے اپنے عمل سے سیاست کو دین سے خارج کر دیا۔ بنی عباس نے تہذیب وتمدن و آداب کو بھی دین کی ہمہ گیری سے الگ کر دیا۔ اس کے بعد ایرانی اور ترکی سلاطین نے قانون شریعت کے ساتھ آئین نوشیروانی کو شامل کر دیا۔ جب تاتاری عالمِ اسلام کے حکمران بن گئے تو انھوں نے شریعت میں تورۂ چنگیز خانی کا اضافہ کر دیا۔ وہ دین تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رکھتے تھے، مگر ان کی سیاست اور خراج و باج کے طریقے آئین قیصر وکسریٰ اور چنگیز خاں اور ہلاکو خاں کے دستور اور قواعد پر مبنی تھے۔ اس لیے ہماری پچھلی سلطنتیں مسلمان تو ضرور تھیں، مگر اسلامی نہ تھیں۔ ان کے فرماں روا مسلمان تھے مگر ان کا قانون اسلامی نہ تھا، جس طرح آج انگریزی عہد میں "محمڈن لا" جاری ہونے سے کوئی سلطنت اسلامی نہیں ہو سکتی۔ الا یہ کہ ان کے لیے اسلام کے استعمال میں ہم ایک نوع کا مجاز اور تسامل برتتے ہیں۔"[1]

---

[1] رسالہ معارف عنوان اسلامی حکومت، اعظم گڑھ۔ اکتوبر ۱۹۴۰ء

# تغیّرات اور بدعات کے خلاف جہاد

کوئی شخص یہ گمان نہ کرے کہ مسلمان معاشرے نے یہ ناگوار تغیرات اور تبدیلیاں خاموشی سے قبول کرلی تھیں ہرگز ایسا نہیں ہوا اہلِ علم اور صاحب عزیمت مسلمانوں نے ان بدعتوں کے خلاف مسلسل جدوجہد کی۔ ان غلط کار حکمرانوں کے خلاف علمِ جہاد بلند کیا سب سے پہلے خانوادۂ اہلِ بیت کے چشم و چراغ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے بدعت کاروں کے خلاف جہاد کا آغاز کیا (۶۱ھ) پھر حضرت ابوبکر صدیقؓ کے نواسے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے ۱۳ سال تک ان غلط کار حکمرانوں کے خلاف محاذ قائم رکھا (۷۳ھ) اموی گورنر حجاج بن یوسف کے خلاف عبدالرحمٰن ابن الاشعث نے جہاد کیا۔ تین سو علماء اور فضلاء ان کے ہمراہ تھے۔ پھر زید بن علی (۱۲۱ھ) اور یحییٰ بن زید (۱۲۵ھ) نے بنی امیہ کے خلاف جہاد کیا۔ جب حکومت بنی عباس میں منتقل ہوگئی (۱۳۲ھ) تب بھی جہاد جاری رہا۔ خاندان اہلِ بیت میں سے محمد ذوالنفس الزکیہ ۱۴۵ھ۔ اور ان کے بھائی ابراہیم نے جہاد کیا۔ جن کی تائید جلیل القدر علماء امام ابوحنیفہ کوفی اور امام مالک مدنی نے کی۔

ان جہادوں اور قربانیوں کی صدائے بازگشت ایوانِ حکومت میں بھی سنی جاتی تھی حکمران متاثر ہوتے تھے اور اصلاح حال کی کوشش کرتے تھے خواہ جزوی ہی سہی حضرت عمر بن عبدالعزیز (۹۹-۱۰۲ھ) نے تخت پر بیٹھتے ہی دوررس اصلاحات نافذ شروع کردیں۔ انھوں نے حکومت کا سارا کاروبار اپنے پیش رو خلفاء راشدین خاص طور پر اپنے نانا حضرت عمرؓ کے نمونہ پر چلایا۔ ان کے بعد بھی کبھی کبھی ایسے خلفاء نمودار ہوجاتے تھے جو خلفاء راشدین کے نمونہ کی پیروی کرتے تھے۔ خواہ جزوی ہی سہی۔ خواہ انفرادی زندگی میں سہی۔ جیسے سلطان صلاح الدین ایوبی اور اورنگ زیب عالمگیر۔

## تدوین علوم اسلامی

ایک حد درجہ اہم خدمت علماء حق نے یہ انجام دی کہ علوم دین اور قانون شریعت کی ترتیب، تدوین، استنباط اور انطباق کا اہم کام شاہی درباروں اور ایوانوں کی حدود سے دور مسجدوں اور مدرسوں کی آزاد فضاؤں میں کرتے رہے۔ اُنھوں نے شعوری طور پر اہتمام کیا اور تدوین قانون میں شاہی اثرات کو دخل اندازی کا موقعہ فراہم نہیں کیا۔ یہ مہتم بالشان کارنامہ ائمہ اسلام امام ابوحنیفہ (۸۰ – ۱۵۰ھ) امام مالک (۹۵ – ۱۷۹ھ) امام شافعیؒ (۱۵۰ – ۲۰۴ھ) امام احمد بن حنبل (۱۶۴ – ۲۴۱ھ) اور دوسرے آئمہ نے سرانجام دیا۔ یہ علماء اسلام کا انتہائی قابل فخر کارنامہ ہے۔ ان علماء حق کی ان مستحسن کوششوں کے نتیجہ میں قرآن اور احادیث سے استنباط کردہ فقہ اور قانون کا معتبر اور مستند ذخیرہ تیار ہوگیا جس میں جاہلیت کے اثرات بالکل نہیں۔ یہ ذخیرہ امت مسلامیہ کے لیے سرمایہ افتخار ہے۔ اس طرح دین اسلام کا قانونی پہلو محفوظ ہوگیا فقہی استنباط و دلائل کی ایسی روشن شاہراہ ان آئمہ کرام نے قائم کردی جس کے بعد انحراف اور زیغ کے لیے کم گنجائش باقی رہ گئی۔

## اسلامی نظام کے مختلف شعبوں پر عمل

ان تاریخی واقعات کو پڑھ کر مستشرقین اور جدید دور کے مسلمان یہ خیال کرنے لگتے ہیں کہ خلافت راشدہ کے بعد سے اسلامی نظام ختم ہونے لگا تھا۔

ایسا سوچنے میں مغربی اندازِ فکر نے بھی تقویت پہنچائی ہے۔ مغرب میں یہ کلیت پسند Totalitaran حکومتوں کا چلن ہے۔ وہاں حکومت عوام کے ہر چھوٹے بڑے معاملہ میں دخیل ہوتی ہے۔ حکومت کی گرفت سے نہ کوئی فرد آزاد ہے اور نہ کوئی طبقہ۔ عوام کا بناؤ بگاڑ بڑی حد تک حکومت کے دست تصرف میں ہوتا ہے۔

جس سانچے میں حکومت عوام کو ڈھالنا چاہتی ہے خواہی نخواہی عوام اسی میں ڈھلتے ہیں۔ لیکن مغربی افکار کے غلبہ سے قبل عالم اسلام میں کہیں بھی ایسی صورت حالات نہ تھی۔ حکومت کے اثرات درباری امراء سے آگے کم ہی متجاوز ہوتے تھے۔ عوام الناس دربار کی خرمستیوں اور بے اعتدالیوں سے کم ہی متاثر ہوتے تھے۔ وہ حسب سابق اپنی روش پر چلتے رہتے تھے۔

اس عدم تاثر کے کئی اسباب تھے۔ اوّل یہ کہ اسلامی دور میں حکومت کو اس درجہ مرکزیت حاصل نہیں تھی۔ اسلامی احکام اور قوانین کا غالب حصہ عوام کو خطاب کر کے پیش کیا گیا ہے۔ وہ عام مسلمان حکومت کی مداخلت کے بغیر ان پر عمل پیرا ہوتے تھے۔ سارے شعبے مرکز کے ہاتھ میں نہیں تھے۔

عدلیہ اور شریعت کے نفاذ کا مسئلہ قاضیوں اور مفتیوں سے تعلق رکھتا تھا۔ نزاعات اور خصومات کے فیصلے قاضی اور مفتی مل کر کرتے تھے۔ امراء اور حکام ان فیصلوں کو نافذ کر دیتے تھے۔ کم ہی کوئی حاکم ان فیصلوں میں مداخلت کرتا تھا۔ اور جو ایسا کرتا تھا وہ عوام الناس میں اپنی عدم مقبولیت کا خطرہ مول لیتا تھا۔ ان قاضیوں اور مفتیوں کا منصب عموماً وراثتاً منتقل ہوتا رہتا تھا۔ زمین کا ایک قطعہ بطور وجہ معاش ان کو موروثی طور پر ملا ہوا ہوتا تھا۔ اس لیے یہ لوگ معاشی اعتبار سے اور انتظامی اعتبار سے آزاد اور خود مختار ہوتے تھے۔ اپنے ضمیر کے سامنے اور آخرت میں خداوند تعالیٰ کے سامنے خود کو جواب دہ سمجھتے تھے۔ اس لیے دار السلطنت میں خواہ سیاسی تبدیلیاں آتی رہیں ملک کا نظام عدل ان قاضیوں کے ہاتھوں میں محفوظ تھا وہ بغیر کسی دخل اندازی کے بغیر کسی خلل کے ہمیشہ چلتا رہتا تھا۔

اسلام کا شعبہ تعلیم اور تربیت بھی آزادانہ طور پر کام کرتا رہتا تھا۔ علماء کرام مساجد اور مدارس میں درس و تدریس کی بساط بچھائے رکھتے تھے۔ تقرب الی اللہ اور عبادت سمجھ کر وہ یہ فریضہ انجام دیتے رہتے تھے۔ تعلیم کا سارا کاروبار مفت چلتا تھا طلبہ سے کوئی فیس نہیں لی جاتی تھی۔ بادشاہ

اور اُمراء نظام تعلیم میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کرتے تھے۔ البتہ وہ عطیات اوقاف اور معافیات سے ان فاضل علماء۔ اور مدرسین کی مالی معاونت ضرور کرتے تھے۔ مدارس کا نظم ونسق، نصاب تعلیم امتحان، سند فراغ سب کام خالصتہً علماء کے ہاتھ میں ہوتا تھا۔

عمومی تعلیم اور اصلاح اخلاق اور احتساب کا شعبہ بھی عُلماء کے ہاتھوں میں ہوتا تھا۔ وہ عام مسلمانوں کے اخلاق اور کردار کی نگرانی کرتے تھے۔ اور خدا خوفی سے یہ فرائض انجام دیتے تھے۔ آئمہ وعظ و تلقین خطبے اور تقریروں کے ذریعہ عام مسلمانوں کی تعلیم وتربیت کا فریضہ انجام دیتے تھے۔ منبر و محراب کی آواز بڑی طاقتور ہوتی تھی۔ دربار اور ایوان حکومت بھی ان کی زد سے باہر نہیں ہوتا تھا۔ مقبول عام آئمہ کی تلخ تنقیدوں کے گھونٹ صاحبان اقتدار وحکومت کو طوعاً وکرھاً حلق سے نیچے اتارنے پڑتے تھے۔ شر کی قوتیں ان آئمہ اور خطباء کے دم سے لرزہ براندام رہتی تھیں۔ وہ اپنے مواعظ میں ہر بُرائی کا انسداد کرتے تھے۔ اس کی مذمت کرتے تھے۔ عوام کو قرآن وسُنّت کی صراطِ مستقیم دکھاتے تھے۔

تربیت اخلاق، تعمیر سیرت اور تزکیہ نفس کا شعبہ صوفیاء کرام اور مشائخ عظام کے ہاتھوں میں ہوتا تھا۔ وہ خانقاہوں اور مسجدوں میں بیٹھ کر مخلوق خدا کی اصلاح اور تربیت کا فریضہ انجام دیتے تھے۔ گناہ آلود زندگی سے توبہ کراتے تھے۔ نیک اور صالح زندگی بسر کرنے کی تلقین کرتے تھے۔ اخلاق محمودہ سکھاتے تھے۔ اخلاق رذیلہ چھڑاتے تھے۔ اللہ اور رسول ؐ کی محبت کا بیج دلوں میں اُگاتے تھے۔ شیخ طریقت درحقیقت ایک مربی شخص ہوتا تھا۔ اپنے اخلاق فاضلہ، دِل سوزی اور بے لوثی سے عوام کی تربیت کرتا تھا۔ ہر عمر اور ہر طبقہ کے لوگ ان خانقاہوں سے فیض حاصل کرتے تھے۔ اس طرح عوام کی اخلاقی اصلاح اور تعمیر سیرت درباروں اور ایوانوں سے دور اور بے نیازانہ بغیر خلل اندازی کے اسلامی طریقہ کے مطابق جاری رہتی تھی۔

بلاشبہ بعض اوقات تخت حکومت پر مفسد حکمران متمکن ہو جاتے تھے، بلاشبہ درباروں اور

ایوانوں میں فتنہ وفساد کی شیطانی اور شہوانی قوتیں ننگا ناچ ناچتی رہتی تھیں۔ مگر منبر و محراب میں تعلیم و تربیت، مسجد و خانقاہ میں طہارت نفس اور تزکیہ اخلاق کے شعبے حسب دستور پوری قوت اور دلجمعی کے ساتھ سرگرم عمل رہتے تھے اس طرح درباروں کے منفی اثرات سے وہ عوام مسلمانوں کو محفوظ رکھتے تھے۔ مثبت طور پر اُن کو راہ سُنّت اور راہِ ہدایت پر گامزن رکھتے تھے مسلمان معاشرہ میں علماء ایک کارفرما طاقت تھے۔ نظامِ تعلیم و تربیت ان کے ہاتھوں میں محفوظ تھا۔ مساجد، مدرس اور خانقاہیں ایوانِ حکومت کے متوازی عوام الناس کا مرجع بنی رہتی تھیں۔

## قیادت میں تفریق

یہاں ایک اہم بات ملحوظ خاطر رہے۔ وہ ہے مُسلمان معاشرہ میں مرکزی قیادت کا مسئلہ خلافت راشدہ کے دورِ سعادت تک مُسلمان معاشرہ میں دینی اور دنیوی قیادت متحد تھی۔ اور ایک جگہ مرکوز تھی۔ امیر المومنین فوجوں کی قیادت کرتا تھا۔ نزاعات کا فیصلہ کرتا تھا۔ حدود و تعزیر جاری کرتا تھا۔ زکوٰۃ وصول کرتا تھا۔ امیر الحاج بن کر قافلہ کے ساتھ حرمین شریفین جاتا تھا مسجد میں امامت کرتا تھا، وعظ و تلقین کرتا تھا۔ اس دور میں ہمہ جہت اتحاد و یکرنگی موجود تھی۔ بعد کے دور میں یہ اتحاد اور یک رنگی کی فضا برقرار نہ رہی۔ دنیوی قیادت تو بدستور بادشاہوں اور امراء کے ہاتھوں میں رہی۔ لیکن دینی قیادت علماء کرام اور فقہاء اُمت کے ہاتھوں میں آگئی۔ کسی کام کے جائز اور درست ہونے کے لیے عوام مُسلمان حکمرانوں کی طرف نہیں بلکہ عُلماء کی طرف رجوع کرتے تھے۔ ان کے فتویٰ کو مستند سمجھا جاتا تھا۔ اس طرح دینی امور میں قیادت و سیادت علماء کرام کے ہاتھوں میں رہتی تھی۔ العلماء ورثۃ الانبیاء کے مصداق شریعت اسلامیہ اور اُمتِ محمدیہ کے دینی مفادات کے محافظ عُلماء تھے۔ یعنی قضاۃ، مفتی، مدرسین، واعظین، آئمہ مشائخ اور صوفیاء تھے۔ یہ لوگ گویا دینی سرحدات پر نصب نقیب تھے جو بہر طور دین کا تحفظ کرتے تھے اور شریعت کا نفاذ جاری رکھتے تھے۔

تاریخ کے صفحات پر مسلمان بادشاہوں اور امراء کی غلط سیاست کاری اور طرزِ حکومت کا اسلامی اصول سے انحراف، امراء کی فاسقانہ بزم آرائیاں، بدراہی اور رنگین زندگیوں کے تذکرے پڑھ کر یہ نتیجہ اخذ کرلینا کہ سارا مسلمان معاشرہ اسلام کے اصولوں سے برگشتہ اور بیگانہ ہوگیا تھا، یہ کہ اسلامی نظامِ حیات بالکل ختم ہوگیا تھا، بالکل غلط ہے۔ یہ غلط استنباط ہے۔ ایسا نتیجہ اخذ کرنا مسلمان معاشرہ کی تشکیل سے اور اسلامی معاشرہ میں زیادہ تر مرکزی ناواقفیت اور بیگانگی کی وجہ سے ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ایک بڑے حصے پر اسلامی نظام کی حکمرانی بدستور قائم تھی اور اسلام نافذ العمل تھا۔ حکمران بھی گنہگار تھے اسلام کے باغی نہیں تھے۔ جب بھی تنبیہ ہوجاتی تھی وہ اسلام کی طرف پلٹ آتے تھے۔ توبہ و استغفار کر لیتے تھے۔

## کوتاہ عمل مُسلمان حکمرانوں کا معاملہ

خلافتِ راشدہ کے بعد قائم ہونے والی بنی اُمیہ کی حکومت کے زمانہ میں اسلامی قانون سیاست شریعت کی بعض دفعات پر عمل درآمد ختم ہوگیا تھا۔ منصبِ خلیفہ کے لیے شورائیت کی بجائے وراثت کا طریقہ اختیار کرلیا گیا تھا۔ بیت المال کے قومی امانت ہونے کے تصور میں تبدیلی آگئی تھی۔ امراء اور خلفاء بیت المال کی رقومات کو من مانے طریقے پر خرچ کرنے لگے تھے۔ اور بھی خرابیاں پیدا ہوگئی تھیں۔ اس لیے وقت کے علماء کے سامنے یہ سوال آیا کہ ظالم حکمرانوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے۔ آیا ان کو قانوناً جائز اور مستحق خلیفہ قرار دے کر طمانیتِ قلب کے ساتھ ان کی اطاعت اور پیروی کی جائے۔ یا ان کو ناجائز اور غاصب حکمران قرار دیا جائے۔ ان کی اطاعت سے انکار کردیا جائے اور ان کو تبدیل کرنے کی کوشش کی جائے۔ یہ کوئی نظری بحث نہیں تھی۔ بلکہ اس کا تعلق مسلمان معاشرہ سے تھا۔ اور یہ دُور رس نتائج کی حامل تھی۔

امام ابوحنیفہ (۸۰ھ - ۱۵۰) نے اس مشکل مسئلہ کا دقتِ نظر سے جائزہ لیا اور نہایت دقیق قانونی فتویٰ صادر کیا۔ اُنھوں نے فرمایا کہ یہ خلفاء جائز قانونی حکمران DE JURE

تو نہیں ہیں۔ لیکن عملاً یہ حکمراں ہیں DE FACTO ان کی سربراہی میں اسلامی نظام حیات کے بہت سے شعبے چل رہے ہیں۔ یہ صورت حالت شر و فساد اور نراج سے بہر حال بہتر ہے۔ اس لئے ان کے ساتھ عملاً خلفاء کا معاملہ کیا جائے۔ اگر ان تبدیل کرنے کی طاقت نہیں ہے تو پھر ان کی اطاعت کر کے شر و فساد کی قوتوں کو ابھرنے کا موقعہ نہ دیا جائے۔ نظام کتنا ہی بُرا ہو شر سے بہتر ہے۔ اس فتویٰ کو اہل علم نے قبول کر لیا۔ پھر بعد میں آنے والے تمام مسلمان خلفاء اور مسلمان بادشاہوں کے متعلق علماء کا یہی نقطہ نظر رہا۔

## کافر حکمرانوں کا معاملہ

خلافت عباسیہ کے خاتمہ (۶۵۶ھ / ۱۲۵۸ء) کے بعد اسلامی معاشرہ میں دستور اور حکمرانی کافر تاتاریوں کے ہاتھ میں چلی گئی۔ تاتاری کفار عالم اسلام کے مشرقی حصہ پر قابض ہو گئے۔ مسلمان ان کے محکوم اور مقہور ہو گئے۔ اس وقت مسلمان علماء کے سامنے کافر حکمرانوں کی اطاعت اور فرماں برداری کا مسئلہ آیا۔ مسلمان علماء نے کچھ اس انداز استدلال اختیار کیا تھا۔ مسلمان حکمرانوں کی طرح یہ تاتاری حکمران بھی مالیانہ اور خزانہ سے زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں۔ ان کی بھی دلچسپیوں کا دائرہ عموماً دربار تک محدود ہوتا ہے۔ اسلامی نظام حیات کے دوسرے شعبے حسب سابق مسلمان علماء کے ہاتھوں میں رہتے ہیں۔ اور وہ سرگرمی سے کام کر رہے ہیں۔ تاتاری ان میں شاذ و نادر ہی مداخلت کرتے ہیں۔ اس حیثیت سے ان میں اور سابق مسلمان حکمرانوں میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہے۔ بجز اس کے کہ وہ مسلمان تھے اور یہ کافر ہیں۔ اس لیے مصالح عامہ کے پیش نظر بہ سبیل تنزل ان تاتاری حکمرانوں کو بھی سابق حکمرانوں پر قیاس کرنا چاہیے۔ اور ان کے ماتحت ملک کو شبہ دار الاسلام تصور کرنا چاہیے۔ یہاں اسلامی نظام حیات کے کئی شعبے بغیر خلل اندازی کے چل رہے ہیں۔ بری بھلی جیسی بھی حکومت ہو شر اور

طوائف الملوکی سے بہرحال بہتر ہے۔ اس لیے ان کافر حکمرانوں کی بھی اطاعت کرنا چاہیے[1،2]

******

---

[1] (علامہ جلال الدین سیوطی)

[2] احکام آراضی الہند از قاضی محمد اعلیٰ تھانوی۔

## دوسرا باب

# اسلام ہندوستان میں

پہلی صدی ہجری ختم ہونے سے قبل ہی دینِ اسلام ہندوستان پہنچ گیا تھا۔ نوجوان سپہ سالار محمد بن قاسم ثقفی نے ۹۳ھ / ۷۱۱ء میں سندھ فتح کرلیا تھا۔ تابعین اسلام کی دولت لے کر سندھ پہنچے تھے۔ دو صدیوں تک عربوں کی حکومت سندھ میں قائم رہی۔ مگر بعد میں ٹھٹھر کر ختم ہوگئی۔ ہندوستان میں اسلام کا پودا دراصل ترکی النسل غزنوی حکمرانوں نے لگایا ہے۔ سلطان محمود غزنوی نے ۴۱۷ھ/۱۰۲۷ء میں لاہور فتح کیا۔ جلد ہی اسکی سلطنت نے وسعت اختیار کرلی۔ لاہور دارالسلطنت قرار پایا۔ یہاں اسلامی علوم وفنون اور اسلامی تہذیب وثقافت کی خوب آبیاری ہوئی۔ اس کو غزنی خورد کہا جانے لگا۔

سلطان معزالدین محمد بن سام غوری نے ۵۸۹/۱۱۹۳ میں دہلی فتح کیا۔ اس کے غلام قطب الدین ایبک (۱۲۰۶) کے زمانہ میں اسلامی حکومت گوڑ بنگالہ تک وسیع ہوگئی۔ غلام حکمرانوں نے ہندوستان میں اسلامی حکومت کو وسیع کیا اور استحکام بخشا۔ خلجی اور تغلق حکمرانوں کی یہ خدمت قابلِ ستائش ہے کہ وہ ایک صدی تک وحشی تاتاریوں کے پے درپے حملوں کے سامنے سینہ سپر بنے رہے۔ انھوں نے اہلِ ہند کو وحشی تاتاریوں کی قتل وغارت گری اور تباہی سے محفوظ رکھا۔ جب اسلامی تہذیب کے منارے بلخ بخارا، سمرقند، نیشاپور، بغداد، دمشق میں غارت گری اور آتش زنی کا ہدف بنے

رتے تھے، تب ہندوستان اسلام کا قلعہ تھا۔ لوگوں کے لیے جائے پناہ تھا۔ پُرامن تھا نمونہ تھا۔ اسی دور میں وسط ایشیا کے اعلیٰ خاندان ہندوستان میں آئے تھے۔

## اسلام کی اشاعت

غزنوی سلطنت قائم ہو جانے کے بعد یہاں علوم و فنون، درس و تدریس کی بساط جم ئی۔ علماء میں سید اسماعیل زنجانی (۴۲۸ھ) اور حسین زنجانی (۴۳۱ھ) نے درس حدیث کا سلسلہ جاری کیا۔ ابوالحسن علی (داتا گنج بخش) ہجویری غزنوی (۴۶۵ھ) نے اپنی خانقاہ قائم کی جہاں تزکیہ و تطہیر قلوب کا کام ہوتا تھا۔ علماء، فضلاء، صوفیاء، واعظین، فقہا، قضاۃ وغیرہ نے اپنے اپنے شعبے سنبھال لئے۔ اسلامی نظامِ حیات کے تمام شعبے سرگرمی سے اپنا اپنا کام کرنے لگے۔

واضح رہے کہ اسلامی نظامِ حیات کے یہ تمام شعبے آزادانہ طور پر کام کرتے تھے۔ سرکاری مداخلت ان میں نہیں ہوتی تھی۔ ایوانِ حکومت اور درباروں کے اثرات سے یہ لوگ آزاد ہوتے تھے۔ ان کا تقرر دائمی اور موروثی طور پر ہوتا ہے۔ ان کا عزل و نصب حکومتِ وقت کے ہاتھ میں نہیں ہوتا تھا۔ ماہانہ تنخواہ کے بجائے ایک قطعہ اراضی بطور معافی ان علماء، قضاۃ، اساتذہ کو مل جاتا تھا جو ان کی معاشی ضروریات کا کفیل ہوتا تھا۔ یہ عہدہ نسلاً بعد نسل ہی رہتا تھا اور یہ زمین بھی اسی طرح وراثتہً منتقل ہوتی رہتی تھی۔ اس لئے یہ لوگ آزاد رہتے تھے۔ دارالسلطنت میں حکومتوں کا ردّ و بدل ہوتا رہتا تھا۔ مگر ان پر اس کا ادنیٰ سا اثر بھی نہیں پڑتا تھا۔ یہ حسب سابق اپنے منصب پر فائز سرگرمِ عمل رہتے تھے۔ اشاعتِ اسلام کرتے رہتے تھے۔ مغلوں سے قبل کے ہندوستان میں علماء ماوراء النہر، بخارا و سمرقند کا غلبہ تھا۔ ان کا ذوق اور رجحان فقہ اور تصوف کی جانب تھا۔ حدیث سے بہت کم تعلق تھا۔ اس وجہ سے یہاں دینی مزاج کی تشکیل میں نقص رہ گیا۔ اس نقص کو بعد میں شیخ عبدالحق

محدث دہلوی اور پھر شاہ ولی اللہ دہلوی نے دُور کر دیا۔ یہاں بھی علم وحدیث کی بساط جم گئی۔

## ہندوستان میں بدعات وتغیرات

عربوں نے اسلام کی نعمت اہلِ ایران کو عطا کی۔ اہلِ ایران نے یہ دولت ماوراء النہر کے ترکوں کو منتقل کی۔ ترک پھر اس نعمت کو لے کر ہندوستان میں داخل ہوئے۔ اس لیے ہندوستان میں جو اسلام پہنچا تھا۔ وہ دست گرداں تین ہاتھوں کے ذریعہ پہنچا تھا۔ اس لیے وہ عربی اسلام کی تازگی اور طراوت باقی نہیں رہی تھی۔ مختلف احافوں نے اس کا حلیہ تبدیل کر دیا تھا۔ غیر اسلامی احکام اس میں داخل کر دیئے تھے۔

سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

"ایرانی اور ترکی سلاطین نے قانونِ شریعت کے ساتھ آئین نوشیروانی کو بھی شامل کر دیا۔ جب تاتاری عالم اسلام کے حکمران بن گئے تو انہوں نے شریعت میں تورہ چنگیز خان کا اضافہ کر دیا۔ وہ دین تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم

---

۱؎ یہ لفظ بچپن ہی میں کان میں پڑ گیا تھا۔ مگر اس کی حقیقت بڑی مدت کے بعد سمجھ میں آئی۔ عید اور بقر عید کے موقعہ پر میراثی خاندان کے بزرگوں کو سلام کرنے آتا تھا۔ اس موقعہ پر وہ خاندانی شجرہ بھی سناتا تھا۔ آخر میں کہتا تھا "قاضی شہر، شرع تورہ کے مالک فلاں ابنِ فلاں" عربی کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد مدت تک میں اس لفظ کو "تورع" کی بگڑی شکل قرار دیتا رہا۔ لیکن جب منگولوں کی تاریخ پڑھی تو پتہ چلا کہ تورہ چنگیز خان کے قانون کا نام ہے۔ اس کو یاسہ بھی کہتے ہیں۔ عرب مورخ مقریزی نے الخطط میں اس کی تفصیل بیان کی ہے۔

کار رکھتے تھے مگر ان کی سیاست اور خراج وباج کے طریقے آئین قیصر وکسریٰ اور چنگیز خاں اور ہلاکو خاں کے دستور اور قواعد پر مبنی تھے اس لیے ہماری پچھلی سلطنتیں مسلمان تو ضرور تھیں مگر اسلامی نہ تھیں۔ ان کے فرمانروا مسلمان تھے۔ مگر ان کا قانون اسلامی نہ تھا۔ جس طرح آج انگریزی عہد میں "محمڈن لا" جاری ہونے سے کوئی سلطنت اسلامی نہیں ہو سکتی۔ الّا یہ کہ ان کے لیے اسلام کے استعمال میں ہم ایک نوع کا مجاز اور تساہل برتتے ہیں" عہ

یہی تاتاری مسلمان بن کر مغل حکمرانوں کے نام سے ہندوستان میں ایک مدت تک حکومت کرتے رہے۔ ان کی ملکی خدمات سے انکار نہیں۔ وہ بڑے قابل اور مدبر حکمران تھے۔ دو صدیوں تک یہاں ان کی مستحکم حکومت قائم رہی۔ لیکن انہوں نے مختلف اضافوں سے اسلامی نظام حیات کا حلیہ بگاڑ دیا تھا۔

ہندوستان پہنچنے کے بعد ہندی اثرات نے اسلامی زندگی میں نفوذ کرنا شروع کر دیا تھا۔ شہنشاہ اکبر نے شعوری طور پر ہندوؤں کے طور طریقے اور آدابِ زندگی اختیار کر لیے تھے۔ مشہور سیاح منوچی لکھتا ہے:

"شہنشاہ اکبر نے مغل بادشاہوں کے لیے یہ قانون بنایا تھا کہ وہ اپنی بیٹیوں کی شادی نہ کریں البتہ اورنگ زیب نے اپنی لڑکیوں کے لیے یہ قانون توڑ دیا تھا۔ اور ان کی باقاعدہ شادی کی تھی۔ کیونکہ یہ کہا گیا کہ مغل بادشاہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے بڑھ کر تو نہیں ہے جنہوں نے اپنی بیٹی (حضرت) علی سے بیاہ دی تھی۔" عہ۲

---

عہ۱ رسالہ معارف۔ عنوان۔ اسلامی حکومت۔ اعظم گڑھ اکتوبر ۱۹۴۷ء

عہ۲ ہندوستان عہدِ مغلیہ میں از منوچی وینیسی اردو ترجمہ از ملک راج شرما۔ مینجر بارسٹ ایجنسی لاہور جلد سوئم ص۵۵۔ شرق الیکٹرک پریس لاہور

یہی حال آصف جاہی خاندان حیدرآباد دکن کا تھا۔ اکبر بادشاہ نے ہندوؤں کی خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر ہندو رسوم و رواجات بھی اختیار کر لئے تھے۔

محمد حسین آزاد دہلوی اکبر بادشاہ کے متعلق لکھتے ہیں:

"اپنی ماں کے مرنے پر اس نے ہندو رسم کے مطابق بھدرا کرایا تھا یعنی سر، ڈاڑھی، مونچھ اور ابرو کے سارے بال مونڈوا دیئے تھے۔ ہمایوں کا بیٹا، بابر کا پوتا، ترک بچہ ایسا لگتا تھا جیسا کہ بھوانی کا کوئی بنیا بیٹھا ہو۔"[1]

بھوانی مشرقی پنجاب کا ایک شہر ہے۔

## متحدہ قومیت

ہندوانہ رسوم و رواجات قبول کرنے میں شہنشاہ اکبر کے پیش صرف جدت طرازی اور اعجوبہ پسندی نہیں تھی بلکہ درحقیقت یہ جاہل تاتاری حکمران استحکام مملکت اور دوام حکومت کے نقطہ نظر سے ایک متحدہ دین اور ایک متحدہ قومیت تشکیل دینا چاہتا تھا۔ اس نے دین الٰہی کے نام سے ایک مخلوط مرکب پیش کیا تھا۔ جس کو مقبولیت حاصل نہ ہو سکی حتیٰ کہ اس کے انتہائی معتمد امیر راجہ مان سنگھ نے بھی دین الٰہی کو رد کر دیا اور اس کے متعلق کہا تھا۔ حضور! دو مذہب کو میں جانتا ہوں، ہندو مت اور اسلام۔ ہندو تو ہی ہوں، اگر جہاں پناہ فرمائیں تو مسلمان ہو جاؤں۔ تیسرے کسی مذہب کو میں نہیں جانتا۔" یہ دین الٰہی اکبر کے مرنے کے ساتھ ہی دفن ہو گیا۔ اکبر نے ہندو امراء سے ازدواجی تعلقات قائم کئے تھے۔ وہ ہندو مسلم ازدواجی رشتوں کو فروغ دینا چاہتا تھا۔ دراصل وہ متحدہ قومیت

---

[1] مقالات محمد حسین آزاد ص ۸۵؍۷

کرنا چاہتا تھا۔ جس میں وہ بُری طرح ناکام ہوا۔

متحدہ دین کا یہ جذبہ اکبر کے پوتے شاہجہاں کے بیٹے دارا شکوہ (۱۶۵۸ء) کے ذ... میں پھر اُبھرا۔ وہ تعلیم یافتہ شخص تھا۔ اس نے تصوف کے ذریعہ ہندو مت ا... اسلام کا ایک آمیزہ تیار کرنے کی کوشش کی۔ اسلام اور ہندو دھرم کو یکساں قرار دیا۔ و... انت اور وحدت الوجود کو ایک ثابت کیا۔ اس دور میں مذہب میں حق و باطل کا ا... ارج دیکھنا ہو تو دارا شکوہ (۱۰۶۸ھ) کی کتاب "مجمع البحرین" دیکھئے اور مذہب عیـ... یگانہ تاویلات اور توجیہات کا نگارخانہ دیکھنا ہو تو ذوالفقار علی اردستانی ...سن فانی کاشمیری) کی دبستان المذاہب دیکھیے۔ بت پرستی اور ہوسناکی کے مناظر د... ے ہوں تو درگاہ قلی خاں حیدرآبادی کی کتاب "مُرقع دہلی" (۱۱۰۱ھ) ملاحظہ فرمائیں۔ ا... اللہ خاں کی دریائے لطافت" دیکھیے۔ افکار و خیالات کی اس بے راہ روی اور بد... عملی کا اثر عوام پر بھی پڑا۔ بے عملی اور بد راہی نے اسلامی شریعت کے حصار میں نقب زنی شروع کر دی۔ منکرین اور منافقین پیدا ہونے شروع ہو گئے۔ ارکانِ اسلام اور احکام اسلام میں سستی اور غفلت شعاری پیدا ہو گئی۔

سطوتِ توحید قائم جن نمازوں سے ہوئی
وہ نمازیں ہند میں نذرِ برہمن ہو گئیں — اقبال

اس کا نتیجہ بھی ظاہر ہے۔ کسی قوم میں جب بے راہ روی اور بد عملی کا رجحان بڑھ جاتا ہے تو پھر اس میں ایمان بالآخرۃ زندگی کی اعلیٰ اقدار، عہد، نظم و ضبط کی صفات مفقود ہو جاتی ہیں۔ مغل حکومت کے آخری ایام میں یہی مناظر دیکھنے میں آتے ہیں۔

اورنگ زیب عالمگیر شکایت کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"حالانکہ کسے برائے دیوان بنگالہ بہ حلیہ درستی و کاردانی آراستہ باشد می خواہم۔ یافتہ نمی شود۔ از نایابی آدم کار آہ آہ۔"

آج ایک شخص جو درست روی اور کاردانی کی صفات کا حامل ہو بنگال کی دیوانی کے لیے درکار ہے۔ ڈھونڈے سے نہیں ملتا۔ مردانِ کار کی نایابی ہائے افسوس۔ ہائے افسوس۔

## حضرت مجدد الف ثانی (۱۶۳۴-۱۵۶۳)

ایسے تاریک زمانہ میں اللہ کی رحمت نے ہندوستانی مسلمانوں کے اندر ایک ایسی ہستی کو پیدا کیا جس نے اصلاح ملت اور تجدید دین کا کام پوری قوت سے سرانجام دیا۔ شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی (۱۶۳۴-۱۵۶۳) نے یہ فریضہ انجام دیا۔ سب سے پہلے شیخ نے مسلمانوں میں پائی جانے والی فکری کجروی اور گمراہی کا تدارک کیا۔ جوگ اور ویدانت اور وحدت الوجود کے نظریات نے تصوف کے چشمہ کو گدلا کر دیا تھا۔ شیخ نے اسے آلائشوں سے پاک و صاف کیا۔ اس کو قرآن اور سنت کے تابع بنایا۔ وحدت الوجود کا باریک کاتا ہوا تانا بانا سب توڑ کر پھینک دیا۔ جوگیانہ اور مشرکانہ اثرات کھرچ کھرچ کر پھینک دیئے۔ یہ صوفیا اپنے دعاوی کی بنیاد مکاشفات پر رکھتے تھے۔ شیخ نے برملا اعلان کر دیا۔

برکشف کفش باید زد

ایسے کشف پر جوتے مارنے چاہئیں

وحدت الوجود کی کوششوں کی وجہ سے اسلام کے دینی اور ملی امتیازات دھندلے اور مدھم پڑ گئے تھے۔ شیخ نے اشتراک کی ہر کوشش کی سختی سے مخالفت کی۔ مخلوط دین اور مخلوط قومیت کے پتلے میں جان نہیں پڑنے دی۔ اسلام کے خد و خال کو واضح کیا۔ کفر اور شرک سے اسے جدا اور ممتاز کیا۔

باطل دوئی پسند ہے حق لاشریک ہے — شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول

شیخ کو بخوبی اندازہ تھا کہ یہ چند خشک مغز صوفیوں کی انفرادی ذہنی اپج نہیں ہے بلکہ ایوانِ حکومت سے علی الاعلان اس کی پشت پناہی ہو رہی ہے۔ اس کے لیے صرف فکری تردید کافی نہیں ہے۔ اس کے لیے سرچشمہ گمراہی ایوانِ حکومت کی اصلاح ضروری ہے۔ اس کے لیے انہوں نے ایک جدید حکمتِ عملی وضع کی۔ انہوں نے بادشاہ کے اردگرد مصاحبوں اور امراء کے حلقہ میں نفوذ کیا۔ فرداً فرداً ان کو پہلے حق پرستی کی طرف مائل کیا۔ جس کے نتیجے میں تمام امراء بعض مصاحبین کے علاوہ تقریباً سارے ہی ہم نشینوں نے بادشاہ کے دینِ الٰہی سے کوئی دلچسپی نہیں لی۔ دینِ الٰہی خود بخود مر گیا۔

شیخ نے صرف منفی اقدامات ہی نہیں کیے۔ بلکہ مثبت اقدامات بھی کیے تاکہ مستقبل میں ایسا کوئی فتنہ دوبارہ سر نہ اٹھا سکے۔ انہوں نے رجوع الی القرآن اور اتباعِ سنت کا نعرہ پوری شدت سے لگایا۔ اور پھر ساری زندگی اسی کی دعوت دیتے رہے۔ ماوراء النہر سے آئے ہوئے ہندوستانی اسلام کے اہم اجزاء دو تھے فقہ اور تصوف۔ اس فضا میں شیخ کا نعرہ "رجوع الی القرآن والسنۃ" ایک انقلاب انگیز نعرہ تھا۔ ایک نئی آواز تھی۔ یہ نعرہ بہت دیرپا ثابت ہوا۔ اور اس کے اثرات بہت دور رس نکلے۔ ہندوستانی اسلام میں اسلام کے اصل سرچشمے قرآن اور سنت کا اضافہ ہو گیا۔ وہ عربی اسلام کے قریب تر ہوتا چلا گیا۔ انہوں نے ہندوستانی اسلام کا رخ موڑ دیا۔ بجا طور پر ان کے ہم عصر علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی نے انہیں مجدد الف ثانی۔ آئندہ دورۂ ہزار سال کا مصلح۔ کا خطاب دیا جو اب ان کے نام کا جزو بن گیا۔ ہندوستانی مسلمانوں کی ذہنی تشکیل میں شیخ مجدد کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں ؎

وہ ہند میں سرمایہ ملت کا نگہبان    اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار

شیخ مجدد کی ان کوششوں نے مغل حکومت کو کفر کی گود میں جانے سے بچا لیا۔ شیخ کی دعوت ایک نیا موڑ تھا۔ ان مساعی کا نتیجہ تھا کہ بے دین اکبر کے تخت پر محی الدین اورنگ زیب جیسا متقی اور متبع سنت بادشاہ جلوہ گر ہوا۔

## شاہ ولی اللہ دہلوی ۱۷۰۳-۱۷۶۲

ہندوستانی مسلمانوں پر اللہ تعالیٰ کی رحمت خاص تھی۔ اس نے مجدد صاحب کے بعد شاہ ولی اللہ دہلوی کو پیدا کر دیا جنہوں نے مجدد صاحب کے شروع کیے ہوئے کارِ تجدید کو تکمیل تک پہنچا دیا۔ اور آئندہ کے لائحہ عمل اور راہِ عمل کے لیے واضح نقوش چھوڑ دیئے جن پر ان کی اولاد نے سرگرمی سے کام جاری رکھا۔

وہ عہدِ عالمگیری کے آخری عہد میں پیدا ہوئے (۱۷۰۳) اور جنگ پانی پت (۱۷۶۱) کے بعد ان کا انتقال ہوا۔ انہوں نے سات مغل حکمرانوں کا زمانہ دیکھا۔ انہوں نے مغل حکومت کا زوال اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ یہ صرف ایک حکومت کا زوال نہیں تھا۔ بلکہ ایک تہذیب کا اور ایک ملت کا زوال تھا۔ وہ ملت کا زوال دیکھ کر کانپ جاتے ہیں۔ اور فرماتے ہیں "اگر کفار کا غلبہ۔ معاذ اللہ۔ اسی طرح باقی رہا تو مسلمان اسلام سے بیگانہ ہو جائیں گے اور زیادہ زمانہ نہیں گزرے گا کہ وہ ایسی قوم بن کر رہ جائیں گے جو نہ اسلام کو جانتے ہوں گے اور نہ کفر کو۔ یہ بہت بڑی مصیبت ہوگی۔[1]

انہوں نے زوال کی قوتوں سے لڑنے کی مقدور بھر کوشش کی۔ یہ شاہ صاحب کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ جب قومی شیرازہ بکھرا تو جہاں مغلوں کے تخت و تاج اس سیلاب میں بہہ گئے وہاں مسجد و خانقاہ سلامت رہے۔ قوم کا سیاسی زوال تو ہوا مگر دینی انحطاط شروع نہیں ہوا۔ اس کے لیے انہوں نے چند تدابیر اختیار کیں۔

---

[1] شاہ ولی اللہ دہلوی کے سیاسی مکتوبات۔ صفحہ ۴۵ از خلیق احمد نظامی

انہوں نے دین کے سرچشمہ حقیقی قرآن مجید کو عوام کے لیے قابلِ فہم بنایا۔ خود انہوں نے قرآن مجید کا فارسی ترجمہ شائع کیا اور ان کے بعد شاہ عبدالقادر نے (۱۸۱۳) اور شاہ رفیع الدین (۱۸۱۸) ان کے بیٹوں نے اُردو ترجمے شائع کیے۔ آج ہر مسجد میں اُردو میں درسِ قرآن ہو رہا ہے۔ یہ شاہ صاحب کی کوششوں کا نتیجہ ہے شاہ ولی اللہ کو اپنے کام کا آغاز کرنے میں علماء وقت کی ناراضگی اور مخالفت برداشت کرنا پڑی تھی۔ مگر انہوں نے اس کی کوئی پروا نہیں کی۔

دین کا دوسرا سرچشمہ حدیث ہے۔ شاہ صاحب نے علم حدیث کو ہندوستان میں عام کیا۔ حدیث کی چھ مستند کتابوں۔ صحاح ستہ۔ کا یہاں چلن عام کیا۔ ان کو نصابِ تعلیم میں شامل کیا۔ یہ ان کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ آج ہر دینی مدرسہ میں صحاح ستہ کی تعلیم ہو رہی ہے۔

فکری لحاظ سے شاہ صاحب کا بڑا کمال یہ ہے کہ انہوں نے دین کا مجموعی مربوط تصور پیش کیا۔ اس کو ایک نظامِ حیات بن کر پیش کیا۔ اور اس کو فکری بنیادوں پر استوار کیا۔ اس طرح آنے والی تمام عقلی اور فکری کاوشوں کے لیے راہ ہموار کر دی۔ بعد کے تمام اہلِ علم ان کے نقطہ نظر کی پیروی کرتے ہیں۔

وہ دیکھ رہے تھے کہ اختلافات نے اس ملّت کو کتنا نقصان پہنچایا ہے۔ اس لیے سب سے پہلے انہوں نے وحدت ملت کی کوشش کی۔ اختلافات میں تطبیق پیدا کی۔ ان کی مساعی کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ انہوں نے شیعہ سُنّی، حنفی شافعی، تقلید و اجتہاد شریعت و طریقت، وحدت الوجود اور وحدت الشہود میں راہ تطبیق پیدا کرنے کی سنجیدہ کوشش کی اس مقصد کے لیے بہت ساری کتابیں تصنیف کیں۔

اصلاحِ معاشرہ کے سلسلہ میں انہوں نے ہر قسم کے تغیرات اور بدعات کی مخالفت کی۔ قوم کے ایک ایک طبقہ کو نام لے لے کر للکارا اور پیرویِ اسلام کی دعوت دی۔

ساری ملت کو اصلاحِ حال کی دعوت دی۔

عملی اقدامات کے لیے انہوں نے مردانِ کار اور اہلِ علم تیار کیے۔ ان کی تعلیم و تربیت کی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو لائق اور سعادت مند اولاد سے نوازا اور ایسے ہی لائق شاگرد ملے جنہوں نے ان کے کام کو وسعت دی اور سارے ہندوستان میں پھیلا دیا۔ سیاسی اعتبار سے انہوں نے اسلامی حکومت کو بچانے کی آخری مرتبہ کوشش کی نجیب الدولہ کو خطوط لکھے۔ افغانستان سے احمد شاہ ابدالی کو بلوایا مگر حکومت کا درخت اس قدر کھوکھلا ہو چکا تھا کہ اب کسی خارجی سہارے سے بھی قائم نہیں رہ سکتا تھا۔ ان کی یہ کوشش زیادہ کامیاب نہیں رہی۔

## ہندوستان کے مسلمان معاشرہ کی حالت

ان اصلاحی کوششوں کے مفید اثرات نکلے۔

ہندوستان کے مسلمان معاشرہ کی حالت کے متعلق سید ابوالاعلیٰ مودودی لکھتے ہیں:

"ہم نے ایک مدت تک بادشاہی نظام کے تحت زندگی گزاری ہے جو پوری طرح اسلامی نظام نہیں تھا، مگر اس میں پھر بھی اسلامی قانون رائج تھا۔ اور عام لوگوں کی تعلیم و تربیت کا کام علماء اور صوفیاء انجام دیتے تھے۔ اس وجہ سے اگرچہ وہ معاشرہ اس درجہ کا تو نہیں تھا جس درجہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے زمانہ میں تھا۔ لیکن اس کے باوجود نہ لوگوں کی عام حالت اتنی بگڑی تھی جتنی بعد میں بگڑی۔ اور نہ لوگ اسلام کے علم سے اس قدر بے بہرہ تھے جس قدر بعد میں ہو گئے۔ شراب نوشی مسلمانوں میں تقریباً ناپید تھی۔ لوگ گناہ کرتے تھے مگر علانیہ بے باکی کے ساتھ نہ کرتے تھے۔ اٹھارہویں صدی کے وسط میں جب

انگریزی حکومت اول بنگال میں قائم ہوئی۔ اس زمانہ کے بعض انگریز مصنفین لکھتے ہیں کہ چوری وہاں ناپید تھی۔ چور کا ہاتھ کاٹ دیا جاتا تھا۔ مسلمانوں سے جھوٹ کی کوئی توقع نہیں کرتا تھا کہ عدالت میں جا کر کوئی مسلمان جھوٹی گواہی دے گا۔ مسلمانوں کی عام آبادی لکھی پڑھی تھی بلکہ تقریباً سو فیصد خواندہ تھی۔ یہ اٹھارہویں صدی کے آخر تک ہماری حالت تھی۔

ہندوستانی معاشرہ کے متعلق انگریزی سیاح کی رائے:

انگریز سیاح ٹیورنیر لکھتا ہے:

"مذہب اور اخلاق کے معاملہ میں ہندوستانی ایسے ہیں کہ ان کو دیکھ کر یورپ کے مسیحی شرمائیں۔ قتل اور خون ریزی اور زناکاری پر سخت سزائیں دی جاتی ہیں۔ ان سزاؤں سے شاہزادے اور شاہزادیاں تک مستثنیٰ نہیں۔ اگرچہ بت پرست (ہندو) خدائے واحد و برحق کے حقیقی علم سے ناواقف ہیں۔ ان میں بھی زناکاری شاذ و نادر ہوتی ہے۔ شادی شدہ اپنی بیویوں سے بیوفائی نہیں کرتے۔ لواطت (ہم جنس پرستی) کا وہ نام نہیں جانتے۔ ان کی شادیاں اوائل عمر میں ہو جاتی ہیں وہ ان بدلیوں میں نہیں پڑتے۔"

## غیر مسلم حکمرانوں کے ساتھ طرزِ عمل

اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد مغل حکومت کمزور اور مضمحل ہوتی چلی گئی۔ ہند و مرہٹے قابض ہوگئے تھے۔ مرہٹوں کو مالگزاری۔ (چوتھ پیداوار) وصول کرنے سے دلچسپی تھی اسلامی نظامِ حیات کے تمام دوسرے شعبے بدستور علماء کی نگرانی میں چل رہے تھے۔ اس لیے وقت کے علماء نے تاتاری دور کے فتوی کو سامنے رکھ کر برسبیل تنزل مرہٹوں کی عملداری کو شبہ دارالاسلام قرار دیا۔ اور ان کی اطاعت اور فرماں برداری کو جائز کہا۔

## تیسرا باب

# انگریزی حکومت کی پالیسی ہندوؤں کے ساتھ

مرہٹوں، فرانسیسیوں اور دوسرے حریفوں کو شکست دے کر بالآخر ہندوستان میں انگریزی حکومت قائم ہوگئی۔ پہلے بنگال اور پھر سارے ہندوستان میں ان کا اقتدار قائم ہوگیا کوئی ان کا حریف باقی نہ رہا۔ سابق رویہ کے برخلاف علماء نے انگریزی کمپنی کے ماتحت ہندوستان کو شہ دارالاسلام قرار نہیں دیا۔ ان کی اطاعت اور فرماں برداری کو واجب قرار نہیں دیا۔ علماء کے اس اقدام کو سمجھنے کے لیے بطور مقدمات پہلے چند امور کا جاننا ضروری ہے۔

## اہل فرنگ کی مسلمانوں سے نفرت

مغربی اقوام میں سے اہل پرتگال سب سے پہلے ہندوستان میں آئے۔ دو صدی تک ہندوستان کے سمندروں اور ساحلوں پر ان کا قبضہ رہا۔ ان کے بعد ولندیزی، ڈین اور فرانسیسی ہندوستان میں آئے۔ سب سے آخر میں انگریز آئے اور وہ تمام مغربی اقوام کو شکست دے کر غالب آگئے۔ انہوں نے ہندوستان میں اپنی حکومت قائم کر لی۔

افرنگ کی تمام اقوام کو اسلام سے اور مسلمانوں سے شدید نفرت ہے۔ یہ نفرت ان کے لاشعور میں پیوست ہوگئی ہے۔ مشہور فرانسیسی مستشرق گستاؤ لیبان اپنی مشہور کتاب تمدن عرب میں لکھتا ہے۔

"وہ موروثی تعصب جو ہمیں اسلام اور پیروان اسلام سے ہے اور مدت دراز سے جمع ہوتا چلا آیا ہے حتی کہ اب یہ ہماری ذہنی ساخت کا جزو بن چکا ہے۔

ہمارے تعصبات اس قدر جبلی، طبعی اور اس قدر شدید ہیں جیسے یہودیوں کے تعصبات عیسائیوں کے خلاف ہیں"۔

اس سلسلہ میں علامہ محمد اسد رقم طراز ہے:

"یورپ خواہ بدھ مت کے عقائد قبول نہ کرے۔ ہندو فلسفہ اختیار نہ کرے لیکن ان پر غور کرتے وقت وہ ایک متوازن اور معتدل ذہنی کیفیت برقرار رکھ سکتا ہے۔ برخلاف اس کے جب وہ اسلام کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو اس کا ذہنی توازن بگڑ جاتا ہے۔ قلیل استثناء کے ساتھ بڑے بڑے مستشرقین بھی اسلام پر قلم چلاتے وقت غیر سائنٹیفک اور غیر جانب داری کے مجرم پائے گئے ہیں۔ ان امور سے ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ گویا اسلام پر غیر جانب داری کے انداز میں سائنٹیفک تحقیقات ہو ہی نہیں سکتی۔ گویا اسلام ایک ملزم ہے جو کسی جج کے روبرو کھڑا ہے۔ بعض مستشرقین سرکاری وکیل کا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔ جو ملزم سے اقبال جرم کرانے پر مُصر ہیں۔ بعض دوسرے لوگ وکیل صفائی کا فرض انجام دے رہے ہیں۔ یہ جانتے ہوتے کہ ملزم مجرم تو ضرور ہے مگر مخصوص حالات کی بنا پر وہ اس کی سزائیں تخفیف کرانے کی کوشش بے دلی کے ساتھ کر رہے ہیں"۔[۵]

## اہلِ پرتگال کے مظالم

اس دور میں مذہبی احیاء کی تحریک یورپ میں بڑے زور شور سے چل رہی تھی۔ مذہب میں نئے نئے فرقے پیدا ہو رہے تھے۔ اہل پرتگال میں اشاعت مسیحیت کا جذبہ جنون کی حد تک بڑھا ہوا تھا۔ وہ ساری دنیا کو دائرہ مسیحیت کے اندر دیکھنا چاہتے تھے۔ اس سلسلہ میں ہر قسم کے ظلم و ستم

۵ Islam at the crossroad – By Mohammad Asad
P. 61, 64 – Ashraf Publications Lahore 1963

کہ وہ روا اور جائز سمجھتے تھے۔ یُوں تو ان کے مظالم کا نشانہ ہندوستان کی تمام ہی اقوام بنیں لیکن مسلمانوں پر ان کے مظالم اوروں سے بہت زیادہ تھے۔ اس دور کا مشہور مؤرخ زین الدین معبری جو عینی شاہد ہے وہ ان روح فرسا مظالم کی تفصیل بیان کرتا ہے۔

"۹۰۶ھ (۱۵۰۱ء) میں فرنگی دوبارہ آئے۔ انھوں نے کالی کٹ کے راجہ سامری پر زور دیا کہ وہ عربوں کو تجارت کرنے سے روک دے۔ اور بحرِ ہند میں ان کی آمد و رفت بند کر دے......... انھوں نے کالی کٹ کی مسجد ناخدا کو منہدم کر دیا..... بعض مساجد کو جلا کر خاک کر دیا۔ اور ان کی جگہ گرجے تعمیر کیے۔ ان کے مظالم کی فہرست بہت طویل ہے۔ مثلاً مسلمانوں کے لیے حج کا سفر بند کر دینا، ان کے مال و متاع کو لُوٹ لینا، ان کی بستیوں کو اور مسجدوں کو نذرِ آتش کر دینا، ان کی کشتیوں پر زبردستی قبضہ کر لینا، قرآن مجید اور دیگر مقدس کتابوں کو پیروں تلے روند کر آگ میں ڈال دینا، مساجد کی بے حرمتی کرنا، مرتد ہو جانے پر صلیب کے آگے سجدہ کرنے والوں کو انعام دینا، اپنی عورتوں کو سجا بنا کر نکالنا اور مسلمان عورتوں کو فتنہ میں ڈالنا حاجیوں اور دیگر مسلمانوں کو مختلف طریقوں سے قتل کرنا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو علانیہ گالی دینا، مسلمان قیدیوں کو بھاری بھاری بیڑیاں پہنانا غلاموں کی طرح ان کو بازار میں لے جا کر فروخت کر ڈالنا۔ بڑی بڑی اُجرت وصول کرنے کے لیے قیدیوں کو طرح طرح سے اذیت پہنچانا، تنگ و تاریک اور بدبودار کوٹھریوں میں ان کو بند کرنا، اگر وہ پانی سے استنجا کریں تو ان پر جوتیاں برسانا، آگ سے عذاب دینا.......... کتنے ہی آدمیوں کو عذاب دے کر انھوں نے ہلاک کر ڈالا کتنے ہی مسلمان مردوں اور عورتوں کو انھوں نے زبردستی عیسائی بنا ڈالا۔ یہ اور اس قسم کے دوسرے بہت سے مظالم ہیں جن کے ذکر سے زبان رکتی ہے۔ جن کے اظہار سے قوت

گویا ئی انکار کرتی ہے''۔[1]

جدید دور کا ایک ہندو مورخ بھی تسلیم کرتا ہے۔

''ان کا طرزِ عمل ہندوؤں اور مسلمانوں سے مختلف تھا۔ ہندوؤں سے انھوں نے شادی بیاہ کے تعلقات قائم کیے۔ پہلے پرتگالی گورنر البوقرق نے ہندو عورتوں سے پرتگالی سپاہیوں کی شادی کی رسم ڈالی۔ سال بہ سال وہ ہندو عورتوں کو گرجا میں جمع کرتا، ان کو عیسائی بناتا اور پھر خود ہی پرتگالی سپاہیوں کے ساتھ ان کی شادی کراتا تھا۔ انہوں نے ہندوؤں سے تجارتی روابط بھی قائم کیے۔ اور ان کو اپنی ملازمت میں بھی رکھا۔ وہ خود بھی ہندو ریاست وجے نگر کے راجہ کی فوج میں بھرتی ہو گئے تھے۔ لیکن مسلمانوں کو انھوں نے مظالم کا نشانہ بنایا۔ ۱۵۴۰ء میں گوا میں مساجد اور مندر منہدم کرا دیے۔ انھوں نے لوگوں کو جبراً عیسائی بنایا۔ انھوں نے عربوں پر بڑے مظالم ڈھائے۔ ان کو طرح طرح سے اذیت دی''۔[2]

## انگریزوں کی حکومت

تمام دوسری اقوام کو شکست دے کر انگریز آخر میں تنہا ہندوستان کے مالک بن گئے۔ انگریزوں کا قیام برِصغیر ہندوستان و پاکستان میں دو صدیوں تک رہا ہے۔ پہلے وہ تجارت کرتے رہے پھر وہ حکمران بن گئے۔ مغربی تاجر بڑے ناجر تھے۔ ان کی تجارت دھونس اور دھاندلی کی تجارت تھی۔ اندرونِ ملک انھوں نے اجارہ داریاں اور ٹھیکیداریاں قائم کر رکھی تھیں۔ سمندر میں کوئی شخص

---

[1] تحفۃ المجاہدین از زین الدین معبری (عربی) قلمی ص ۲۲۸، ۲۲۷۔ مخزونہ شاہ ولی اللہ اورینٹل کالج منصورہ۔ حیدر آباد۔

[2]

ان کی اجازت کے بغیر جہاز رانی نہیں کرسکتا تھا۔ خواہ بحیثیت تاجر خواہ بحیثیت حکمران ان کا مطمح نظر دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹنا تھا۔ انھوں نے ملک کا عریاں استحصال کیا۔ ہر شے جو ہاتھ لگی اس کو انگلستان لے گئے۔ یہ دُنیا کی تاریخ میں عجیب و غریب قسم کی حکومت تھی۔ یہ ایک تجارتی کمپنی کی حکومت تھی، نہ فرد کی حکومت تھی نہ قوم کی حکومت تھی۔ اقتدارِ اعلیٰ سات سمندر پار لندن میں کمپنی کے ڈائریکٹروں کے ہاتھ میں تھا۔ وہاں تک عوام کی رسائی سخت دشوار تھی۔ اس لیے فریاد رسی اور داد رسی عملاً ناممکن ہوگئی تھی۔

ہندوستان میں جو بھی راجہ یا بادشاہ گزرے ہیں خواہ ہندو ہوں یا مُسلمان، وہ حکومت کرتے تھے۔ تجارت نہیں کرتے تھے۔ وہ بہرحال رعایا کی فلاح اور بہبود کو اپنا مقصود بناتے تھے۔ اس کے برخلاف کمپنی کی حکومت کسی اخلاقی مقصد کی سرے سے قائل ہی نہیں تھی۔ ہندو اور مُسلمان حکمران خواہ عیش و آرام کے دلدادہ ہوں مگر ہوتے تھے سیدھے سادھے اِنسان لیکن کمپنی کے حکمران بڑے غور و خوض کے بعد ایک منصوبہ بناتے تھے، ایک پالیسی بناتے تھے۔ اور پھر حکومت کی ساری مشینری اس منصوبہ کو روبعمل لاتی تھی، یہ درحقیقت ایک قسم کی مشینی حکومت تھی جس سے اہلِ ہند کو سابقہ پڑا تھا۔

حکمرانی کے لیے منصوبہ بندی میں اور پالیسی سازی میں انگریزوں کے سامنے دو فریق تھے۔ ہندو اور مُسلمان۔ پرتگالیوں کی طرح انگریزوں کی حکمت عملی (پالیسی) دونوں قوموں سے جُدا جُدا تھی۔ اس معاملہ میں انگریزوں نے حکمرانی کی پالیسی مشرک رومیوں سے اخذ کی تھی ان کی پالیسی ... تھی یعنی محکوموں میں اختلافات کو بھڑکاؤ اور پھر ثالث بالخیر بن کر ان پر حکومت کرو۔ اس طرح دونوں فریق ثالث کی ضرورت اور اہمیت کے قائل ہو جائیں گے۔ اس حکمت عملی کے مطابق انگریزوں نے ہندوؤں کے ساتھ ایک قسم کا طرزِ عمل اختیار کیا اور مُسلمانوں کے ساتھ دوسرے قسم کا طرزِ عمل اختیار کیا۔ ہندوؤں کو بحیثیت قوم انھوں نے ابھارا، ترقی دی اور فروغ دیا۔ مُسلمانوں کو انھوں نے گرایا، پست کیا اور ذلیل کیا۔

## ہندو تجارت میں شریک

انگریز تاجر بن کر ہندوستان میں آتے تھے۔ لیکن وہ یہاں کی زبان نہیں جانتے تھے۔ اور نہ یہاں کے طور طریقوں اور رسوم و رواج سے واقف تھے یہاں کے لوگوں سے تعاون حاصل کرنا ضروری تھا۔ انگریز کمپنی کے سارے کارندے اور گماشتے Agents ہندو ہوتے تھے۔ ہندو انگریزوں کی مختلف نوع کی خدمات انجام دیتے تھے۔ ہندوؤں کی ان گوناگوں خدمات کا تذکرہ ایک انگریز ولیم بولٹ (۱۷۷۲ء) نے اس طرح کیا ہے۔

"لفظ بنیا اس شخص کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جس کے ذریعے انگریز اپنے تجارتی معاملات سر انجام دیتا ہے۔ یہی شخص اس کا معتمد، مہتمم اور دلال ہوتا ہے۔ یہی اس کو رقومات فراہم کرتا ہے۔ یہی شخص پھر ان رقومات کے لیے خزانچی کی خدمات سر انجام دیتا ہے۔ یہی اس کے لیے راز دار ہوتا ہے۔ صاحب کے ادنیٰ درجے کے تمام ملازمین اس کے ماتحت کام کرتے ہیں۔ آقا کی تجارت درحقیقت یہی چلاتا ہے۔ آقا تک کسی شخص کی رسائی اس کے توسط کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ غرضکہ آقا پر اس کا اثر اس اثر سے بدرجہا زیادہ ہے جتنا کہ یورپ کے کسی فضول خرچ اور عیاش نواب زادے پر اس کے خان ساماں یا اس کے قرض خواہ یا اس کی محبوبہ کا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بنیا آقا (انگریز) کی نوکری حاصل کرنے کے لیے بڑی بڑی رقمیں بطور نذرانہ خرچ کر ڈالتا ہے۔"[۵]

ہندوؤں نے انگریزوں کی صرف تجارتی اور نجی خدمات ہی انجام نہیں دیں بلکہ سیاسی

---

۵ انگریزی دور میں ہندوستانی تمدن کی تاریخ۔ از عبداللہ یوسف علی۔ اردو ترجمہ ص ۳۰۔ کریم اینڈ سنس۔ کراچی۔

خدمات بھی انجام دیں۔ مسلمان بادشاہوں، نوابوں کے یہاں عموماً ہندو ملازم ہوتے تھے۔ ان کے پاس رہ کر انھوں نے انگریزوں کے حق میں جاسوسی کے فرائض انجام دیئے۔ انگریزوں کے ساتھ مل کر مسلمان حکمرانوں کے خلاف سازش میں شرکت کی۔ بنگال کے نواب سراج الدولہ کے وزیر امی چند سے لے کر امیرانِ سندھ کے وزیر دیوان آدت رائے تک انگریزوں کی تمام سازشوں میں ہندو برابر کے شریک رہے ہیں۔ ان چڑھتے سورج کے پجاریوں نے مسلمانوں کی ملازمت میں رہتے ہوئے انگریزوں کی خفیہ خدمات انجام دی ہیں۔

## ہندوؤں کے ساتھ ازدواجی تعلقات

پرتگالیوں کی طرح انگریزوں نے بھی ہندو عورتوں کے ساتھ شادی بیاہ کے تعلقات قائم کیے۔ جو انگریز ہندوستان میں آتے تھے وہ بیشتر حالتوں میں مجرد اور غیر شادی شدہ ہوتے تھے۔ ہندوستان میں آکر وہ یا تو پرتگالی عورتوں سے یا پھر ہندو عورتوں سے شادی کر لیتے تھے۔ ہندو عورتوں سے شادی کو وہ قانونی حیثیت نہیں دیتے تھے۔ درحقیقت ان کی حیثیت داشتہ سے زیادہ نہیں ہوتی تھی۔ ان کی اولاد کو باپ کا نام اختیار کرنے کا حق نہیں ہوتا تھا۔ ملازمت سے سبکدوشی کے بعد انگریز تو انگلستان چلے جاتے تھے، مگر ان کی داشتائیں اور ان کی اولادیں ہندوستان میں رہ جاتی تھی۔ عام طور پر ان داشتاؤں کو چالیس روپیہ ماہوار تنخواہ یا وظیفہ ملتا تھا۔[1]

---

[1] History of freedom movement – By Jara Chand.

مسلمانوں نے بھی ہندو عورتوں سے شادیاں کیں۔ مگر ان کو پورے حقوق دیئے۔ ان کے بطن سے پیدا ہونے والی اولاد یعنی شاہزادوں کو تخت حکومت پر بٹھایا۔ فیروز شاہ تغلق۔ جہانگیر وغیرہ۔ مگر انگریز سے ہندو خوش ہیں اور مسلمانوں سے ناراض۔

## ہندوؤں سے نسلی رشتہ

انگریزوں نے ہندوؤں کے ساتھ نسلی رشتہ ڈھونڈ نکالا مستشرق اور سنسکرت دان انگریزوں نے یہ بات تاریخی طور پر ثابت کر دی کہ ہندوستان کے ہندو اور یورپ میں جرمن نسل کے قبائل درحقیقت آریہ نسل کی دو شاخیں ہیں۔ ان کا وطن اصلی وسط ایشیا کا علاقہ تھا۔ جہاں سے آریہ قبائل مختلف سمتوں میں روانہ ہو گئے۔ ایک فریق آذربیجان، ایران، افغانستان ہوتا ہوا ہندوستان میں پہنچ گیا۔ دوسرا فریق روس، مشرقی یورپ، جرمنی، فرانس ہوتا ہوا انگلستان میں جا پہنچا۔ اس انکشاف نے ہندو قوم کا رشتہ حاکم قوم سے جوڑ دیا۔ ہندو کا سر افتخار بلند ہو گیا۔ نسلی رشتہ خواہ حقیقت ہو مگر سیاست کاروں نے اس ایک تدبیر سے ہندو قوم کا دل جیت لیا۔ ہندو اخلاص کے ساتھ انگریزی حکومت کے وفادار اور اطاعت گزار بن گئے۔ کسی غیر ملکی حکومت کے لیے یہ سب سے بڑی کامیابی ہے۔

## ہندو مذہب کا احیاء

سنسکرت دان انگریزوں نے سنسکرت جیسی مردہ زبان کو نئی زندگی بخشی۔ سنسکرت کی فراموش شدہ کتابوں کو گوشہ گمنامی سے نکال کر بڑی آب و تاب سے شائع کیا۔ ان کتابوں کا ہمدردانہ مطالعہ کیا۔ لغویات، خرافات اور فحش باتوں سے پاک کر کے ان کا صاف ستھرا ملخص دنیا کے سامنے پیش کیا۔ خرافاتی مذہب کو نئی زندگی دی۔ ہندو مذہب کا احیاء کیا۔ اس کے لیے ملک میں جگہ جگہ انجمنیں قائم کیں۔ اور انہیں تھیوسوفیکل سوسائٹی کا غیر جانبدارانہ نام دیا۔ یہ سارا کارخیر انگریز اور دوسرے یورپی ماہرین زبان سنسکرت نے انجام دیا۔ جن میں میکس مولر Max Muller کول بروک Col Brooke ولسن Vilson میڈم بلاوٹسکی Madam Balavatsky

---

"History is a foreign import in India' Lovis fisher

کرنل آلکاٹ Col. Alcot اور اینی بسنٹ Anne Besant بہت مشہور ہیں۔ ولسن تو ہندو تہذیب کا اس قدر دلدادہ تھا کہ وہ اپنی شکل صورت، وضع قطع لباس تبدیل کر کے ہندو برہمن بن گیا تھا۔ اس لیے ہندو اس کو دیوتا کی طرح پوجتے تھے[1] اس صورت حالات پر ایک عیسائی مشنری لکھتا ہے۔

"جو نئے مستشرقین نے مشرقی مذاہب کے گن گانے شروع کر دیے۔ خاص طور پر نو دریافت شدہ ہندو مذہب اور ہندو فلسفہ کے"[2]

ہر طرح سے ہندوؤں کا دل موہ لینے کی کوششیں کی جا رہی تھیں۔ ہندوستان کے پہلے گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز نے بھجن گانے کے لیے بنارس میں ایک خاص عمارت بنوا کر دی۔ بنارس کے برہمن پنڈت اس عطیہ سے اس قدر خوش تھے کہ جب لندن میں وارن ہیسٹنگز پر مظالم اور بدعنوانیوں کے خلاف مقدمہ چلا تو ان پنڈتوں نے وارن ہیسٹنگز کی صفائی اور تائید میں اپنے دستخطوں سے تیار کر کے ایک محضر نامہ برطانوی پارلیمنٹ کو ارسال کیا تھا[3]

## ہندی زبان کی تشکیل

موجودہ ہندی زبان اپنی تشکیل کے لیے انگریزی حکمرانوں کی شعوری کوششوں کی مرہون منت ہے۔ انگریزوں سے قبل اسلامی دور میں اودھی، برج بھاشا، اور راجستھانی بولیاں رائج تھیں۔ سارا شعری سرمایہ اودھی اور برج میں ہے۔ لیکن موجودہ ہندی زبان ایک مصنوعی زبان ہے۔ جو فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں گھڑی گئی ہے۔ ہندی زبان و ادب کا مؤرخ کے ای Kaey لکھتا ہے۔

---

[1] History of Mission in India — By Richter P. 132

[2] History of India — By

[3] انگریزی عہد میں ہندوستانی تمدن کی تاریخ عبداللہ یوسف علی۔ ص ۱۱۵ ۔

"طے پایا کہ ہندی بولنے والوں کے لیے ایک علمی زبان نہایت پسندیدہ ہے۔ یہ مقصد اس طرح حاصل کیا گیا کہ اُردو زبان سے عربی فارسی زبانوں کے الفاظ خارج کر لیے گئے اور ان کی جگہ ٹھیٹ سنسکرت زبان کے الفاظ داخل کر دیے گئے۔ للوجی کی ہندی درحقیقت ایک نئی زبان ہے۔"[1]

واضح رہے کہ للوجی کی کتاب پریم ساگر ہندی زبان کی سب سے پہلی کتاب ہے جو فورٹ ولیم کالج میں ۱۸۰۸ء میں طبع ہوئی تھی۔ یہ حقیقت بھی پیش نظر رہے کہ اس سے قبل بنگالی زبان کا رسم الخط عربی رسم الخط سے ناگری رسم الخط میں تبدیل کر چکے تھے۔ اسلامی دور میں بنگلہ زبان عربی رسم الخط میں لکھی جاتی تھی۔ ۱۷۷۸ء میں انگریزوں کے اشارے پر بنگلہ زبان کے لیے موجودہ رسم الخط اختیار کیا گیا۔ اس طریقہ نے بنگالی زبان کو اسلامی دور کے ادب سے اور اسلامی اثرات سے     کر دیا تھا۔

## ہندوؤں کی تعلیم

ہندوستان پر قبضہ کو نصف صدی گزر گئی تب ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستانیوں کی تعلیم کی جانب توجہ کی۔ ۱۸۱۳ء میں کمپنی کے ڈائریکٹروں نے ہندوستان میں گورنر جنرل کو پابند کیا کہ وہ اہلِ ہند کی تعلیم کا انتظام کرے۔ کورٹ آف ڈائریکٹرز لندن نے تعلیم کے باب میں عملی مشورے اور ہدایات دینے کے لیے ایک طویل مراسلہ کلکتہ ارسال کیا۔ یہ مراسلہ بڑا عجیب ہے اس میں ساری گفتگو ہندوؤں سے متعلق ہے، سنسکرت اور ہندی زبان کی ترقی کا ذکر ہے۔ سنسکرت کے علوم کے احیاء کا ذکر ہے، بنارس کی تقدیس کا ذکر ہے۔ مرہٹوں کے جذبات کے احترام کا ذکر ہے۔ چھوت چھات کی وجہ سے ہندو طلبہ عام طلبہ کے ساتھ اسکولوں اور کالجوں میں نہیں پڑھ سکتے اس لیے اُستادوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ ہندو بچوں کو ان کے گھر جا کر تعلیم دیں۔ دوسری جانب نہ مسلمانوں کا کہیں ذکر ہے۔ نہ عربی فارسی زبانوں اور مسلمانوں کے علوم کا ذکر ہے۔ حالانکہ اس وقت تک دہلی کے تخت پر مغل شہنشاہ

---

[1] History of Hindi Literature, By F. E. Kaey P. 141

بیٹھا ہوا تھا۔ اس مراسلہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ حکومت کے پیش نظر صرف ہندوؤں کی ناز برداری تھی۔

ایک انگریز ہائیڈ ایسٹ Hyde East. نے راجہ رام موہن رائے کے تعاون سے کلکتہ میں پہلا انجی کالج ۱۸۱۷ء میں قائم کیا۔ ہندوؤں کی خوشنودی کے لیے کالج کا نام ودیالیہ رکھا گیا۔ اس کالج میں مسلمان طلبہ کو داخلہ نہیں دیا جاتا تھا[1] ستم ظریفی تو یہ ہے کہ مسلمانوں کے قائم کردہ محسن وقف (۱۸۰۶ء) سے حاصل کردہ رقومات سے ہوگلی کالج کلکتہ قائم کیا گیا۔ سارے اساتذہ وہاں انگریز تھے اور سارے طلبہ وہاں ہندو تھے۔" ہزار سے زائد طلبہ میں صرف ۸۱ مسلمان طلبہ کو داخلہ دیا گیا تھا"[2]

یہ واقعات اور حقائق اس بات کو ثابت کرتے ہیں کہ انگریزی حکومت میں یکطرفہ طور پر ہندوؤں کو انگریزی زبان اور مغربی علوم کی تحصیل میں آگے بڑھایا جا رہا تھا۔ اور دیدہ دانستہ مسلمانوں کو تعلیم کے باب میں پیچھے دھکیلا جا رہا تھا۔

## ہندو سرکاری ملازمتوں میں

حصول تعلیم کے بعد ہندوؤں کو سرکاری ملازمتوں میں آگے بڑھایا گیا۔ تجارت میں وہ پہلے ہی انگریزوں کے دست راست اور شریک تھے۔ اب حکومت میں بھی وہ دست راست اور شریک بن گئے۔ ہندوؤں کے ساتھ خصوصی رعایات برتی گئیں۔ مثلاً ولیم ہنٹر لکھتا ہے۔

"سندربن کے کمشنر نے گورنمنٹ گزٹ میں اعلان کیا تھا کہ جو آسامیاں (ملازمتیں) خالی ہوں ان پر ہندوؤں کے علاوہ کسی کا تقرر نہ کیا جائے۔"[3]

## ہندوؤں پر دولت کی بارش

انگریزی حکومت کی نوازش اور مہربانیوں سے ہندو دولت میں کھیل رہے تھے۔ پہلے گورنر

---

[1] British policy on Muslims in Bengal
By A. R. Mullick, p. 164, P. 266

[2] Indian Mussimen — W. W. Hunter P. 158

[3]

جنرل وارن ہیسٹنگز کا بنیا شریک کار گنتو بابو تیرہ لاکھ روپیہ کا ٹھیکیدار تھا۔ اس کا دوسرا شریک کار گوبند سنگھ تھا۔ جس کے متعلق دار العوام لندن کی تحقیقات میں تسلیم کیا گیا تھا کہ اس کی دولت تین کروڑ بیس لاکھ روپیہ ہے[1]۔ گورنر کا دیوان اگرچہ ملازم تو صرف ساٹھ روپیہ کا تھا۔ مگر مرنے کے بعد اس نے ساڑھے بارہ کروڑ روپیہ کا ترکہ چھوڑا تھا۔ کمپنی کے ایک گماشتے روپ کشن نے اپنی ماں کے مرنے پر جو کھانا کیا تھا اس میں نوے لاکھ روپے خرچ ہوئے تھے[2]۔ یہی وہ عنایات بے غایات تھیں جن کی وجہ سے سب سے پہلے ہندو رہنما راجہ رام موہن رائے نے انگریزی حکومت کو ہندوؤں کے حق میں عطیہ الٰہی Divine Dispension قرار دیا تھا[3]۔

******

---

[1] بنگالی مسلمانوں کی صد سالہ جدوجہد۔ از عبد اللہ ملک ص مجلس ترقی ادب لاہور۔

[2] مسلمانوں کا روشن مستقبل۔ مولانا طفیل احمد بنگلوری۔ ص ۱۲۹۔

[3] History of India By Mahajan P. 592 Delhi 1962

## چوتھا باب

# انگریزی حکومت کی پالیسی مسلمانوں کے ساتھ

## بنگال کی حکومت کا فرمان

مغل شاہنشاہ شاہ عالم بادشاہ دہلی نے ۱۲ اگست ۱۷۶۵ء کو ایک فرمان کے ذریعہ بنگال بہار اور اڑیسہ کے دیوانی اختیارات ایسٹ انڈیا کمپنی کو منتقل کر دیئے جس طرح اس سے قبل یہ اختیارات علی وردی خاں نواب بنگال کو منتقل کیے گئے تھے۔ مذکورہ بالا فرمان کے الفاظ یہ تھے۔

"اس پُر مسرت زمانہ میں ہمارا فرمان واجب الاذعان اس مضمون کا شرف صادر ہوتا ہے کہ بہرگاہ بلند مرتبت، صاحب سطوت وقوت سر جملۂ اکابر و شرفائے عالی شان، سر بر آوردہ مبارزان بے مثال، ہمارے فدوی، جاں نثار، اخلاص کیش، بہی خواہ، سزاوار عنایات شاہانہ انگریز کمپنی کی فدویت اور خدمات کی مراعات ہمارے مدِ نظر ہیں، اس لیے ہم نے کمپنی کو صوبہ جات بنگال، بہار اور اڑیسہ کی دیوانی معاف اور التمغا[1] کے طور پر بلا شرکت غیرے عطا کی ہے۔ لازم ہے کہ مذکرہ کمپنی ہماری شاہی مال گزاری کے لیے چھبیس لاکھ روپیہ کی رقم ادا کرنے کی ضامن رہے گی۔"[2]

اختیارات اور حقوق کی اس دستاویز کی رو سے اس جان نثار اور اخلاص کیش کمپنی کے لیے کسی اخلاق اور قانون کی رو سے یہ بات جائز نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ اقتدار پر قبضہ کرتے ہی بنیے

[1] التمغا ترکی لفظ ہے اس کے معنی بھی معافی کے ہیں۔

[2] Photostate ... 1915 Photo State Making of British India — P 84

مہربان آقا کی نافرمانی کرتی۔ اور آقا کے رائج کردہ نظامِ حکومت و سلطنت، قانون اور ضابطوں میں ادنیٰ درجہ کا تغیر روا رکھتی۔ انگریز مؤرخین کتنی ہی ذہنی بلند پروازی دکھائیں اس فرمان کی رو سے وہ خود مختار ہی اور آزاد حکمرانی کا کوئی جواز نہیں پیدا کر سکتے۔ امرِ حقیقت تو یہ ہے کہ مغل شہنشاہ دہلی کی اجازت اور منظوری کے بغیر کمپنی کے جاری کردہ تمام قوانین اور احکام کا کوئی آئینی اور دستوری جواز نہیں تھا۔

## مسلمانوں سے نفرت کے اسباب

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انگریز کمپنی کی حکومت نے مسلمانوں کے خلاف معاندانہ رویہ کیوں اختیار کیا۔ اس نفرت کے بہت سارے اسباب تھے۔

۱۔ یہ نفرت صلیبی جنگوں (۱۰۹۵-۱۲۹۱ء) کے زمانہ سے اہلِ مغرب کے دلوں میں موروثی چلی آرہی ہے۔ اسی وجہ سے مغربی سیاحوں نے بلا سبب مسلمانوں کے خلاف اپنے سفر ناموں میں تہمتیں گھڑی ہیں۔ اسی وجہ سے اہلِ پرتگال نے کسی ظاہری سبب کے بغیر مسلمانوں اور عربوں پر مظالم کے پہاڑ توڑے۔

۲۔ انگریز ہندوستان میں تاجر بن کر آئے تھے۔ ان کی تجارت نہ پُرامن تھی نہ ضابطہ اخلاق کی پابند تھی۔ ان کے طرزِ عمل سے ہزار ہا افراد کو شکایات پیدا ہوتی رہتی تھیں۔ وقت کے حکمران مسلمان امرا اور حکام کو مظلوموں کی دادرسی کرنا پڑتی تھی۔ اور انگریز تاجروں کو ارتکابِ جرائم سے اور بے ضابطگیوں سے باز رکھنا پڑتا تھا۔ اس لیے مسلمان حکام کے خلاف انگریزوں کے دلوں میں غبار بھرا ہوا تھا۔ گردشِ دوراں سے جب انگریز کمپنی تجارت کی گدی سے اٹھ کر تختِ حکومت پر براجمان ہوگئی تو دلوں کا غبار رنگ لایا۔ انھوں نے مسلمانوں سے گن گن کر انتقام لیا۔ خاص طور پر اس لیے کہ وہ بیک وقت تجارت بھی کرتے تھے اور حکومت بھی کرتے تھے۔

۳۔ انگریزوں نے ہندوستان کی حکومت مسلمانوں سے چھینی تھی۔ ان کو بغاوت کا خطرہ اگر کسی طرف سے ہو سکتا تھا تو وہ مسلمان تھے۔ ہندوستان کا گورنر جنرل لارڈ ایلن بارو لکھتا ہے۔

"میں اس حقیقت سے آنکھیں بند نہیں کر سکتا کہ یہ نسل (مسلمان) بنیادی طور پر ہماری دشمن ہے۔ اس لیے ہماری صحیح پالیسی یہ ہے کہ ہندوؤں کو خوش کیا جائے۔"[1]

۴۔ سیاسی فہم اور منصوبہ بندی کے علاوہ مسلمان قوم ہر اعتبار سے انگریزوں کے ہم پلہ اور مدمقابل تھی۔ شجاعت اور بہادری میں بلاشک ان کی حریف تھی۔ انگریزی مؤرخ کے بقول دکن کے مسلمان جنرل محمد یوسف اور جمال میاں کے جنگی کارنامے اسی طرح یادگار رہیں گے جس طرح فورڈ Ford کلائنڈ Calliand اور کوٹ Coote کے کارنامے یادگار ہیں۔[2]

محکمہ مال کی دقیقہ سنجیوں میں بھی مسلمان بہت اعلیٰ فہم رکھتے تھے۔ ہندوستان کے گورنر جنرل لارڈ ولیم بنیٹنک کا اعتراف موجود ہے کہ

"دیوانی معاملات کی فہم میں کوئی ہندوستانی یا کوئی یورپین حکیم مہدی علی خان مدارالمہام نواب اودھ سے زیادہ سوجھ بوجھ نہیں رکھتا تھا۔"

عمومی صلاحیتوں کے اعتبار سے مسلمان ہندوستان کی تمام دوسری اقوام سے برتر اور فائق تھے۔ ہنری ہیرنگٹن تھامس لکھتا ہے۔

"عزم و ہمت، تعلیم اور ذہنی صلاحیت کے اعتبار سے مسلمان ہندوؤں سے کہیں زیادہ فائق ہیں۔ ہندو ان کے سامنے طفل مکتب معلوم ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں

---

[1] Letters of Lord Ellen Borough to Lord Wellington 18 Jan, 1847

[2] History of India — By Marshman P. 368 P. 368

مسلمانوں میں کارگزاری کی اہلیت بہت زیادہ ہے جس کی وجہ سے سرکاری ملازمتیں زیادہ تر انہی کو ملتی ہیں۔"[1]

ولیم ہنٹر بھی مسلمانوں کی خوبیوں کا اعتراف کرتا ہے۔

"حقیقت یہ ہے کہ جب یہ ملک ہمارے قبضہ میں آیا تو مسلمان یہاں سب سے اعلیٰ قوم تھے۔ نہ صرف جرأت اور زور بازو میں برتری رکھتے تھے۔ بلکہ سیاسی تنظیم اور عملی سیاست میں بھی سب سے آگے تھے۔"[2]

ظاہر ہے انگریز ایسی حریف قوم سے خائف تھے۔ اس لیے وہ ان کو ناکارہ پس ماندہ اور پست ہمت بنا دینا چاہتے تھے۔ تاکہ آئندہ ان کی جانب سے کسی قسم کا خطرہ باقی نہ رہے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے انگریزوں نے ایک طویل المیعاد منصوبہ بنایا اور اس پر سختی سے عمل کیا۔ اور بالآخر ایک ترقی یافتہ پُرعزم قوم کو مفلس، پست ہمت اور ناکارہ بنا دیا۔ اس منصوبہ کے چند اجزاء یہ تھے۔

۱۔ مسلمانوں پر رزق کا دروازہ بند کر دیا جائے۔ ان کو مفلس اور نادار بنا دیا جائے۔

۲۔ تعلیم کے دروازے ان پر بند کر دیے جائیں۔ ان کو جاہل اور پس ماندہ بنا دیا جائے۔

۳۔ ان کی تاریخ کو مسخ کر دیا جائے۔ ان کے اندر احساس کمتری پیدا کر دیا جائے۔

۴۔ ہندوستان کی دوسری قوموں کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف نفرت پیدا کر دی جائے۔

یہ ایک طویل المیعاد منصوبہ تھا جس پر انگریزی حکومت نے مستقل مزاجی سے عمل کیا۔ اور بالآخر ایک مہذب اور شائستہ قوم کو جاہل نادار اور مقہور بنا دیا۔

---

[1] Indian Rebellion and our Policy by Henry Herrington Thomas P. 135.

[2] Indian Musalman – W. W. Hunter – 145

## افلاس کی مار

جس وقت انگریز ہندوستان میں آئے اس وقت مسلمان مادی اعتبار سے آسودہ حال اور فارغ البال قوم تھے۔ دولت و ثروت میں وہ امتیازی حیثیت کے مالک تھے۔ مگر انگریزی حکومت نے طے کر لیا تھا کہ ان کو مفلس اور نادار بنانا ہے۔ اس مقصد کے لیے مندرجہ ذیل طریقے اختیار کیے گئے۔

### (۱) استمراری بندوبست

ایسٹ انڈیا کمپنی ایک تجارتی کمپنی تھی۔ جو گردش دوران سے حکمران بن گئی۔ اس کا اصل مقصود نفع حاصل کرنا تھا۔ پہلے گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز نے محکمہ مال گزاری کے وسیع اور پیچیدہ طریقہ کار کو یک قلم ختم کر دیا۔ کاشت کاروں اور زمینداروں کے مفادات سے آنکھیں بند کر لیں۔ اور ساری زمینات کو نیلام کر دیا۔ دوسرے گورنر جنرل لارڈ کارنوالس نے سال بسال نیلام کرنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی۔ بلکہ ساری زرعی زمینات کو دائمی ٹھیکہ پر دے دیا۔ تاکہ کمپنی کے خزانہ کو ایک متعین رقم ملتی رہے۔ بیشتر کاشت کار اور زمیندار مسلمان تھے۔ اور ٹھیکیدار ہندو تھے۔ نو دولتیے ٹھیکیداروں کا ایک نیا طبقہ معاشرہ میں پیدا ہو گیا۔ یہ بینر جی چیٹر جی، مکر جی، مجومدار، ٹیگور، سین، داس گپتا خاندان سب کے سب استمراری بندوبست آراضی کی پیداوار ہیں۔ مسلمان کاشت کاروں پر ہندو ٹھیکیدار کس قدر ظلم و ستم کرتے تھے اس کا اندازہ راجہ رام موہن کے بیان سے ہوتا ہے۔

"ایک کاشتکار جو زمین کی رقم ادا نہیں کر سکتا تھا وہ مجبور ہو کر اپنی جوان لڑکی نیچ ذات کے ہندو کے ہاتھ فروخت کر دیتا تھا۔ اور اس رقم سے ٹھیکہ کی رقم ادا کرتا تھا۔"[۱]

---

(۱) بنگالی مسلمانوں کی صد سالہ جدوجہد از عبداللہ ملک ص ۵۵ مجلس ترقی ادب لاہور

## (۲) صنعت و حرفت کی تباہی

(۱) بہار و بنگال میں مسلمانوں کا ایک طبقہ (جولاہے) صنعت پارچہ بافی میں مشہور تھے۔ ڈھاکہ کی ململ اپنی نفاست کے اعتبار سے ساری دُنیا میں مشہور تھی۔ کمپنی کے ملازم اپنی تجارت کے لیے ان سے ململ بنواتے تھے۔ کمپنی کے ملازموں کے سامنے وہ بیچارے بالکل بے بس ہوتے تھے یہ ملازم ان پر بے اندازہ مظالم ڈھاتے تھے۔ ان کا ذکر راجہ رام موہن رائے نے کیا ہے۔

"کمپنی کے ملازم جولاہوں کو ایک مکان میں بند کر دیتے تھے۔ کمپنی کے کارندے ان سے کم قیمت پر اور جلدی کپڑا تیار کرانا چاہتے تھے۔ ہر جولاہے پر ایک سپاہی مسلط ہوتا تھا۔ کام میں سُستی کرنے پر جولاہے پر سخت مار پڑتی تھی۔"[۱]

۲) متعدد مثالیں ایسی ملتی ہیں کہ ریشم کاتنے والے جولاہوں نے کمپنی کے کارندوں کے مظالم سے بچنے کے لیے اپنے انگوٹھے کٹوا لیے تھے۔ اور خود کو ناکارہ بنوا لیا تھا۔ تاکہ وہ ان مظالم سے بچ سکیں۔"[۲]

(۳) نیل کے مُسلمان کاشتکاروں پر بھی اسی نوع کے مظالم ہوتے تھے اس سلسلہ میں باقرگنج کے ایک انگریز جج نے ایک مقدمہ میں لکھا تھا۔

"نیل کی کاشت سے خواہ حکومت کو کتنا ہی مالیا نہ وصول ہوتا ہو۔ مگر رعیت کے نقطہ نظر سے یہ بہتر ہوتا کہ نیل کا پودا سرے سے کاشت ہی نہیں کیا جاتا۔ تاکہ کاشت کاروں پر یہ مظالم تو نہ ہوتے۔"[۳]

---

۱؎ Economic History of India by P. Dutt Vol. I P. 264, P. 25, 27

۲؎ Muslim Struggle for Freedom in Bengal

۳؎ By Dr. Moinuddin Ahmad Dacca 1960 P. 12

## (۳) ملازمتوں سے محرومی

مسلمانوں کا ایک بہت بڑا طبقہ ملازمت پیشہ تھا۔ کمپنی کی حکومت نے پے در پے ایسے اقدامات کیے جن کی وجہ سے یہ طبقہ روزگار سے محروم ہو گیا۔ وارن ہیسٹنگز نے مغل دور کی عدالت مال ختم کر دی جس سے ایک طرف کاشتکاروں اور زمینداروں کی مصیبتوں میں اضافہ ہو گیا۔ اور دوسری طرف اس شعبہ سے وابستہ ہزاروں افراد بیکار ہو گئے۔ ان میں سے بیشتر لوگ مسلمان تھے۔

کارنوالس نے ۱۷۹۳ء میں مغل دور کے نظام چوکیدارہ کو ختم کر دیا جو دیہات میں امن و امان برقرار رکھنے کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ اس سے ایک طرف دیہات میں امن و امان کی حالت بگڑ گئی اور دوسری طرف اس شعبہ سے وابستہ ہزاروں افراد بے روزگار ہو گئے۔

فوج میں مسلمانوں کی تعداد غیر معمولی ہوتی تھی۔ مسلمان سب سے زیادہ فوج کی ملازمت کو پسند کرتے تھے۔ ہمارا قومی شاعر غالب کہتا ہے

ع سو پشت سے ہے پیشہ آبا سپہگری

لارڈ کارنوالس نے ایک حکمنامہ کے ذریعہ آگاہ کیا کہ آئندہ سے کسی شریف مسلمان کو فوج میں افسر کا عہدہ نہ دیا جائے۔ البتہ وہ سپاہی رہ سکتا ہے[1] اس کے نتیجے میں ہزارہا افراد بے روزگار ہو گئے۔ اور ہزاروں گھر تباہ ہو گئے۔

سول حکومت میں بھی کوئی بڑا عہدہ مسلمانوں کو نہیں مل سکتا تھا۔ صرف ۲۵ روپیہ ماہانہ کا داروغہ مقرر کیا جا سکتا تھا[2] جس کے حصول کے لیے بھی کمپنی کے ملازموں کو رشوت اور نذرانہ دینا پڑتا تھا۔ لارڈ ہارڈنگ نے ۱۱۔ اکتوبر ۱۸۴۴ء کو ایک حکمنامہ جاری کیا۔ جس کے تحت

---

[1] Indian Musalman Co. W. Hunter P. 124

[2] سیر المتاخرین از طباطبائی۔

انگریزی ناخواندہ افراد پر سرکاری ملازمت کے دروازے بالکل بند کر دیے گئے۔ ۱۸۶۰ء میں صدر عدالت کو ہائی کورٹ کا نام دیا گیا۔ اور عدالتی کارروائی کو فارسی زبان سے انگریزی زبان میں تبدیل کر دیا گیا۔ اس اقدام سے ہزاروں مسلمان وکلاء بے روزگار ہوگئے۔ پھر ایک ضرب خاص مسلمانوں پہ لگائی گئی ۱۸۶۴ء میں قاضی ایکٹ پاس ہوا۔ قاضی کورٹ ختم کر دی گئیں۔ ان کے لیے جج مسلمان ہونا بھی ضروری نہ رہا۔ ان اقدامات کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہزارہا افراد بے روزگار ہو گئے۔ شرفاء کے گھرانے پیسے پیسے کے محتاج ہو گئے۔ ان کی حالت بقول سر سید یہ ہو گئی کہ

"ہائی کورٹ میں جا کر علوم شرقی کے علماء (وکلاء) کا حال دیکھو۔ ان کے منہ پر مکھیاں بھنکتی ہیں"[۱]

## ۵) مفلسی اور ناداری کی عمومی حالت

اس منصوبہ پر عمل درآمد کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان قوم ہر طرف مفلس اور نادار نظر آنے لگی۔ بیکاروں اور بے روزگاروں کا ایک غول تھا جو ہر طرف گھومتا نظر آتا تھا۔ بعض دردمند مسلمانوں کو عوام کی اس ناگفتہ بہ حالت پر رحم آیا۔ انھوں نے اس تدارک کے لیے کوشش کی۔ مولانا فضل حق خیر آبادی صدر الصدور دہلی نے ۱۸۴۳ء میں شہنشاہ دہلی اکبر ثانی کی خدمت میں رعایا کی بدحالی کی شکایت پیش کی۔ اس عرض داشت میں وہ لکھتے ہیں۔

---

۱۔ مقالات سر سید۔ حصہ ہشتم۔ ص ۹۴۔ لاہور ۱۹۶۲ء۔

چونکہ پہلے منصف کے عہدہ پر تمام مسلمان ہوتے تھے پہلی مرتبہ جب ۱۸۵۴ء میں منشی بھولا ناتھ جج مقرر ہوئے تو سررشتہ دار نے حسب عادت ان کے نام کے سامنے لکھا "روبکار از دفتر خان بہادر مولوی حافظ منشی بھولا ناتھ صاحب"۔ منشی جی نے سررشتہ دار سے جھلا کر کہا "کمبخت تو نے مجھے مسلمان بنا دیا"۔ اس نے کہا حضور اور کیا لکھتا۔ نواب محسن الملک نے اپنے ایک لیکچر میں یہ لطیفہ بیان کیا تھا۔

"یہاں کے باشندے ہندو ہوں یا مسلمان ملازمت، تجارت، زراعت، حرفت، زمینداری اور دریوزہ گری پر معاش رکھتے ہیں۔ انگریزی حکومت کے قیام کے بعد سے معاش کے یہ تمام وسائل مسدود و مفقود ہو گئے ہیں۔ ملازمتوں کے دروازے شہریوں پر بند ہیں۔ تجارت پر انگریزوں نے قبضہ کر لیا ہے۔ کپڑا، سوت، ظروف، گھوڑے وغیرہ وہ انگلینڈ سے لا کر خود فروخت کرتے ہیں۔ اور نفع کماتے ہیں معافی داروں کی معافیاں ضبط کر لی گئی ہیں۔ کسانوں کو محاصل کی زیادتی نے بدحال کر دیا ہے۔ ان چاروں طبقوں کی زبوں حالی کے نتیجے میں اہل حرفہ اور پھر ان سب کے نتیجے میں دریوزہ گر تنگی معاش کا شکار ہیں۔" [1]

بیروزگاری کی شکایت اس دور کی شاعری میں عام ہے۔ انشاء اللہ خاں لکھنوی لکھتے ہیں:

"نجیبوں کا عجب کچھ حال ہے اس دور میں یارو
جہاں دیکھو یہی سنتے ہیں کہ ہم بیکار بیٹھے ہیں

یہ دونوں بزرگ اس دور کے عینی شاہد ہیں۔ دوسرے مؤرخ بھی یہی لکھتے ہیں۔ انگریزی حکومت کی ان تدابیر کا نتیجہ اس صورت میں ظاہر ہوا کہ ۱۸۶۹ء تک ایک بھی شریف مسلمان خوش حال باقی نہیں رہا۔ جو کسی سرکاری عہدے پر فائز ہو۔ علماء، فضلاء، نوابین اور امراء کی اولاد لکڑ ہارے اور سقے کا کام اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے۔ [2]

ایک اور مصنف لکھتا ہے۔

"کیا غضب ہے کہ وارن ہیسٹنگز کا شریک تجارت گنتو بابو تو دولت میں کھیلے۔ اور اپنی ماتا کے مرنے پر کریا کرم کے کھانے پر نو لاکھ روپیہ صرف کر دے [3] اور

---

[1] فضل حق خیر آبادی اور سن ستاون۔ از حکیم محمود احمد برکاتی ص ۲۵، ۴۴ برکات اکیڈمی۔ کراچی ۱۹۷۰ء

[2] Indian Musalman – W. W. Hunter

[3] قائد اعظم میری نظر میں۔ از ابوالحسن اصفہانی۔ ص ۲۰

شاہانِ مغلیہ، سلطان ٹیپو، کی اولاد نانِ شبینہ کی محتاج ہوا ور بھوکوں مرے ؟"

## جاہل اور پس ماندہ بنانا

جب انگریز یہاں آئے تو مسلمان یہاں کی اعلیٰ تعلیم یافتہ اور مہذب قوم تھے۔ مسلمانوں میں معیارِ تعلیم بہت بلند تھا۔ اور خواندگی کا دائرہ بھی بہت وسیع تھا۔ وہ انگریزی زبان اور مغربی علوم سیکھنے کے بھی خواہش مند تھے۔ جیسا کہ بشپ ہیبر نے اپنے سفرنامہ ۱۸۲۴ء میں لکھا ہے۔ مگر انگریزی حکومت کی پالیسی ان کو جاہل اور پس ماندہ بنانا چاہتی تھی۔ اس غرض کے لیے حکومت نے مندرجہ ذیل طریقے اختیار کیے۔

### (۱) اوقاف کی ضبطی

مسلمانوں کا نظامِ تعلیم حکومت کی مداخلت سے آزاد ایک خود کار نظام تھا۔ جو اوقاف اور معافیوں کی آمدنی سے چلتا تھا۔ ملک کے سارے حصوں میں ایسے اوقاف موجود تھے۔ ہر جگہ مدارس بھی موجود تھے۔ نئی نسلوں کی تعلیم و تربیت کا کام بغیر خلل اندازی کے تسلسل کے ساتھ بلا انقطاع جاری رہتا تھا۔ ہزاروں علماء اور مشائخ شعبہ تعلیم سے وابستہ تھے۔ فکرِ معاش سے آزاد وہ اس کارِ عبادت میں مشغول رہتے تھے۔

یہ تمام حقائق انگریزی حکومت کو معلوم ہوئے۔ کمپنی کی حکومت نے تعلیم کے اس سرچشمہ کو ختم کرنے اور خشک کرنے کی اسکیم بنائی۔ ۱۸۱۰ء میں لارڈ ویلزلی نے قوانین بازیافت (Resumption Acts) نافذ کرکے اوقاف، معافیوں اور لاخراج زمینوں کو بحق سرکار ضبط کرلیا پھر دوبارہ لارڈ ولیم بنیٹنک نے ۱۸۲۸ء میں نہایت سخت گیر قانون نافذ کیا۔ اس بے رحمانہ قانون کو انتہائی بے رحمی سے نافذ کیا گیا۔ ولیم ہنٹر کے بقول اس اقدام نے مسلمانوں کے نظامِ تعلیم کو تباہ اور غارت کردیا۔ اس قانون نے مسلمانوں کے نظامِ تعلیم پر شاہ ضرب لگائی۔[1]

---

(۱۔ حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھیے)

## (۲) مدارس کا خاتمہ

ان اقدامات نے شعبۂ تعلیم کے مالی سوتے خشک کر دیے۔ تمام دینی مدارس سوکھے درختوں کی طرح گر پڑے۔ ہنٹر نے پرانے نظامِ تعلیم کی اس تباہی پر سخت افسوس کا اظہار کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے۔

"زیادہ مدت نہیں گزری کہ پرانے نظامِ تعلیم کو تباہ کرنے کا کام منظم طور پر شروع ہوا۔ اور ڈائریکٹر تعلیمات کو بار بار خوشی کے ایسے لمحات میسر آتے تھے جو ایک سال میں اور ایک ہی تحصیل میں چھ چھ اور سات سات سو دینی مدارس کے بند ہو جانے کی اطلاع سے عبارت ہوتے تھے" [۱]

نظامِ تعلیم کی تباہی کے ساتھ ضمنی نتیجہ یہ بھی نکلا کہ علماء اور مشائخ کے ہزاروں خاندان جو صدیوں سے تعلیم سے اشتغال رکھتے تھے۔ ان پر اچانک برق بلا آ گری۔ وہ بے روزگار ہو گئے۔ وہ تباہ و برباد ہو گئے۔ وہ بھوکوں مرنے لگے۔

## (۳) عربی فارسی زبانوں کی تعلیم ختم

عربی فارسی زبانوں کی اہمیت مسلمانوں کے نزدیک بہت زیادہ ہے ان کا سارا مذہبی لٹریچر ان زبانوں میں ہے جس کو پڑھ کر ان کی دینی اور ملی شخصیت کی تعمیر ہوتی ہے۔ ان زبانوں میں ان کا شاندار ماضی محفوظ ہے۔ ان زبانوں کے ذریعے سے وہ عالمِ اسلام سے مربوط رہتے ہیں۔ ۱۸۳۵ء میں میکالے اور بینٹنک نے اپنی تعلیمی اسکیم نافذ کی۔ اور عربی فارسی کی تعلیم یک قلم

---

[۱] علماء حق کا شاندار ماضی محمد میاں۔ جلد اول۔ ص ۲۱

[۲] Our Indian Musalman P. 127.

نفرت ز ردی۔ اس ایک ضرب نے مسلمانوں کی نئی نسلوں کو ان کے دین سے، انکے شاندار ماضی سے، اور بیرونی مسلمان ممالک سے کاٹ کر پھینک دیا۔ اس طرح ان کے اور ان کے شاندار ماضی کے درمیان انقطاع واقع ہو گیا۔ وہ اپنے اسلاف کے کارناموں سے بے خبر ہو گئے میکالے نے تو یہ بھی تجویز پیش کی تھی کہ ہندوستان میں عربی رسم الخط ختم کر دیا جائے۔ اس کی جگہ رومن رسم الخط رائج کیا جائے۔[1] مگر اس باب میں حکومت کو کامیابی نہ ہو سکی۔

## ۴) مسلمانوں کے تہذیبی اثرات سے بیگانہ بنانا

مسلمانوں نے ہندوستان میں آٹھ سو سال حکومت کی ہے۔ یہاں کی سرکاری زبان ہمیشہ فارسی رہی ہے۔ راجپوتوں، مرہٹوں اور سکھوں کی علاقائی حکومتوں میں بھی سرکاری زبان فارسی ہی رہی۔ اس طویل مدت میں مسلمانوں کے تہذیبی اور مذہبی اثرات یہاں کی بسنے والی مختلف قوموں پر پڑے۔ یہاں کی تہذیب و تمدن، معاشرت و اخلاق پر زبان کے توسط سے گہرے اثرات مرتب ہوتے۔ اور جب تک فارسی زبان ملکی زبان رہی یہ اثرات منتقل ہوتے رہے۔ انگریزی حکومت اپنی سیاسی حکمت عملی کے پیش نظر ہندوؤں کو مسلمانوں سے جدا کر دینا اور کاٹ دینا چاہتی تھی۔ وہ ان تہذیبی اثرات کی بحالی اور برقراری کو برداشت نہیں کر سکتی تھی اس لیے اس نے فارسی زبان کی سرکاری حیثیت ختم کر دی۔ مدارس میں اس کی تعلیم ممنوع قرار دے دی۔ اس اقدام سے اس کا مقصد یہ تھا کہ اسلامی تہذیبی اثرات کو ختم کر دیا جائے۔ ہندوؤں کی نئی نسلوں کو ان اثرات سے بالکل بیگانہ بنا دیا جائے۔

## (۵) مغربی تعلیم کا اجراء

ہندوستان میں مغربی تعلیم کا اجرا مسیحی مشنریوں کے ذریعہ عمل میں آیا ہے۔ ۱۸۱۵ء سے

---

[1] خطبات گارساں دی تاسی، جلد اول۔ ص ۲۲۵۔ طبع انجمن ترقی اردو کراچی۔

انھوں نے یہاں تعلیمی ادارے قائم کرنے شروع کر دیے تھے۔ آغاز کار میں تو صرف انگلستان کے مسیحی اداروں کو یہاں مدارس کھولنے کی اجازت تھی۔ مگر ۱۸۳۳ء کے چارٹر میں برطانوی پارلیمینٹ نے دنیا بھر کے مسیحی مشنریوں کو اجازت دے دی کہ وہ ہندوستان میں آئیں اشاعت مسیحیت کے مقدس کام میں ہاتھ بٹائیں۔ ۱۸۵۷ء تک سارا کام انھی مشنریوں کے ہاتھ میں تھا۔ کمپنی کی حکومت نے کوئی تعلیمی ادارہ نہیں قائم کیا۔ وہ بھی انھی مشنری تعلیمی اداروں کی ہر طرح امداد اور معاونت کرتی تھی۔

ان اداروں کا اصل مقصد عوام کو تعلیم یا فتہ بنانے سے زیادہ ان کو مسیحی بنانا تھا۔ یہ ادارے ہر ممکن طریقے سے دین مسیحیت کو پُرکشش اور جاذب نظر بنا کر پیش کرتے تھے۔ تاکہ طلبہ ان کی دین راغب ہو جائیں۔ کالجوں کے نام مسیحی راہبوں کے نام پر رکھے جاتے تھے۔ سینٹ جان اسٹیفن کالج وغیرہ۔ درس گاہ کے اندر حضرت مسیح علیہ السلام اور حضرت مریم کا مجسمہ نمایاں مقام پر نصب ہوتا تھا۔ پڑھانے والے اساتذہ بالکلیہ پادری ہوتے تھے۔ وہ مذہبی لباس پہنے ہوتے تھے جس پر صلیب نمایاں نظر آتی تھی۔ تعلیم کا آغاز مسیحی دعا سے ہوتا تھا۔ نصاب تعلیم میں انجیل لازمی تھی۔ جس کے متعلق بنگال کے سیکریٹری داخلہ فریڈرک ہالیڈے کا بیان دلچسپ ہے۔

> "میں سمجھتا ہوں کہ ہندو کالج کلکتہ میں انجیل مقدس کی تعلیم اس قدر زیادہ ہے کہ انگلستان کے کسی پبلک اسکول میں بھی اتنی نہیں ہوگی۔" [۱]

تعلیم لادینی تھی جس میں مسیحیت کی تعلیم تو لازمی تھی البتہ دیگر مذاہب کا داخلہ درس گاہوں میں ممنوع تھا۔ ہندوؤں کا معاملہ تو اور ہے۔ مسلمان بہر حال اتنے گئے گزرے نہیں تھے کہ وہ روٹی کے ٹکڑے کی خاطر مغربی تعلیم کے پردے میں دین مسیحیت کا لبادہ اوڑھ لیتے ظاہر

---

[۱] مسلمانوں کا روشن مستقبل۔ مولانا سید طفیل احمد منگلوری ص ۱۴۹ طبع بدایوں ۱۹۳۹ء

ہے کہ انھوں نے ایسے اسکولوں اور کالجوں کی طرف رُخ نہیں کیا۔ تعلیم کا یہ ڈھانچہ صاف بتا رہا تھا کہ مسلمانوں کو جدید تعلیم سے دُور رکھنا مقصود ہے۔ اور یہ ڈنڈھورا پیٹ دیا گیا کہ مُسلمان جدید تعلیم کے مخالف ہیں۔ سینہ زوری کی حد ہے۔

## (٦) کفر کے فتوے کا پروپاگنڈا

اپنی ان مذموم حرکتوں پر پردہ ڈالنے کے لیے اور الزام بھی خود مسلمانوں کے سر تھوپنے کے لیے انگریزوں نے یہ بات پھیلا دی کہ مُسلمان عُلماء نے انگریزی تعلیم سیکھنے کے خلاف کفر کے فتوے دیے ہیں۔ پھر اس الزام کی اس زور شور سے تشہیر کی گئی کہ اپنے اور بیگانے سب کو اس کا یقین آگیا۔

کوئی شخص آج تک ایسا کوئی فتویٰ پیش نہیں کر سکا۔ اس کے برخلاف انگریزی زبان سیکھنے کے جائز ہونے کے حق میں شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (م ۱۸۲۴ء) اور مولانا عبدالحیّ لکھنوی (۱۸۸۶ء) کے فتاویٰ موجود ہیں۔ اور مُسلمان پرتگالیوں کے دور سے مغربی زبانیں اور مغربی علوم سیکھ رہے تھے[۱]۔ ہاں البتہ وہ اپنی نوخیز نسلوں کو مشنریوں کے جال میں دینے کے لیے تیار نہیں تھے۔ جب مشنریوں کے اثرات سے آزاد مدارس قائم ہونے لگے مثلاً علی گڑھ کالج تو مُسلمانوں نے وہاں شوق سے تعلیم حاصل کی۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اس سلسلہ میں لکھتے ہیں۔

"بعد میں جب انگریزی دَور آیا، تو اس نے ہمارے قوانین کو بدلا۔ ہمارے معاشی نظام کو بدلا۔ ہمارے معاشرتی نظام پر بدترین اثرات ڈالے۔ اِسلامی تعلیم بالکل اس بات پر منحصر ہوگئی کہ کھاتے پیتے لوگ مدد کریں تو اسلامی مدارس چل سکیں۔ حکومت نے اُن

---

[۱] تفصیل کے لیے دیکھیے مُصنف کی کتاب "مسلمان اور مغربی تعلیم"

مدارس کے تعلیم یافتہ لوگوں پر رزق کے دروازے بند کر دیے۔ اس کے برعکس جو نظام تعلیم انگریزوں نے رائج کیا وہ مسلمانوں کے ذہن سے خدا اور رسولؐ اور آخرت کے تصورات بالکل مٹا دینے والا تھا۔ اور رزق کے دروازے اس کے لیے کھلے ہوتے تھے۔

مذکورہ بالا تدابیر کو ذہن میں رکھ کر سوچیے کہ کس طرح انگریزی حکومت نے ایک طرف تو قدیم مدارس بند کرا دیے۔ دوسری طرف جدید مدارس میں ایسا ماحول پیدا کرایا کہ مسلمان آنے سے ٹھٹک گئے۔ نتیجہ بہر صورت یہ نکلا کہ مسلمان قوم کو ناخواندہ اور جاہل، پس ماندہ اور پست ہمت بنا دیا گیا۔

## تاریخ کو مسخ کر دیا

مسلمانوں میں احساس کمتری اور کہتری پیدا کرنے کے لیے انگریزوں نے طے کیا کہ ان کے افضل دین اور برتر تہذیب کو داغدار اور مجروح بنا دیا جائے تاکہ مسلمانوں کا ایمان مضمحل ہو جائے اور ان کی دینی اور اخلاقی ساکھ کو ختم کر دیا جائے۔ یہ کام انگریز مستشرقین نے علم و تحقیق کے نام پر انجام دیا۔ سیرت الرسول صلی اللہ علیہ وسلم پر، دین اسلام پر اور مسلمانوں کی تاریخ پر کتابیں تصنیف کر کے انھوں نے نکتہ چینی، عیب جوئی اور غلط فہمیوں کی ایک فصل بہار کھڑی کر دی۔ یہ سب کچھ دانستہ طور پر کیا گیا۔ اور اس لیے کیا گیا کہ مسلمان اپنے دین پر اپنی شاندار تاریخ پر فخر کرنا چھوڑ دیں اور احساس بیچ میرزی میں مبتلا ہو جائیں ان کا دل بجھ جائے۔

انگریزوں کے یہاں تاریخ نویسی کا مقصد حقیقت نگاری نہیں ہے بلکہ تاریخ نویسی سے ان کا مقصد سیاست کاری اور کاربرآری ہے۔[1] کمپنی کے دور حکومت میں اس مقصد کو سامنے رکھ کر ایلیٹ اور ڈاسن نے مشہور تاریخ لکھی۔ یہ ہندوستان کی جامع تاریخ ہے۔ یہ آٹھ جلدوں میں

---

[1] See Preface The Rise of Christian power in India by B. O. Wajer Bash Calcta 1922.

ہے۔ تلاش مواد کے لیے بڑی کاوش اور جستجو کی گئی ہے۔ تاریخ پر لکھی ہوئی تقریباً تمام کی کتابیں ان کے سامنے تھیں۔ مگر یہ تاریخ ایک خاص مقصد کے لیے خاص طرز پر مرتب کی گئی ہے ایک ہوشیار وکیل کی طرح ایسے تمام واقعات نمایاں کردیے گئے ہیں جن سے مسلمان بادشاہوں اور حکمرانوں کا کردار ایک داغدار اور گھناؤنا نظر آتا ہے۔ اسلامی دور کی تاریخ کی تصویر بڑی بھیانک کھینچی گئی ہے۔ تاکہ پڑھنے والا اس دور سے بیزار ہو جائے۔ ان تاریخ نویسوں نے ایک مذموم کوشش یہ کی کہ ہندوستان کی دوسری تمام قوموں کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف نفرت اور حقارت پیدا ہو جائے۔

## (۱) سکھوں میں نفرت

اس نوعیت کی تاریخ نویسی میں انگریزی سفیروں اور ریزیڈنٹوں نے خاص طور پر حصہ لیا ہے۔ لاہور کے ریزیڈنٹ میکالف نے سکھوں کی تاریخ لکھی ہے۔ اس میں لکھ دیا کہ مغل شہنشاہ نے گرو گوبند سنگھ کے کمسن لڑکوں کو زندہ دیوار میں چنوا دیا تھا۔ اس ایک تدبیر سے انگریزوں نے سکھوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مسلمانوں کا جانی دشمن بنا دیا۔ اس دشمنی کا مظاہرہ ۱۸۵۷ء میں اور ۱۹۴۷ء میں ہوا۔ آج کے زمانہ میں پروفیسر گیان سنگھ اور کرتار سنگھ نے اس واقعہ کی پرزور تردید کی ہے۔ مگر اس سے کیا ہوتا ہے۔ تیر تو نشانہ پر لگ چکا۔ نفرت تو دلوں میں بیٹھ گئی۔

## (۲) راجپوتوں میں نفرت

راجپوت اوّل روز سے مغل شاہنشاہیت کے پشتیبان اور دست و بازو رہے ہیں دونوں کے مابین ازدواجی روابط بھی قائم تھے۔ انگریزی حکومت کی حکمت عملی یہ تھی کہ راجپوتوں کو مغلوں سے کاٹ دیا جائے۔ اور ان کو اپنے دست و بازو بنا دیا جائے۔ اس مقصد کے لیے اودے پور کے ریزیڈنٹ کرنل ٹاڈ نے "ایام راجستھان" (ANNALS OF RAJASTHAN) ۱۸۰۹ء میں

لکھی اس نے بھاٹوں کو جمع کر کے غلط سلط واقعات کو اس انداز سے مرتب کیا کہ راجپوتوں کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف نفرت پیدا ہو جائے۔ بی۔ ڈی باسو نے اس کتاب کا مقصد ان الفاظ میں بیان کیا۔

"ٹاڈ نے کوشش کر کے راجپوتوں کے دلوں میں مسلمانوں اور مرہٹوں سے نفرت بٹھا دی۔ یہ اس لیے کیا گیا کہ راجپوت مرہٹہ اور مغل اتحاد قائم نہ ہو سکے۔"

اس کتاب کے مضامین پر تبصرہ کرتے ہوئے کلکتہ ریویو کے تبصرہ نگار رامانند چٹرجی لکھتا ہے "کہ کرنل ٹاڈ راجپوتوں سے بڑھ کر راجپوت ہے۔" اور میجر باسو لکھتا ہے۔ "اگر ٹاڈ کے بیانات صحیح تسلیم کر لیے جائیں تو پھر اکبر اعظم بھی مجسمہ شیطان نظر آتا ہے۔"

واضح رہے کہ اس وقت تک دہلی کے تخت پر مغل شہنشاہ بیٹھا ہوا تھا۔ اور اس وقت تک مرہٹہ طاقت کا بھی خاتمہ نہیں ہوا تھا۔ انگریزوں کو ان دونوں کی طرف سے خطرہ لگا ہوا تھا۔

## (۳) ہندوؤں میں نفرت

ممکن ہے مذکورہ بالا افراد کے متعلق یہ بات کہی جائے کہ یہ بعض افراد کی انفرادی کوششیں تھیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس مہم میں انگریزی حکومت کے ذمہ دار ترین افراد شریک تھے۔ لارڈ ایلن بارو (۴۴-۱۸۴۲ء) نے جنگ افغان اول (۱۸۳۹ء) میں شکست کھائی۔ پھر اس شکست کا بدلہ لینے کے لیے دوسری فوج افغانستان گئی۔ جنرل ناٹ قلعہ غزنی کا دروازہ فتح کے ثبوت کے طور پر ہندوستان لایا "تاکہ وہاں لوگوں کو یقین ہو جائے کہ خراسان فتح ہو گیا ہے۔" مگر لارڈ ایلن بارو گورنر جنرل نے یہ بات مشہور کر دی کہ یہ دروازہ درحقیقت سومنات کے مندر میں لگا ہوا تھا۔ اس کو محمود غزنوی اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ اب آٹھ سو سال بعد ہم اس دروازہ کو واپس ہندوستان میں لائے ہیں۔ اور اس طریقہ سے مسلمانوں سے ہندوؤں کا بدلہ لیا ہے اس دروازہ کو سرہند سے آگرہ تک ایک جلوس کی شکل میں لایا گیا۔ راستہ میں ہندو گروہ در گروہ اس کی

زیارت کرتے تھے اور اس کے سامنے سجدہ کرتے تھے[1]۔ اس ایک تدبیر نے ہندوؤں کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف نفرت پیدا کر دی اور انگریزوں کی محبت پیدا کر دی۔ حالانکہ بعد کی تحقیقات نے اس پروپاگنڈے کی پول کھول دی۔ ماہر تعمیرات جیمس فرگوسن (۱۹۰۷ - ۱۸۳۲ء) نے اس دروازہ کا خوردبین سے معائنہ کیا۔ اس کا بیان یہ ہے کہ اس دروازہ کی لکڑی دیودار کی ہے حالانکہ سومنات کے دروازے صندل کے تھے۔ اس لیے یہ سومنات والا دروازہ نہیں ہو سکتا۔ تحقیقات خواہ کچھ بھی ہوں حکومت کا مقصد پورا ہو گیا۔ ہندوؤں کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف نفرت بیٹھ گئی۔

## مسلمان غیر ملکی ہیں

انگریز مصنفین نے اپنی کتابوں کے ذریعہ دنیا بھر میں اس خیال کو شہرت دے دی کہ ہندوستان اور ہند مترادف ہیں۔ یہاں بس ہندو بستے ہیں مسلمانوں کا کہیں کوئی ذکر نہیں۔ اس کو اتنی شہرت دی کہ آج تک یورپ اور امریکہ میں یہی خیال عام ہے۔ ہندوستان کا لفظ سنتے ہی ہندو کا تصور ذہن میں آتا ہے۔

بعض انگریز مصنفین نے یہ شوشہ چھوڑا کہ مسلمان ہندوستان میں غیر ملکی ہیں۔ باہر سے آئے ہیں اور صرف ہندو ہی یہاں کے اصلی باشندے ہیں۔ ہوریس ولسن Horace Wilson جو اپنی شکل و صورت اور وضع قطع میں بنارس کا پنڈت نظر آتا تھا۔ جس کو برہمن پوجتے تھے[2]۔ سب سے پہلے اس نے یہ شگوفہ چھوڑا۔ دوسرے مستشرقین نے اس خیال کو خوب اچھالا۔ یہ بات ہندوؤں کے گھر میں اتر گئی۔ ہندو مذہب کا احیاء کرنے والے رہنما پنڈت دیانند سرسوتی نے اپنے نظام

---

[1] An abridged History of India By Johnclark Warsuman P 430 London 1873

[2] An abriged history of India by John Clork Warsuman P. 376

افکار کی بنیاد اسی تصور پر رکھی۔ کون ہندو ہے اور کون بدیسی ہے۔ یہ شوشہ ہی وہ بنیاد فراہم کرتا ہے جس سے ہندو مسلم فسادات کا آغاز ہوا۔ سب سے پہلا ہندو مسلم فساد کمپنی کی حکومت میں ۱۸۰۹ء میں ہوا تھا۔ پونے دو صدی کا عرصہ گزر چکا ہے مگر فسادات کا سلسلہ برابر جاری ہے۔ آزادی اور تقسیم ملک کے بعد بھی تو کمیا اور زیادتی ہو گئی ہے۔ لاکھوں بے گناہ انسان ان فسادات کی نذر ہو چکے ہیں۔ لاکھوں گھر نذر آتش ہو چکے ہیں۔ اپنی خود غرضی کے لیے نفرت و عناد کا یہ کیسا بیج انگریز نے بو دیا۔

## مذہب اسلام پر حملے

(۱) مسلمانوں کی تاریخ داغ دار بنا دینے کے بعد ایک قدم اور آگے بڑھایا۔ مذہب اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر نکتہ چینی اور عیب جوئی کی مگر یہ اس وقت کیا جب انگریزی سلطنت کو استحکام حاصل ہو گیا۔ مولانا رحمت اللہ کیرانوی (۱۳۰۹ھ) لکھتے ہیں۔

> "جب تک انگریزوں نے اپنی سلطنت ہندوستان میں قائم نہیں کر لی اور مکمل انتظام نہیں کر لیا، اس وقت تک۔ ۴۳ سال کے بعد —— ان کے پادریوں کی جانب سے کوئی دعوت و تبلیغ کا سلسلہ شروع نہیں ہوا۔ اس کے بعد انھوں نے اسلام کی تردید میں رسالے کتابیں لکھنا شروع کر دیں۔ ان کو ہندوستان کے مختلف شہروں میں اور عوام الناس میں تقسیم کرنا شروع کر دیا۔ بازاروں میں، لوگوں کے مجمع میں اور عام گزرگاہوں پر کھڑے ہو کر یہ پادری وعظ کہنے لگے۔"[۱]

---

[۱] میزان الحق۔ از مولانا رحمت اللہ کیرانوی۔

ان پادریوں کی حفاظت کے لیے سرکاری طور پر پولیس کا دستہ فراہم کیا جاتا تھا۔ چوراہوں پر کھڑے ہو کر یہ پادری اسلام اور پیغمبر اسلام کے خلاف بدزبانی کرتے تھے۔ بعض سرکاری افسران جو زیادہ جوشیلے ہوتے تھے وہ تمام ملازمین کو ایک جگہ جمع کر کے ان کو پادریوں کا وعظ سنواتے تھے۔ ۱۸۵۶ء میں دارالامارۃ کلکتہ سے لاٹ پادری ایڈمنڈ نے تمام سرکاری ملازمین کے نام چٹھیاں ارسال کی تھیں۔ ان میں لکھا ہوا تھا۔

"اب جگہ جگہ ریلوے اور سڑک جاری ہے۔ تار برقی کے ذریعے خبریں پہنچتی ہیں۔ اس لیے مناسب یہ ہے کہ اب تم سب لوگ عیسائی بن جاؤ۔"[1]

## (۲) پادریوں سے مناظرہ بازی

جگہ جگہ ان پادریوں نے مسلمانوں کو چیلنج دیا۔ اور مناظرہ کی دعوت دی۔ لاچار مسلمان علما۔ کو ان کا جواب دینے کے لیے میدان میں آنا پڑا۔ انھوں نے مسیحیت کا باقاعدہ مطالعہ کیا اور ضروری تیاری کی۔ عبرانی سریانی اور یونانی زبانیں سیکھیں۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلی کتاب جناب ممنون عباس علی بن محمد علی نے ۱۲۴۸ھ/۱۸۳۲ء میں لکھی جس کا نام ہے "صولۃ الضیغم علی اعداء ابن مریم" مطبوعہ ۱۲۵۸ھ پہلا مناظرہ مولانا آل رسول اور پادری فنڈر کے درمیان ہوا تھا۔ یہ مناظرہ تحریری تھا اور سات ماہ تک چلتا رہا۔ مگر سب سے زیادہ مشہور اور معرکۃ الآرا مناظرہ آگرہ میں ہوا تھا۔ یہ پادری فنڈر اور مولانا رحمت اللہ کیرانوی و ڈاکٹر وزیر خان کے درمیان ہوا تھا۔ سرکاری حکام اور ایک خلق کثیر تماشائی وہاں موجود تھی۔ اس موقعہ پر علماء نے پادریوں کو شکست فاش دی۔ جس کے بعد ان کا زور ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔[2]

---

[1] اسباب بغاوت ہند۔ از سر سید احمد خان دہلوی۔ ص ۱۵۹۔

[2] فرنگیوں کا جال از مولانا امداد علی صابری دہلوی ص ۱۴۰

## (۳) آریوں سے مناظرہ بازی

انگریز پادریوں کی شہ پاکر آریہ سماجیوں نے بھی اسلام اور بانی اسلام کے خلاف بدزبانی شروع کی۔ مسلمانوں کی آٹھ سو سالہ زندگی میں یہ پہلا موقع تھا۔ پنڈت دیانند سرسوتی (۱۸۸۳-۱۸۲۴ء) کی سرکردگی میں آریہ مناظروں نے اسلام کے خلاف زبان کھولی۔ علماء کے ایک گروہ نے ان کو بھی مسکت جواب دیے۔ اور ان کا منہ بھی بند کر دیا۔ ان میں مولانا قاسم نانوتوی اور عبد الحق حقانی وغیرہ مشہور ہیں۔

## (۴) انگریزی حرکات پر پردہ پوشی

مسلمانوں کے خلاف انگریزی حکومت کی بھی وہ اخلاق سوز حرکات تھیں جن کو وہ دوسری یوروپین اقوام کی نظروں سے مخفی رکھنا چاہتی تھی اس لیے کمپنی کی حکومت نے حکم جاری کر دیا تھا کہ کسی یوروپین کو ہندوستان میں آنے اور مقیم ہونے کی اجازت نہیں ہے[1] الا یہ کہ وہ کمپنی کی ملازمت اختیار کرے۔ اور سرکاری قواعد کا پابند بن جائے۔ یہ احتیاط اس لیے تھی کہ ایسے لوگ یورپ جاکر کمپنی کے طرز حکومت کا پردہ فاش نہ کر دیں۔ اور وہاں تنقید کا سلسلہ شروع نہ ہو جائے۔

## انگریزی حکومت کے خلاف فتویٰ

مرہٹوں اور راجپوتوں کی حکومتیں مسلمانوں کے خلاف اپنے دلوں میں بغض اور عناد کا جذبہ نہیں رکھتی تھیں بحیثیت مسلمان انھیں کوئی نفرت نہیں تھی۔ خراج اور مالگزاری وصول کرنے

---

[1] History of Mission

سے انھیں دلچسپی تھی۔ وہ مغل دور کے نظام معیشت و معاشرت، تعلیم و تربیت، قضا و عدالت میں بہت کم مداخلت کرتے تھے۔ مذکورہ بالا شعبوں کو بدستور علماء اسلام چلاتے رہتے تھے مگر انگریزوں نے سارے نظام حیات کو تلپٹ کر ڈالا، مسلمانوں کے خلاف شعوری طور پر معاندانہ اور مخالفانہ اقدامات کیے۔ ان کو مفلس اور قلاش، جاہل اور پس ماندہ بنا دیا۔

ان حالات میں مسلمان علماء کے لیے کوئی چارہ کار باقی نہ رہا کہ وہ انگریزوں کی اسلام دشمنی اور مسلم کش حکومت پر شریعت اسلامیہ کے مطابق فتویٰ نافذ کریں۔ اس لیے انھوں نے انگریزی حکومت کو غیر اسلامی اور کافرانہ قرار دیا۔ اور ہندوستان کو دار الحرب قرار دیا اس فتویٰ کے بعد مسلمانوں پر جہاد فرض ہو جاتا ہے تاکہ شر کی قوتوں کو طاقت کے ذریعہ رفع کیا جائے۔ اور اسلام کے لیے دوبارہ سازگار فضا پیدا کی جائے۔ بالفرض جہاد میں بھی ناکامی ہو تو پھر ایسے معاند ملک سے ہجرت کر جانا چاہیے تاکہ کسی دوسرے ملک میں جا کر اپنے دین و ایمان کی متاع کو محفوظ رکھا جا سکے۔ اس فتویٰ کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں کے سامنے اب یہی دو راستے رہ گئے تھے۔

********

## پانچواں باب

# مُسلمانوں کی مُجاہدانہ سرگرمیاں

شیخ مجدد کے اصلاحی کام کو شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (۱۷۰۳-۱۷۶۲ء) نے تکمیل کو پہنچایا۔

اتباع قرآن و سُنت کی دعوت کو انھوں نے پُورے استدلال کے ساتھ اور پوری قوت کے ساتھ پیش کیا۔ انھوں نے اسلامی نظام حیات کو ایک مربوط اور مرتب شکل میں پیش کیا۔ ان کے بعد ان کی اولاد امجاد نے اصلاح کا کام جاری رکھا۔ اور باپ کے افکار و نظریات کو ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں پھیلا دیا۔ ایک صدی کی کوششیں برگ و بار لائیں۔ اسلامی ہندوستان سیاسی اعتبار سے زوال آمادہ تھا مگر دینی اعتبار سے نہایت بیدار اور توانا تھا۔

ملک میں علمائے دین کا ایسا طاقتور گروہ پیدا ہو چکا تھا جو اسلام کی برتری کا دل سے قائل تھا۔ جو زندگی کے تمام معاملات میں قرآن و سُنت کی رہنمائی پر یقین رکھتا تھا۔ جو اسلام کو عملاً برپا کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ اس میں ایمان کی پختگی اور عقیدہ کی صلابت اس حد تک قوی تھی کہ وہ حصول مقصد کی خاطر جان کی بازی لگانے کے لیے تیار تھا۔ یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ ہندوستان کی ہفت صد سالہ زندگی میں ایسے پختہ نظر اور پختہ عمل گروہ کی نظیر ملنا دشوار ہے۔ اسلامیان ہند کی تاریخ میں یہ مقدس گروہ گل سرسبد کا حکم رکھتا ہے۔ مسلمانان ہندوستان کی بیداری درحقیقت اسی محترم گروہ کی مساعی کا نتیجہ ہے۔ مولانا عبید اللہ سندھی فرماتے ہیں۔

"مسلمانوں کی موجودہ بیداری کی تحریک سرسید کے تعلیمی مشن سے یا محمد علی جوہر کی تحریک سے یا مُسلم لیگ سے شروع نہیں ہُوئی۔ ........ عام

مسلمانوں کی تحریک کا سرچشمہ شاہ ولی اللہ کی تعلیمات ، شاہ عبدالعزیز کے وعظ وارشادات اور سید احمد شہید اور شاہ اسمٰعیل شہید کے جہاد سے پھوٹتا ہے۔ ؎

اگر پرانی بدعملی اور بے راہ روی کی زندگی برقرار ہوتی تو مسلمانان ہند کوئی بڑا اقدام نہیں کر سکتے تھے۔ تن آسانی کی زندگی کو خیرباد کہہ کر مصائب و آلام کے دریا میں نہ گھس سکتے تھے۔ لیکن جدید احیائے اسلام کی تحریک نے ان کے اندر ایک نئی رُوح پھونک دی تھی۔ ان کے اندر قلب ماہیت ہو چکا تھا۔ ان صاحبانِ عزیمت کی نگاہ میں مقصدِ عظیم کے مقابلہ میں مشکلات اور مصائب کی چنداں اہمیت نہیں تھی۔ یہی وجہ ہے بے سروسامانیوں کے باوجود ہزارہا مشکلات کے سامنے اس فاقہ مست گروہ نے کامل ایک صدی تک انگریز کے باطل اقتدار کے خلاف میدان جہاد گرم رکھا۔

؎ بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

## انگریزوں کے خلاف جہاد

جس وقت انگریز کمپنی ہندوستان میں اپنی حکومت کی توسیع میں مشغول تھی اور مسلمانوں کے خلاف پے درپے معاندانہ اقدامات کر رہی تھی۔ اس وقت مسلمانوں کی دینی قیادت نہایت بیدار مغز علماء کے گروہ کے ہاتھ میں تھی۔ انہیں دینی تقاضوں اور اپنی ذمہ داریوں کا پورا احساس تھا۔ ملی حالات پر ان کی نظر تھی۔ انگریزوں نے سب سے پہلے ۱۷۵۷ء میں بنگال میں اپنی حکومت قائم کی۔ اور پھر وہ اپنی حکومت بڑھاتے ہی چلے گئے۔ شریعت اسلامی کے نقطہ نظر سے جب کفار دارالاسلام پر غلبہ حاصل کر لیں احکام شریعت اور شعائر اسلامی کو معطل کر دیں تو وہاں کے مسلمانوں

---

؎ شاہ ولی اللہ دہلوی اور ان کی سیاسی تحریک۔ از مولانا عبیداللہ سندھی۔ ص ۲۱۔ سندھ ساگر اکادمی۔ لاہور۔ ۱۹۵۲ء

پر جہاد فرض ہو جاتا ہے۔ مسلمانوں پر فرض عائد ہو جاتا ہے کہ وہ بزور شمشیر دشمن اسلام حکومت کو ختم کریں۔ تمام مسلمان پوری قوت کے ساتھ دشمن کے خلاف جہاد کریں۔ اسلامی حکومت اور اسلامی نظام حیات کو پھر بحال کریں۔ اس حکم کی پیروی میں سب سے اول بنگال کے مسلمانوں نے انگریزوں کے خلاف جہاد کا علم بلند کیا۔

## (۱) مجنون شاہ مستانہ (۱۷۸۶ء-۱۷۶۱ء)

حاکمانہ تصرف تو بہت پہلے سے انگریز اپنے علاقہ میں رکھتے تھے اور رعایا ان کے ظلم وستم سے نالاں تھی۔ پلاسی کی جنگ میں فتح پا کر ۱۷۵۷ء میں انھوں نے باقاعدہ اقتدار سنبھال لیا۔ یہ مسلمانوں کے لیے نئی صورت حال تھی۔ مداریہ فقیروں کا ایک گروہ قدیم سے بنگال میں آمد ورفت رکھتا تھا۔ ان کا رہنما مجنون شاہ مستانہ تھا۔ وہ اصل باشندہ تو میوات نواح دہلی کا تھا مگر بنگال میں اس کی آمد ورفت تھی۔ سب سے پہلے اس فقیر بے نوا کی غیرت کو جوش آیا۔ اپنے مداریہ فقراء کے ایک گروہ کیساتھ ۱۷۶۱ء میں اس نے انگریزوں کے خلاف جہاد شروع کر دیا۔ مستان گڑھ ان فقیروں کا مرکزی مقام تھا۔ ان کا طریقہ کار جنگ چھاپا مار (گوریلا) کا تھا۔ یہ انگریزوں کی کوٹھیوں اور نو دولتیے ہندو ٹھیکیداروں کے خلاف حملے کرتے تھے۔ لوٹ مار، قتل وغارت گری سے ان فقراء کا دامن پاک تھا۔ اگرچہ انگریزی حکومت کے ابتدائی ایام میں ملک میں حد درجہ بدامنی، لوٹ مار اور فساد برپا تھا۔ ڈاکو اور لٹیرے گروہ در گروہ ملک میں گھومتے پھرتے تھے۔ ان لٹیروں کے خلاف عوام الناس ان مداری فقراء سے دادرسی طلب کرتے تھے۔ ۱۷۸۶ء تک تو مجنون شاہ جنگ کی قیادت کرتا رہا۔ مارچ ۱۷۸۷ء میں اس کا مکن پور (نزد کانپور) کی خانقاہ مداریہ میں انتقال ہو گیا۔ اس کی لاش کو میوات لے جا کر دفن کیا گیا۔ اس کے مرنے کے بعد بھی جہاد کا سلسلہ جاری رہا۔ اس کے خلفاء موسیٰ شاہ، چراغ شاہ، سبحانی شاہ محراب شاہ وغیرہ نے یکے بعد دیگرے جہاد کی قیادت سنبھالی۔ اٹھارہویں صدی کے اختتام تک کسی نہ کسی صورت میں یہ فقراء مجاہد

برسرِ پیکار رہے ہے۔[1]

## (۲) فرائضی تحریک (۱۸۰۲ - ۱۸۶۰ء)

بنگال میں سب سے اہم فرائضی تحریک تھی۔ اس کے بانی حاجی شریعت اللہ تھے۔ یہ فریدپور میں ۱۷۸۴ء میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ جوانی میں عرب چلے گئے تھے۔ وہاں کے علماء سے دینی تعلیم و تربیت حاصل کی۔ اس زمانہ میں وہاں مشہور مصلح محمد بن عبدالوہاب کی اصلاحی تحریک جاری تھی۔ وہ اس سے متاثر ہوئے۔ ایک مدت کے بعد وہ وطن لوٹ کر آئے۔ یہاں ملک کے سیاہ و سفید کا مالک انگریز بن چکا تھا۔ اور استمراری بندوبست کے طفیل ملک کی ساری زمینات پر ہندو بنیے قابض ہو چکے تھے۔ وہ مسلمان مزارعوں پر بے اندازہ مظالم کرتے تھے۔ حتیٰ کہ ان سے ڈاڑھی ٹیکس بھی وصول کرتے تھے۔

دوسری طرف انھوں نے دیکھا کہ عام مسلمانوں میں دین کی جانب سے غفلت اور بے عملی بہت بڑھی ہوئی ہے۔ حاجی شریعت اللہ ایک عملی انسان تھے۔ انھوں نے اصلاحِ حال کا پختہ ارادہ کر لیا۔ دینی اصلاح کے لیے ان کا کم سے کم مطالبہ یہ تھا کہ ہر مسلمان فرائض کی پابندی کرے اور کبائر سے اجتناب کرے۔ اسی وجہ سے ان کی تحریک کا نام عوام الناس میں فرائضی تحریک پڑ گیا۔ وہ لوگوں کو روزہ اور نماز کا پابند بناتے تھے۔ وہ زکوٰۃ اور عُشر وصول کر کے غرباء اور مساکین میں تقسیم کرتے تھے۔ انھوں نے الارض للہ کا نعرہ بھی لگایا تھا۔ وہ زمین کی انفرادی ملکیت کے قائل نہیں تھے۔ اس تحریک کا یہ بڑا انقلابی قدم تھا جو نہ ان سے پہلے نہ ان کے بعد کسی تحریک نے

---

[1] ثقہ مورخ طباطبائی نے اس حقیر گروہ کو اس قابل نہیں سمجھا کہ ان کا ذکر کرتا۔ البتہ ان کے دشمن انگریزوں کی رپورٹوں میں ان کا ذکر ملتا ہے۔

مجنون شاہ مستانہ کے حالات کے لیے دیکھو راقم کا مضمون۔ روزنامہ جسارت۔ کراچی۔ مورخہ ۱۰ فروری ۱۹۸۲ء۔ نیز

Faraizi movement in Bangal by Moinuddin Ahmad Khan Dacca

Orintal biografies

اختیار کیا۔

وہ عوام الناس کی دادرسی بھی کرتے تھے۔ ان کو مظالم سے بچاتے تھے۔ ہندوستان کے دارالحرب ہونے کا انھوں نے باقاعدہ فتویٰ صادر کیا تھا۔ اور پھر اس فتویٰ کے تقاضے کے طور پر انھوں نے نماز جمعہ ترک کردی تھی۔ ان کے بعد مشہور عالم دین مولانا وجیہہ الدین بہاری صدر مدرس مدرسہ عالیہ کلکتہ (۱۸۵۶ - ۱۸۳۷ء) نے بھی ہندوستان کے دارالحرب ہونے کا فتویٰ دیا تھا۔ اُنھوں نے بھی جمعہ کی نماز پڑھنا ترک کردی تھی[۱]۔ باوجود اس کے کہ وہ سرکاری مدرسہ میں اُستاد تھے۔

فرائضی تحریک کے پیروکاروں کی اکثریت مزارعین پر مشتمل تھی ہندو ٹھیکیدار زمینداران پر مظالم کے پہاڑ توڑتے تھے۔ ان زمینداروں کی پشت پناہی انگریزی حکومت کرتی تھی مزارعین حاجی شریعت اللہ کے پاس دادخواہی کے لیے آتے تھے۔ اس طرح حاجی شریعت اللہ کو انگریزی حکومت کے خلاف میدان میں اترنا پڑا۔ ۱۸۰۲ - ۱۸۴۰ تک مجاہدین کی قیادت حاجی شریعت اللہ کرتے رہے۔ ان کا انتقال ہوجانے کے بعد ان کے بیٹے محمد محسن عرف دودو میاں نے قیادت سنبھالی اور جہاد کو جاری رکھا۔ ان کے ایک خلیفہ نیطو میاں نے ان ظالم زمینداروں کا ناطقہ بند کردیا۔ انگریزی فوجوں سے بھی وقتاً فوقتاً معرکے ہوتے رہے۔ ۱۸۴۰ء تک دودو میاں یہ تحریک چلاتے رہے۔ اس کے بعد حکومت نے دودو میاں کو گرفتار کرلیا اور مختلف مقدمات میں پھانس لیا۔ اور سزا دے دی۔ ۱۸۶۰ء میں اس تحریک نے بالکل دم توڑ دیا۔ انگریزی فوجوں سے زیادہ مولوی کرامت علی جونپوری کی مخالفت اور مناظرہ بازی نے اس تحریک کو سخت نقصان پہنچایا۔ ان پر عوام کا اعتماد مجروح ہوگیا۔ تاہم اس امر سے انکار ممکن نہیں ہے۔ کہ اس تحریک کے اثرات

---

[۱] تاریخ مدرسہ عالیہ کلکتہ۔ از مولوی عبدالستار خان ص - ۱۶۷ -

Faqir movement in Bengal by Moinuddin Ahmad Khan Dacca

بنگال کے مسلمانوں کی زندگیوں پر بہت گہرے پڑے ہیں۔

## (۳) تحریکِ مجاہدین (۱۸۲۶-۱۸۳۵ء)

۱۲۱۸ھ/۱۸۰۳ء میں انگریزوں نے مغلوں کا دارالسلطنت دہلی فتح کر لیا۔ مغل شہنشاہ کمپنی کی حکومت کا وظیفہ خوار بن گیا۔ تخت و تاج کے ظاہری آداب انگریز شاطر نے برقرار رکھے۔ اگرچہ اقتدار اعلیٰ انگریز ریذیڈنٹ دہلی کے ہاتھ میں تھا۔ سرکاری اعلان اس طرح کیا جاتا تھا۔

"ملک بادشاہ سلامت کا اور حکم کمپنی بہادر کا"

انگریز کے ان پُرفریب اقدامات کے باوجود اس وقت کے سب سے بڑے عالم شاہ ولی اللہ کے فرزند شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے اصل حقیقت کو پا لیا کہ اقتدار اعلیٰ مغل شاہنشاہ شاہ عالم کے ہاتھ میں نہیں ہے بلکہ جنرل آکٹرلونی کے ہاتھ میں ہے۔ اس لیے انھوں نے ہندوستان کے دارالحرب ہونے کا فتویٰ دے دیا[1]

یہ ایک انتہائی اہم اور معنی خیز فتویٰ تھا۔ جو ملک کے مقتدر عالم نے دیا تھا۔ اب مسلمانوں کے سامنے دو ہی راستے رہ گئے تھے۔ یا تو وہ انگریزوں کے خلاف جہاد بالسیف کریں۔ یا پھر ملک سے ہجرت کر جائیں۔ یہ دونوں راستے انتہائی خطرات کے حامل تھے۔ مگر خانوادہ ولی اللّٰہی نے ملک کے دینی طبقہ کو نیا شعور اور پختہ ایمان دیا تھا وہ ان تمام خطرات کو انگیز کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔

سید احمد شہید (۱۲۰۱-۱۲۴۶ھ/۱۷۸۶-۱۸۳۱ء) شاگرد شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (۱۸۲۴ء)

---

[1] فتاویٰ عزیزیہ۔ جلد اول۔ ص ۱۷۔ مطبع مجتبائی۔ دہلی۔ سن ۱۹۰۴ء

نوٹ۔ اس فتویٰ کے بعد بہار میں "امارت شرعیہ" کا ادارہ قائم ہوا جو بہر حال اب تک قائم ہے۔ رسالہ امارت شرعیہ۔ از مولانا عبدالصمد رحمانی۔ ناظم امارت شرعیہ بہار پھلواری شریف۔ پٹنہ۔

اور شاہ محمد اسماعیل شہید برادر زادہ شاہ عبد العزیز محدث دہلوی نے جہاد کا مشکل ترین راستہ اختیار کیا۔ اس کے لیے پہلے انھوں نے عوام الناس کو تیار کیا۔ ان کی ذہنی، فکری اور دینی اصلاح کی۔ ان کوششوں کے باعث ہزارہا افراد کی زندگیوں میں انقلاب عظیم برپا ہو گیا۔ مجرمانہ اور فاسقانہ طور اطوار رکھنے والے افراد متقی پرہیزگار بن گئے۔ لوگوں کو دین کے رستے میں جہاد کرنے پر ابھارا گیا۔ اور وہ جان و مال کی قربانی دینے پر آمادہ ہو گئے۔

سابقہ دو جہادوں کی ناکامی سے سید احمد شہید نے یہ سبق اخذ کیا کہ بہر قیمت مجاہدین کی پشت محفوظ ہونا چاہیے تاکہ پیچھے سے ان پر حملہ نہ ہو سکے۔ اس وقت سارے ہندوستان پر انگریزی حکومت قائم ہو چکی تھی۔ اور پنجاب میں سکھ حکمران تھے۔ ان کے مظالم بڑے بے پناہ اور وحشت ناک تھے۔ اس لیے سید احمد شہید نے صوبہ سرحد سے جہاد کا آغاز کرنے کا ارادہ طے کیا۔ اس صورت میں اوّل مقابلہ سکھوں سے، ہونا تھا۔

۱۲۴۱ھ/۱۸۲۸ء میں رائے بریلی یوپی سے مجاہدین کا قافلہ روانہ ہوا۔ جو دھپور، میرپور خاص، حیدر آباد، پیر گوٹھ، درہ بولان، قندھار، کابل اور درہ خیبر سے پشاور پہنچا۔ نوشہرہ خٹک سے جنگ کا آغاز ہوا۔ ایک چھوٹے سے علاقے پر مجاہدین نے حکومت قائم کر لی جہاں انھوں نے شرعی قوانین نافذ کر دیے۔ مقامی ارباب کی رنجشوں اور عداوتوں اور رنجیت سنگھ کے فرانسیسی جرنیلوں کی کوششوں سے مجاہدین کو بالاکوٹ ہزارہ میں ۱۸۳۱ء/۱۲۴۶ھ میں شکست ہوئی۔ سید احمد اور شاہ اسمٰعیل شہید ہو گئے۔ بظاہر یہ جہاد ناکام ہو گیا۔ مگر جو عظیم الشان ذہنی اور فکری انقلاب برپا ہو چکا تھا وہ خاموش ہونے والا نہیں تھا۔ سید احمد شہید کے خلیفہ سید نصیر الدین دہلوی داماد شاہ اسحاق دہلوی نے ۱۲۵۱ھ/۱۸۳۵ء میں دوبارہ جہاد جاری کیا دہلی سے اپنا لشکر لے کر وہ خیر پور پہنچے۔ ڈیرہ غازی خاں میں مزاری بلوچیوں کی حمایت میں سکھوں سے نبرد آزما ہوئے۔ پھر غزنی جا کر انگریزی فوجوں کے خلاف جنگ لڑی (۱۸۳۹ء) بالآخر ستھانہ کیمپ سوات میں جا کر ۱۸۴۰ء میں ان

نتقال ہوگیا۔

## (۵) جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء

یہ عوامی جدّ وجہد آزادی تھی۔ عام لوگ انگریزی حکومت کے مظالم سے تنگ آکر میدان میں نکل آئے تھے۔ بنگال سے لے کر سرحار تک عوامی جہاد کی تحریک اُٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ فوج کے سپاہی انگریزوں کے خلاف جنگ لڑ رہے تھے عوام، فوج، راجے اور نوابان سب لوگ س جنگ میں شریک تھے۔ دراصل یہ سب لوگ زخم خوردہ تھے۔ جو اپنے حقوق کے لیے لڑ رہے تھے۔ البتہ ایک گروہ مخلصین کا تھا جو نظریاتی نقطہ نظر سے اس جنگ میں شریک تھے۔ ان میں نمایاں علماء کرام حسب ذیل تھے۔

مولانا احمد اللہ مدراسی، مولانا سرفراز علی گورکھپوری، مولانا لیاقت علی الہ آبادی، شاہ عبدالغنی مجددی (دہلی) شاہ حسن عسکری، شاہ ابوسعید مجددی، مولانا فرادالدین، مولانا عبدالقادر (لدھیانہ) مولانا محمد، مولانا عبدالعزیز، حاجی امداد اللہ، مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی (تھانہ بھون تھانہ کیرانہ) مولانا منظہر نانوتوی، مولانا رحمت اللہ کیرانوی، مولانا محمد منیر (نجیب آباد) شاہ بولن (سیوہارہ) شاہ محمد عاشق، مولانا کفایت علی (امراد آباد) مولانا منور، مولانا گلزار علی، مفتی عنایت احمد (بریلی) مولانا محمد اسمٰعیل حکیم مولانا سعید اللہ، مولانا فیض احمد (بدایوں) مولانا محمد نظام (شاہجہان پور) وغیرہ

ان جنگ آزما لوگوں میں نظم وضبط کا فقدان تھا۔ نہ باہم ربط تھا نہ کوئی مشترکہ قیادت تھی۔ برعکس راجوں اور نوابوں کی بڑی تعداد ابھی بھی انگریزوں کی حمایت کر رہی تھی۔ اس لیے اس کا ام ہونا غیر متوقع نہیں تھا۔ اس جنگ کے لیے انگریزوں نے مسلمانوں کو ذمہ دار قرار دیا اور پھر ان سے انتہائی سخت انتقام لیا۔ جنگ کے بعد چن چن کر علماء اور شرفاء کو پھانسی پر چڑھا دیا۔

دہلی پر قبضہ کر لینے کے بعد انگریزی فوجوں نے سارے شہریوں کو نکال باہر کیا۔ سات دن

تمام شہر کو خوب لوٹا۔ خزانہ کے لالچ میں مسلمانوں کے تہ خانے کھود ڈالے۔ تین ہفتہ بعد ہندوؤں کو تو شہر میں واپس آنے کی اجازت مل گئی۔ مگر مسلمانوں کو یہ اجازت تقریباً تین سال بعد ملی۔ ان کی ساری جائدادیں ضبط کر لی گئیں۔ لال قلعہ اور جامع مسجد دہلی کے درمیان مسلمانوں کی گنجان آبادی تھی۔ امراء اور نوابین کی حویلیاں تھیں۔ ایک کونے پر اکبرآبادی مسجد تھی جس کے حجرے میں شاہ عبدالقادر نے ۴۰ سال بسر کیے تھے۔ جس میں مجاہد کبیر سید احمد شہید نے بیعت کی تھی۔ انگریزوں نے اس سارے علاقے کو مسمار کرا دیا۔ گدھے چلوا دیئے۔ چٹیل میدان بنا دیا۔ بعد میں وہاں اردو پارک اور ایڈورڈ پارک بنا دیئے گئے۔ غدر کا آغاز تو ہندوؤں نے کیا تھا۔ مگر انگریز نے انتقام مسلمانوں سے لیا۔ مارشل لاء نے سول اور فوجی افسروں کو اختیار دے دیا تھا کہ وہ مجرموں کو سزا دیں۔ اور پھانسی پر چڑھا دیں۔ پھانسی کے بعد عموماً لاش کو جلا دیا جاتا تھا۔ بعض مقامات پر گاؤں کے گاؤں جلا دیئے گئے۔

"یہ بات ریکارڈ پر موجود ہے کہ تین مہینوں تک ۸ مردہ گاڑیاں طلوع آفتاب سے غروب آفتاب تک گھومتی رہتی تھیں۔ وہ لاشوں کو درختوں سے اتارتی تھیں اور بازوؤں سے اتارتی تھیں۔ ۲ ہزار کے قریب افراد کو اس طرح اٹھایا گیا۔"

غالب جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے مظالم کے عینی شاہد تھے۔ وہ کہتے ہیں ؎

گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے ۔۔۔ زہرہ ہوتا ہے آب انسان کا
چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے ۔۔۔ گھر بنا ہے نمونہ زندان کا
شہر دہلی کا ذرہ ذرہ خاک ۔۔۔ تشنہ خوں ہے ہر مسلمان کا

بادشاہ ظفر کہتا ہے ؏

؎ جسے دیکھا حاکم وقت نے کہا یہ بھی قابلِ دار ہے

سات ہزار علماء اور معزز مسلمانوں کو انگریزوں نے پھانسی پر چڑھا دیا[1] بقول سر سید "غدر کیا ہوا۔ ہندوؤں نے شروع کیا۔ مسلمان دل جلے تھے وہ بیچ میں کود پڑے۔ ہندو گنگا نہا کر جیسے تھے ویسے ہو گئے۔ مگر مسلمانوں کے تمام خاندان تباہ و برباد ہو گئے"[2]

جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کی ایک اہم خصوصیت قابلِ ذکر ہے۔ اس جنگ میں ہندو اور مسلمان باہم متفق تھے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ تفرقہ سازی کی انگریزی سیاست کاری کا منحوس سایہ ابھی تک ہندوستان میں بسنے والی مختلف اقوام پر نہیں پڑا تھا۔

## ہجرت حجاز

جہاد بالاکوٹ (۱۸۳۱ء) اور جنگ آزادی (۱۸۵۷ء) کی ناکامی اور پھر انگریزوں کے انتہائی وحشت ناک انتقام نے بہت سے لوگوں کی کمر ہمت توڑ دی۔ وہ پست حوصلہ اور کم ہمت ہو گئے جہاد کی ناکامی کے بعد بہت سے علماء نے ہجرت کا طریقہ کار اختیار کیا۔ وہ حجاز مقدس عرب میں ہجرت کر کے چلے گئے۔ ان میں سے بعض سر کردہ علماء تھے۔ شاہ محمد اسحاق دہلوی (۱۲۶۲ھ) شاہ محمد یعقوب دہلوی (۱۲۸۲ھ) یہ دونوں بزرگ شاہ عبد العزیز محدث دہلوی کے نواسے تھے۔ مولانا قطب الدین دہلوی (۱۲۸۹ھ) مولانا شاہ عبد الغنی مجددی، شاہ احمد سعید مجددی (۱۲۷۷ھ) حاجی امداد اللہ مہاجر مکی (۱۲۷۷ھ) اخوند شیر محمد دہلوی شاگرد شاہ محمد اسحاق دہلوی نے بحالت بیماری ہجرت اختیار کی۔ ابھی راستہ میں ملتان ہی پہنچے تھے کہ ان کا انتقال ہو گیا۔ یہ سب لوگ ولی اللہی خاندان کے متوسلین تھے۔ ان کے علاوہ مولوی رحمت اللہ کیرانوی (۱۳۰۹ھ) اور ڈاکٹر وزیر خان بہاری (۱۲۹۰) نے بھی حجاز میں ہجرت کی۔ البتہ میاں جی نذیر حسین دہلوی (۱۳۲۰ھ) اور شیخ محمد تھانوی نے ہجرت پر جانا پسند نہیں کیا۔

---

[1] قیصر التواریخ۔ از کمال الدین حیدر رضوی۔ نول کشور پریس۔ لکھنؤ۔ ۱۹۰۷ء

[2] حیات جاوید۔ از خواجہ الطاف حسین حالی۔ ص ۲۸۱

شاہ ولی اللہ دہلوی (۱۷۶۲ء) کے زمانہ سے ہندوستان کے مسلمانوں کی دینی قیادت ولی اللٰہی خاندان — اولاد اور شاگردوں — کے ہاتھوں میں تھی۔ کامل ایک صدی تک یہ لوگ سرگرم عمل رہے۔ ان بزرگ و برتر علماء کے ہجرت کر جانے سے دینی قیادت میں عظیم رخنہ اور خلا پیدا ہو گیا۔

پہلا بڑا نقصان تو یہ ہوا کہ وہ مجاہدین اور مصلحین جو باوجود ناکامیوں کے ابھی تک جہاد میں سرگرم تھے، ان کی ہمتیں ٹوٹ گئیں۔ وہ حوصلہ ہار بیٹھے۔ مایوس ہو کر وہ خانہ نشین ہو گئے۔ دوسرا بڑا نقصان یہ ہوا کہ میدان خالی ہو گیا۔ انگریز نے اس موقعہ سے فائدہ اٹھایا۔ اپنی پسند کے افراد کو آگے بڑھایا۔ ان کو مسلمانوں کی قیادت پر مسلط کر دیا۔ اس طرح اس کے دل کی مراد بر آئی۔

## آخری جہاد

سید احمد شہید کے خلفاء میں سے مولانا عنایت علی اور مولانا ولایت علی صادق پوری عظیم آبادی نے سلسلہ جہاد کو زندہ رکھا۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے امیر عبداللہ عظیم آبادی نے ستھانہ سوات کے مرکز مجاہدین سے انگریزوں کے خلاف پھر جہاد شروع کر دیا۔ امبیلہ کی جنگ (۱۸۶۲ء) میں انھوں نے جنرل چیمبرلین کو شکست دی۔ چار سال تک — ۱۸۶۴ء — ۶۸ — وہ انگریزوں کے خلاف نبرد آزما رہے۔ افراد اور رقومات کی امداد ان کو حسب سابق بنگال سے پہنچتی رہی۔

انگریزوں کو جب ان باتوں کی اطلاع ملی تو انھوں نے ان لوگوں کے خلاف مقدمات قائم کر دیے جو کسی طرح کی امداد کرتے تھے۔ یہ مقدمات بڑے پیمانہ پر قائم ہوئے۔ مقدمہ انبالہ ۱۸۶۴ء، مقدمہ مالدہ (۱۸۶۸ء)، مقدمہ راج محل ۱۸۷۰ء، مقدمہ عظیم آباد ۱۸۷۲ء۔ ان مقدمات میں کثیر لوگوں کو سخت ترین سزائیں دیں۔ ان کو جزیرہ انڈمان میں کالے پانی کی سزا دی۔ اس دار و گیر سے سرد پڑ گیا۔ اگرچہ ستھانہ سوات کا مجاہدین کا کیمپ پھر بھی برقرار رہا۔ پاکستان بن جانے کے بعد مجاہدین کے آخری امیر مولانا فضل الٰہی نے ۱۹۴۸ء میں راولپنڈی میں ترک جہاد کا اعلان

گویا شکست بالاکوٹ ۱۸۳۱ء کے بعد بھی ایک صدی تک اپنے مقصد میں لگے رہنا فی الواقعہ مجاہدین کی عظیم الشان کامیابی ہے۔

## کالا پانی کی سزائیں

انگریزی حکومت نے سیاسی مجرموں اور خطرناک شخصیتوں کے لیے ایک نئے قسم کی سزا اور نئے طرز کا قید خانہ تجویز کیا۔ یہ قید خانہ خلیج بنگال میں جزائر انڈمان عرف کالے پانی کے نام سے مشہور ہے۔ یہاں کی آب و ہوا صد درجہ خراب، مضر اور رہائش کے لیے ناسازگار ہے۔ جراثیم اور کیڑوں کے علاوہ جاتے ہی قیدی مختلف اقسام کے امراض میں مبتلا ہو جاتے تھے۔ حکومت بعض مخصوص قسم کے قیدیوں کو یہاں ان جزیروں میں لاکر چھوڑ دیتی تھی۔ ان کی رانوں اور گردنوں پر گرم لوہے سے داغ لگا دیے جاتے تھے۔ رعایات اور سہولتوں کے اعتبار سے کالے اور گوروں کے ساتھ یہاں بھی تفریق برتی جاتی تھی۔ سب سے پہلے جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے ہزاروں افراد کو انڈمان بھیجا گیا تھا۔ اس کو حبس دوام بعبور دریائے شور عرف کالا پانی کہا جاتا تھا۔ مولانا جعفر تھانیسری "کالا پانی" میں لکھتے ہیں:

> "غدر ۱۸۵۷ء کی بدولت بلیلیوں راجے اور نواب اور زمیندار، مولوی، مفتی، قاضی، ڈپٹی کلکٹر، منصف، صدر امین، صدر الصدور، ... الدار، صوبیدار، جمعدار وغیرہ وہاں قیدی ہیں۔ وہ معزز ہندوستانی جنٹلمین کہ جن کے آگے سینکڑوں ہزاروں نوکر تھے بوجہ سیاہ پوست اور جنم ہند کے دوسرے چوڑے چماروں کی طرح موٹا جھوٹا کھاتے پکاتے اور عام لوگوں کے ساتھ سخت مشقت کرتے۔"

ان میں مولانا فضل حق خیر آبادی تھے جن کا وہیں انتقال ہو گیا۔ ان میں نواب محمد خان تھے جو نواب امجد علی شاہ اودھ کی بیگم حضرت محل والدہ شاہزادہ برجیس قدر کے وزیر تھے۔ وہ ۱۸۶۶ء تک

انڈمان میں رہتے تھے سراوک کے سفید راجہ (انگریز) نے ان کو اپنے یہاں بلا لیا تھا۔ وہاں ان سے دفتری کام لیا جاتا تھا۔ یہ وہیں ان کا انتقال ہو گیا۔ مولوی محمد جعفر تھانیسری لکھتے ہیں۔ ۱۸۶۱ء میں غدر کے ایک ہزار قیدیوں کو رہائی ملی تھی۔

## حکومت کی داروگیر

حکومت نے نام نہاد وہابی مقدمات قائم کیے جا سینکڑوں افراد کی داروگیر کی جاتی تھی تفتیش کے ہلاکت خیز مرحلہ سے گزرنا پڑتا تھا تفتیش کیا تھی اس کا اندازہ مولوی جعفر کے بیان سے ہوتا ہے وہ لکھتے ہیں۔

"صبح آٹھ بجے سے رات کے آٹھ بجے تک بارہ گھنٹے زدوکوب (مارپیٹ) جاری رہتی۔ افطار کا وقت آیا تو ہم نے بنگلے کے درخت سے پتے توڑ کر روزہ کھولا۔"
(کالا پانی)

بہرکیف مختلف مقدمات قائم کیے گئے اور مختلف لوگوں کو سزائیں دی گئیں۔

مقدمہ انبالہ ۱۸۶۴ء۔ (۱) مولانا احمد اللہ عظیم آبادی (۱۸۰۸ء – ۱۸۸۱ء) پہلے ان کے لیے پھانسی کا حکم ہوا۔ پھر ضبطی جائداد و حبس دوام بعبور دریائے شور۔ مولانا کو مشقت کے لیے ایک بہت بڑے چرس سے پانی کھینچنا ہوتا تھا جس کی وجہ سے پیشاب میں خون آنے لگا تھا ان کا وہیں انتقال ہو گیا تھا۔

(۲) مولوی محمد جعفر تھانیسری۔ پیدائش (۱۸۳۷ء) ۱۸۶۶ء میں انڈمان میں بھیجے گئے۔ ۱۸۸۳ء میں وہاں سے رہائی پائی۔ ۱۹۰۵ء میں انتقال کیا۔ اپنے حالات پر کتاب "کالا پانی" لکھی۔

(۳) شیخ شفیع محمد جو چھاؤنیوں میں فوجوں کو گوشت فراہم کرتا تھا اس

---

۱؎ سراوک کا نیا نام ریاست برونائی ہے۔

کی پچاس لاکھ کی جائداد بھی ضبط کر لی گئی۔

(۴) مولانا یحییٰ علی جعفری عظیم آبادی۔ فروری ۱۸۶۸ء میں وہیں فوت ہو گئے۔

(۵) مولانا عبدالرحیم۔ یہ مولانا ولایت علی کے بھتیجے تھے۔ ۱۹ سال بعد ۱۸۸۳ء میں رہا ہوئے۔

یہ سب لوگ ۱۵ رجون ۱۸۶۵ء کو انڈمان میں لائے گئے تھے۔

مقدمہ مالدہ ۱۸۶۸ء۔ (۶) مولوی امیرالدین ساکن پینہ بنگال۔ ۱۸۷۰ء میں فوت ہو گئے۔

مقدمہ راج محل ۱۸۷۰ء (۷) ابراہیم منڈل ساکن اسلام پور راج محل۔

مقدمہ عظیم آباد ۱۸۷۲ء۔ (۸) امیر خان خانزادہ (میوانی)۔ مگر بوجہ کبیرالسن ہونے کے ہندستان میں رکھا۔ ۱۸۷۸ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔

****

---

ء سرگزشت مجاہدین از مولانا غلام رسول مہر ص ۴۱۸

## چھٹا باب

# مُسلمانوں کے متعلق حکومت کی پالیسی میں تبدیلی

## نئی پالیسی کی ضرورت کا احساس

جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد جس انداز میں انگریزی حکومت نے مسلمانوں کے خلاف تشدد، غارت گری اور انتقامی کارروائی کی تھی، اس کے بعد اس نے یاور کر لیا تھا کہ اب مُسلمانوں کو پوری طرح کچل دیا گیا ہے۔ اب ان کے اندر دم خم باقی نہیں ہے مگر ان کی توقع کے برعکس مولانا عبداللہ عظیم آبادی نے کاروبارِ جہاد پھر زندہ کر دیا (۶۴-۱۸۶۲ء) اور امبیلہ کے معرکہ میں انگریزوں کی منظم فوجوں کے چھکے چھڑا دیے یہ بات ان کے لیے بڑی حیران کن تھی۔ اس کے بعد حکومت نے مجاہدوں کے حامیوں اور ہمدردوں کیخلاف بڑے پیمانہ پر گرفت شروع کی اور ان کو سزائیں دے کر کالے پانی بھیج دیا۔ بظاہر تو انھوں نے اس طرح شورش کو رفع کر دیا لیکن حکومت کو تشویش لاحق رہی کہ مُسلمانوں کے مذہبی جوش و خروش کو آخر کس طرح ٹھنڈا کیا جائے؟[1]

برطانوی پارلیمنٹ نے اس مسئلہ کی سنگینی کے پیشِ نظر ایک کمیشن جائزہ لینے اور حل پیش کرنے کے لیے ہندوستان بھیجا۔ کمیشن نے بڑے غور و خوض کے بعد یہ حل تجویز کیا کہ اب تک حکومت

---

[1] انتقامی کارروائی سے لوگوں کے غیظ و غضب میں مزید اضافہ ہوتا تھا۔ عبداللہ پنجابی نے جسٹس نارمن کو احاطہ عدالت کے اندر ۲۰ ستمبر ۱۸۷۱ء کو قتل کر دیا۔ شیر علی سرحدی نے وائسرائے ہند لارڈ میو کو انڈمان کی سیر کرتے وقت ۸ فروری ۱۸۷۲ء کو قتل کر دیا۔

مسلمانوں کے ساتھ سختی اور حقارت کا برتاؤ کرتی رہی ہے۔ مگر نتیجہ خاطر خواہ نہیں نکلا۔ اب ان کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرنا چاہیے۔ شاید حالات بہتر ہو جائیں۔ مزید یہ کہ ان کو داخلی تنشا میں مبتلا کر دیا جائے۔ تاکہ آئندہ یہ کوئی متحدہ اقدام نہ کر سکیں[1]

انھی خطوط پر بعض دوسرے لوگوں نے بھی سوچنا شروع کر دیا۔ انڈین سول سروس کے ایک کہنہ افسر ولیم ہنٹر نے کمپنی کی حکومت... کے آغاز سے مسلمانوں کے مسئلہ کا جائزہ لیا۔ اس نے ایک کتاب Our Indian Musalman W. Hunter لکھی ہے۔ جو اس موضوع پر مشہور کتاب ہے۔ اس نے مسلمانوں کے ساتھ کی گئی بعض زیادتیوں اور ناانصافیوں کا اقرار کیا۔ اور یہ کہا کہ مسلمان اپنے مذہب کی رُو سے مجبور ہیں کہ وہ جہاد کریں۔ وہ حکومت انگریز کے وفادار نہیں رہ سکتے ہیں۔ البتہ اس نے مسلمانوں کے ساتھ نرم پالیسی اختیار کرنے کا مشورہ دیا۔ سر سید احمد خان نے ہنٹر کے نتائج سے شدید اختلاف کیا۔ "ہنٹر پر ہنٹر" مضمون لکھ کر انھوں نے اس کی تردید کی۔ ایک دوسرے مستشرق نساؤ ... نے بھی اسی موضوع پر ایک کتاب Indian Musalman لکھی تھی۔

ہنٹر نے اپنی کتاب لارڈ میو وائسرائے ہندوستان کی خدمت میں پیش کی۔ اس نے کتاب کے عمومی مشوروں سے اتفاق کیا۔ سختی اور کچل دینے کی جو پالیسی آغاز سے انگریزی حکومت نے اختیار کر رکھی تھی، اس نے اس کو تبدیل کر دیا اس نے ۱۸۶۹ء سے مسلمانوں کے متعلق نرم پالیسی کا آغاز کیا۔ اس کے بعد سے انگریزی حکومت کا رویہ مسلمانوں کے متعلق کافی تبدیل ہو گیا۔

---

[1] اس کمیشن کا تذکرہ عبدالرشید ارشد نے اپنی کتاب "بیس بڑے علماء" مکتبہ رشیدیہ لاہور ۱۹۷۵ء کے دیباچہ میں کیا ہے ص ۹ The Arrival of the ... in India کا حوالہ دیا ہے۔ مجھے یہ کتاب دستیاب نہ ہو سکی۔ دوسری کسی کتاب میں بھی اس کا حوالہ نہیں ملا۔

## تلافی مافات

اس کے بعد انگریزی حکومت نے مناسب خیال کیا کہ بعض ایسے نمایاں اقدامات کرنے چاہئیں جن سے عام مسلمانوں پر واضح ہو جائے کہ موجودہ حکومت مسلمانوں کی ہمدرد ہے چنانچہ طور پر وہ اشخاص جو ماضی میں ظلم کا نشانہ رہ چکے ہیں ان پر حکومت نے نوازش کی۔ اور تلافی مافات کی کوشش کی۔

**دلداری** جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے مشہور مجاہد رہنما نواب محمود خان بریلوی کی بھاوج نواب قدسیہ بیگم کا وظیفہ ولیم میو لیفٹیننٹ گورنر یوپی نے مقرر کر دیا (۱۸۶۹)۔ ان کے بھتیجوں کو ریاست بیکانیر میں نائب الریاست بنانے کا وعدہ کیا بشرطیکہ وہ انگریزی زبان سیکھ لیں۔ اس لیے کہ محترمہ کے شوہر کو پھانسی کی سزا ملی تھی اور تمام جائداد ضبط کر لی گئی تھی[1]

**رہائی** سلطان ٹیپو شہید کی اولاد ۱۷۹۹ء سے کلکتہ میں نظر بند کی حیثیت سے زندگی گزار رہی تھی۔ حکومت نے اب ان پر سے بندش اٹھالی۔ ۲۷ فروری ۱۸۷۰ء کو لارڈ میو نے شہزادے غلام محمد کو سر کے خطاب سے نوازا۔ اگلے سال ۱۸۷۱ء میں ۸۷ سال کی عمر میں شاہزادے کا انتقال ہو گیا۔[2]

**عربی فارسی کی اجازت** لارڈ میو نے ۳۵ سال کی بندش کے بعد اسکولوں اور کالجوں میں عربی فارسی زبانوں کی تعلیم کی کسی قدر اجازت دے دی۔ (۱۸۷۱)

**کمیشن کا قیام** لارڈ میو نے مسلمانوں کی تعلیمی پس ماندگی کے اسباب معلوم کرنے کے سبب

---

[1] علم و عمل۔ وقائع نصیر خان۔ مرتب پروفیسر محمد ایوب قادری ص ۳۰۷۔ کراچی ۱۹۶۱ء

[2] ORIENTAL Biographer سندھ ساگر اکیڈمی لاہور ۱۹۷۵ء عنوان غلام محمد

ایک کمیشن مقرر کیا۔ (۱۸۷۲) اور اس کی بعض سفارشات کو حکومت نے عملی جامہ پہنایا۔

رہائی — ابراہیم منڈل کو لارڈ لٹن نے رہائی بخشی۔ (۱۸۷۹) جو مقدمہ راج محل کے سزا یافتہ تھے۔

رہائی — ۱۱۔فروری ۱۸۸۳ء کو لارڈ رپن نے تمام وہابی قیدیوں کی رہائی کا حکم دیا جو کالے پانی میں سزا کاٹ رہے تھے۔ اس نے کالے پانی کے سزا یافتہ مولوی یحییٰ علی کے فرزند امجد علی کو شمس العلماء کے خطاب سے نوازا۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ کسی مسلمان کو شمس العلماء کا خطاب دیا گیا۔[۱]

انہوں نے خاندانی روش سے ہٹ کر انگریزی پڑھی، ایم اے کیا۔

یہ صادق پور خاندان کے فرد تھے۔

عزت افزائی — ۱۸۵۷ء کے سزا یافتہ مولانا فضل حق خیر آبادی کے فرزند مولانا عبدالحق خیر آبادی کو لارڈ ڈفرن نے شمس العلماء کے خطاب سے نوازا۔ (۱۶۔ فروری ۱۸۸۷ء) ان کے والد کی ضبط شدہ جائداد اور املاک بھی ان کے نام واگزار کر دی مگر غیرت مند بیٹے نے اس کی طرف نگاہ اُٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ کسی دوسرے شخص نے اس پر قبضہ جما لیا۔[۲]

عزت افزائی — میاں جی نذیر حسین وہابی مقدمہ انبالہ ۱۸۶۴ء میں ماخوذ تھے۔ ایک سال تک محبوس رہے تھے۔ ۱۸۹۷ء میں حکومت نے ان کو شمس العلماء کا خطاب عطا کیا۔[۳]

## مساجد واگزار

جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء میں انگریزی حکومت نے بہت سی اہم مساجد

---

[۱] وہابی تحریک۔ از قائم الدین، نفیس اکیڈمی، کراچی۔ ص ۲۸۶

[۲] الثورۃ الہندیہ۔ مرتب عبدالشہید شروانی۔ ص ۱۵۸

[۳] موج کوثر از محمد اکرام ص ۵۰۔

پر قبضہ کر لیا تھا۔ ان کو فوجی بارک بنا دیا تھا۔ اور گورا فوج کے دستے وہاں بٹھا دیے تھے۔ مسلمانوں کا داخلہ وہاں ممنوع تھا۔ مدت تک یہ حالات رہے۔ جب حکومت نے نرمی کی پالیسی اختیار کی تو اس نے ان مساجد کو واگزار کر دیا۔

۱۔ **جامع مسجد دہلی**۔ شاہ جہاں کی بنوائی ہوئی اس حسین و جمیل مسجد پر انگریزی حکومت نے ۱۸۵۷ء میں قبضہ کر لیا تھا۔ اس کو فوجی بارک میں تبدیل کر دیا تھا۔ نماز وہاں ممنوع تھی۔ ۱۸۵۸ء میں کینٹربری کے لاٹ پادری کا حکم نامہ آیا کہ دہلی میں اسقف کا عہدہ قائم کیا جائے۔ انگریزی اخباروں نے شور مچایا کہ دہلی کی جامع مسجد کو گرجا میں تبدیل کر لیا جائے۔ انگریزی اسقف کا مرکز قائم کیا جائے[۱]۔ مگر حکومت وسیع تر مصلحتوں کے پیش نظر اس ارادہ سے باز آ گئی۔ مگر مسلمانوں کی ناراضگی کے باوجود مسجد بدستور فوجی بارک بنی رہی۔ ۱۸۶۲ء میں انگریزی حکومت نے اس مسجد کو نیلام کر دیا۔ سب سے بڑی بولی میرٹھ کی قریشی (قصاب) برادری کے ایک فرد حاجی الٰہی بخش نے لگائی اور پچھتر ہزار روپیہ نقدادا کر کے مسجد کو حکومت سے خریدا اور پھر مسلمانوں کے حوالہ کر دیا۔

۲۔ **مسجد فتحپوری دہلی**۔ یہ مسجد دہلی کے مشہور بازار چاندنی چوک میں واقع ہے اس کو شاہجہاں بادشاہ بیگم فتحپوری محل نے تعمیر کرایا تھا۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں اس کو بھی فوجی بارک بنا لیا گیا تھا مسلمان اس کے خلاف برابر احتجاج کرتے رہے۔ چند سالوں کے بعد صرف مسقف حصہ مسلمانوں کے حوالہ کیا گیا اور صحن مسجد کو نیلام کر دیا گیا۔ اس کو ایک ہندو سیٹھ نے خرید لیا۔ اس نے وہاں دوکانیں بنا دیں اور بازار لگا دیا۔ یہ منظر مسلمانوں کو بڑا شاق گزرتا تھا جب لارڈ لٹن نے ۱۸۷۷ء دہلی میں دربار منعقد کیا۔ اور مسلمانوں کی ہمدردیاں حاصل کرنا ضروری خیال کیا تو اس نے ہندوؤں سے دوکانیں واپس

---

[۱] خطبات گارساں دی تاسی۔ حصہ اول۔ ص ۲۱۷۔ طبع کراچی۔

ء میں ۱۹۰۰ء میں مسجد مسلمانوں کے حوالہ کر دی۔[1]

۳۔ **زینت المساجد**۔ دریا گنج دہلی میں جمنا کے کنارے واقع ہے۔ شاہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کی دختر زینت النساء بیگم نے یہ مسجد تعمیر کرائی تھی۔ مسجد کے ایک گوشہ میں زینت النساء بیگم کی قبر موجود ہے۔ ۱۸۵۷ء میں اس میں بھی فوجوں نے رہائش اختیار کر لی۔ اس میں ایک گورا فوج کا دستہ رہتا تھا۔ ۱۹۰۵ء میں لارڈ کرزن نے دہلی میں دربار منعقد کیا اس موقعہ پر اس نے یہ مسجد مسلمانوں کے حوالہ کی۔[2]

۴۔ **عرب کالج کی عمارت**۔ اجمیری دروازہ دہلی کے باہر سنگ سرخ کی ایک عمارت ہے۔ دراصل یہ نواب غازی الدین فیروز جنگ کا مقبرہ، مسجد اور مدرسہ ہے جو ۱۷۱۰ء میں تعمیر ہوا تھا۔ شروع سے اس میں مدرسہ قائم تھا ۱۸۲۵ء میں یہاں دہلی کالج قائم ہوا۔ ۱۸۵۷ء میں اس پر بھی فوجوں نے قبضہ کر لیا تھا۔ ۱۸۶۲ء میں مسلمانوں کے احتجاج پر حکومت نے یہ عمارت مسلمانوں کو واپس دی۔[3]

۵۔ **بادشاہی مسجد لاہور**۔ لاہور کی یہ عظیم الشان مسجد قلعہ لاہور کے سامنے ہے۔ دنیا کی عظیم ترین مساجد میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ اس کو شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر نے بنوایا تھا۔ پہلے تو اس پر سکھوں نے قبضہ جمایا۔ پھر انگریزوں نے گورا فوج کی بارک بنا دیا۔ مسلمان مسلسل اس پر قبضہ کے خلاف احتجاج کرتے رہے۔ بالآخر ۱۸۶۹ء میں حکومت نے یہ مسجد مسلمانوں کو واپس کر دی۔[4] یہ مسجد نہایت شکستہ حالت میں تھی مسلمانوں نے اس کی مرمت کرائی۔ ان کے

---

۱؎ Twilight of the Mughals By Percival Spear Cambridge P 220 1951

۲؎ Twilight of the Mughals P 220

۳؎ "اینگلو عربک کالج اور اسکول" از محمد حسین زبیری و سید ضیاء الحسن زیدی ص ۱۳۱۔ طبع کراچی۔

۴؎ Twilights of the Mughals P-220

علاوہ بھی کتنی ہی مسجدیں تھیں جن پر حکومت نے قبضہ کر لیا تھا اور ایک مدت کے بعد ان کو واگزار کیا۔

۶۔ **تاج محل** ۔ یہ اعجوبہ روزگار عمارت ہے جس کو شاہجہان بادشاہ نے ۵۰ لاکھ روپیہ کے صرفہ سے ۱۰۴۰ھ میں تعمیر کرایا تھا۔ انگریز کا انتقامی ذہن مسلمانوں کی اس عالیشان عمارت کو برقرار رکھنا نہیں چاہتا تھا۔ لارڈ کیننگ جو رحم دل کے نام سے مشہور ہے۔ اس نے فیصلہ کیا کہ روضہ تاج محل کو مسمار کرا کے اس کے پتھر نیلام کر دیئے جائیں اور بہانہ یہ بنایا کہ جنگ ۱۸۵۷ء میں جو خسارہ حکومت کو ہوا ہے اس کو پورا کرنا مقصود ہے۔ حسن اتفاق سے حکومت کا ایک سیکرٹری وہاں آثار قدیمہ کا شائق تھا۔ اس نے اس تجویز کی شدید مخالفت کی۔ اس وجہ سے یہ محفوظ رہ گیا۔[1]

## جذبہ جہاد کو ختم کرنا

ان تدابیر سے مسلمان قوم کا حسن ظن حاصل کرنا مقصود تھا۔ اور مسلمانوں کے دلوں میں انگریزی حکومت کے لیے نرم گوشہ پیدا کرنا مقصود تھا۔ جب یہ مقصود حاصل ہو گیا، تو انگریزی حکومت نے تحفظ اور استقامت کے نقطہ نظر سے چند اقدامات کیے۔

انگریزی حکومت جس لفظ سے بہت زیادہ خائف تھی جو پچھلی ایک صدی سے انتہائی خطرے کے ہم معنی بن گیا تھا وہ "جہاد" تھا۔ جدید پالیسی کا اولین ہدف یہ تھا کہ جس طرح بھی ممکن ہو مسلمانوں کے اندر جذبہ جہاد کو سرد کر دیا جائے۔ اس مقصد کے لیے ترہیب ترغیب اور تدابیر ہر قسم کے ذرائع کو روا رکھا گیا۔ بالآخر حکومت اپنا مقصد حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ کاروبار جہاد کا یہ المناک اختتامیہ ہے۔

۱۔ سب سے پہلے انگریزی حکومت نے خلافت عثمانیہ ترکیہ کو استعمال کیا۔ اور حرمین شریفین کے علماء سے فتاویٰ حاصل کیے۔ جن میں انہوں نے صراحت کی کہ انگریزوں کا ہندوستان

---

[1] Twilight of the Mughals P220

دارالحرب نہیں ہے۔ بلکہ دارالامن ہے اس لیے جہاد فرض نہیں ہے۔ ان فتووں کی بہت بڑے پیمانہ پر تشہیر کی گئی۔[۱]

۲۔ مسلمانوں کے رہنما سر سید احمد خان کا نقطہ نظر اس باب میں سب کو معلوم ہے۔ وہ بہت آگے بڑھ گئے تھے۔ انھوں نے انگریزی حکومت کو قرآنی آیت "اولوا الامر" کا مصداق ٹھہرایا تھا جس پر جوش ملیح آبادی نے طنزاً کہا تھا۔

دور سید کے اولوا الامر دا سلو

۳۔ مولوی چراغ علی وزیر حکومت نظام دکن نے ۱۸۸۰ء میں جہاد پر ایک کتاب لکھی جس میں ثابت کیا کہ جہاد صرف دفاعی ہوتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام جنگیں دفاعی تھیں۔

۴۔ اس سلسلہ میں سب سے اہم خدمت محمڈن لٹریری سوسائٹی کلکتہ نے انجام دی۔ صدر سوسائٹی نواب عبداللطیف خان نے ۲۳ نومبر ۱۸۷۰ء کو کلکتہ میں سربرآوردہ مسلمانوں کا ایک جلسہ بلایا۔ جلسہ میں شیعہ سنی سبھی شریک ہوئے۔ سب نے جہاد کے خلاف تقریریں کیں۔ اور اس سے برارت کا اظہار کیا۔ سب سے زوردار تقریر مولوی کرامت علی جونپوری کی تھی۔ بقول عبداللہ یوسف علی اس جلسہ نے وہابیوں کے جذبہ جہاد کے خلاف ایک بند باندھ دیا۔[۲] نواب صاحب حکومت انگریزی کے منظور نظر تھے۔ ۱۸۶۴ء میں وہابیت کے الزام میں نواب صدیق حسن خان والی بھوپال سے اختیارات سلب کر لیے گئے تھے۔ اس وقت نواب عبداللطیف خاں کو ریاست بھوپال میں وزیر اعظم مقرر کیا گیا تھا۔

۵۔ شیعہ فرقہ کے علماء نے جہاد سے لاتعلقی کا اعلان کرتے ہوئے کہا کہ امام کی موجودگی کے بغیر ہمارے یہاں جہاد جائز نہیں ہے۔[۳]

---

[۱] Indian Musalman W. W. Hunter

[۲] برطانوی عہد میں ہندوستانی تمدن کی تاریخ۔ عبداللہ یوسف علی۔

[۳] جہاد جیسا کہ شیعہ سمجھتے ہیں۔ از منشی امیر علی خان بہادر۔ طبع کلکتہ ۱۸۷۱ء ص ۱۰۱۔ بحوالہ ہنٹر۔

۶۔ مولوی ڈپٹی نذیر احمد دہلوی اس سلسلہ میں لکھتے ہیں۔

"احکام جہاد مسلمانان ہند سے متعلق نہیں ہیں۔ اور یہی وجہ ہے ہم حقوق و فرائض کو جمع کرنے بیٹھے ہیں اور جہاد کا باب تک قائم نہیں کیا۔ کہ کہیں عوام کالانعام کو سررشتہ نسیان یاد دہانیدن" نہ ہوجائے[1]

۷۔ مگر سب سے اہم معاملہ وہابیوں کا تھا۔ وہ ہی عملاً جہاد کر رہے تھے ان سے ہی حکومت خائف تھی۔ اس وقت وہابیوں کے بڑے رہنما مولوی محمد حسین بٹالوی (۱۹۱۹ء) تھے وہابی مقدمات، کالے پانی کی سزا اور عام دارو گیر سے وہ اس قدر خوف زدہ اور پست حوصلہ ہوگئے تھے کہ انھوں نے اپنا مسلک ہی تبدیل کر ڈالا۔ انھوں نے جہاد کے خلاف ایک کتاب لکھی۔ الاقتصاد فی مسائل الجہاد۔ یہ کتاب فارسی زبان میں ہے اور ۱۸۷۶ء میں لکھی گئی ہے۔ اس کے بعد انھوں نے ۱۸۸۸ء میں جہاد کی فرضیت منسوخ ہونے کا فتویٰ صادر کر دیا۔ مذکورہ بالا کتاب کو انھوں نے سر جیمس لائل اور ایٹ کنس کے نام معنون کیا ہے۔ اس کتاب کی سرکاری حلقوں میں خوب پذیرائی ہوئی۔ حکومت نے اس کے عربی، اردو اور انگریزی ترجمے شائع کرائے۔ اس کارگزاری کے صلہ میں انگریزی حکومت نے مصنف کو پنجاب میں ایک جاگیر عطا کی[2]

۸۔ وہابیوں کے دوسرے نامور عالم نواب صدیق حسن خاں نواب بھوپال تھے انھوں نے بھی جہاد کے خلاف فتویٰ دے دیا۔ جہاد کی عدم فرضیت کے لیے انھوں نے ترجمان وہابیہ کتاب لکھی[3] اور اس کا انگریزی ترجمہ شائع کرایا۔

---

[1] الحقوق والفرائض۔ از مولوی نذیر احمد دہلوی۔ جلد اوّل ص۔ ۱۷

[2] ہندوستان میں پہلی اسلامی تحریک۔ از مولانا مسعود عالم ندوی ص ۲۷ مطبوعات سلیمانی۔ لاہور ۱۹۷۵ء

[3] The Interpretation of Wahabism Oxford Press 1884 P. 2

۹۔ ملک کا اکثریت والا طبقہ بریلوی مسلک کا پیروکار ہے۔ ان کے رہنما مولوی فضل رسول بدایونی نے ۱۸۷۲ء میں وہابیوں کے خلاف "سیف الجہاد" کتاب لکھی۔ ان کے دوسرے بڑے عالم مولانا احمد رضا خاں بریلوی ہیں وہ ہندوستان کو دارالحرب تسلیم نہیں کرتے انھوں نے اس موضوع پر ایک کتاب لکھی ہے۔ اعلام بان ہندوستان دارالاسلام۔ یہ کتاب مطبع حسینی بریلی سے ۱۹۲۷ء سے طبع ہوئی ہے۔ ص ۲۰۔ اس میں صاف لکھا ہے "ہندوستان دارالحرب نہیں ہے۔ جہاں جہاد جائز ہو۔ یہ دارالاسلام ہے"

۱۰۔ بریلوی مسلک کے مشہور فقیہ حکیم امجد علی قادری اس سلسلہ میں لکھتے ہیں۔
"ہندوستان بحمدہ تعالیٰ اب تک دارالاسلام ہے۔ بعضوں نے خواہ مخواہ اسے دارالحرب خیال کر رکھا ہے" [۱]

اس طرح مسلمانوں کے تمام فرقوں اور سربرآوردہ افراد نے جہاد کے عدم اجراء یا منسوخی کے حق میں بیان دے دیا۔ اس کے بعد انگریزی حکومت کو یک گونہ سکون میسر ہوا مگر اس کے باوجود بھی وہ لفظ جہاد سے ہمیشہ چوکنا رہتی تھی۔ ندوۃ العلماء لکھنؤ کے ایک استاد مولوی عبدالکریم نے الندوہ ایک شمارہ ـــ جون ۱۹۱۲ء ـــ میں ایک مضمون جہاد لکھ دیا۔ مولانا شبلی نے اس جرم میں عبدالکریم کو معطل کر دیا۔ اور ۲۸ر جنوری ۱۹۱۳ء کو لکھنؤ میں جلسہ عام کر کے برملا اس مضمون سے اپنی برأت کا اظہار کیا [۲]

جہاد سے حکومت کتنی حساس تھی اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۹۲۰ء میں شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندی جزیرہ مالٹا میں نظر بند تھے۔ اسی زمانہ میں یوپی گورنمنٹ کا چیف سیکریٹری رچرڈ برن انگلستان جاتے ہوئے خاص طور پر وہاں اترا تھا۔ اس نے وہاں

---

[۱] بہار شریعت۔ جلد نہم۔ ص ۱۳۳۔ غلام علی اینڈ سنز۔ لاہور ۱۳۴۸ء

[۲] موج کوثر۔ شیخ محمد اکرام۔ ص ۳۰۶۔

مولانا سے ملاقات کی اور دریافت کیا کہ کیا ہندوستان دارالحرب ہے[1] گویا اس وقت تک لفظ جہاد کا خوف حکومت پر طاری تھا۔

## وہابیوں کے خلاف محاذ

انگریزی سیاست نے طے کیا کہ وہابیوں کو مسلمان معاشرہ سے کاٹ کر جدا کر دیا جائے۔ اس غرض کے لیے حکومت کی شہ پر بعض علما، اور دیندار افراد نے یہ فریضہ انجام دیا۔ سب سے پہلے بدایوں اور سہسرام کی عدالتوں سے وابستہ سررشتہ داروں نے وہابیوں کے خلاف کتابیں لکھیں۔ اور مناظرہ بازی شروع کر دی۔ بدایوں کے علما نے ان مجاہدین کے خلاف سب سے پہلے وہابی کا لفظ استعمال کیا۔ یہ لفظ اپنوں اور پرایوں نے اس کثرت سے استعمال کیا کہ پھر ان کے نام کے ساتھ چپک کر رہ گیا۔ اور رطب ویابس اتنا کچھ اس لفظ کے ساتھ وابستہ ہوگیا۔ کہ اب یہ ایک گالی کے مترادف ہوگیا۔ وہابیوں کے خلاف تردیدی کتابیں لکھی گئیں۔ فتوے بازی ہوئی۔ اس باہمی جنگ وجدال نے بڑی شدت اختیار کر لی مسلمانوں کی وحدت ملی کو اس سے سخت نقصان پہنچا۔ ہندو پاکستان کے مسلمان اس جنگ وجدال کے تلخ نتائج آج تک بھگت رہے ہیں۔ اس باہمی جنگ وجدال سے سب سے زیادہ فائدہ انگریزی حکومت کو پہنچا۔ ولیم ہنٹر بہت خوش ہو کر اعلان دیتا ہے۔

> "جس بھی مولوی کے پاس مسجد یا خانقاہ سے ملحق ایک درجن ایکڑ زمین تھی، وہ وہابیوں کے خلاف نصف صدی سے چیخ رہا ہے۔ ایسے فتووں کا ایک ڈھیر حکومت کے پاس جمع ہو گیا ہے۔ اس طرح وہابیوں کے خلاف عام بیزاری کی رو چل پڑی۔"[2]

---

[1] سفرنامہ اسیر مالٹا۔ مولانا حسین احمد مدنی۔

[2] Our Indian Musalman. W. Hunter. P-90

ہنٹر انگریزی حکومت کی پالیسی کی کامیابی پر فخریہ انداز میں لکھتا ہے۔

"جہاں ہماری تلوار ناکام رہی وہاں ہماری ڈپلومیسی کامیاب ہوگئی۔"

## وہابیوں کی پسپائی

فتوے بازی، مناظرہ بازی، داروگیر اور سرکاری دباؤ سے گھبرا کر وہابی رہنما مولوی محمد حسین بٹالوی نے حکومت سے مصالحت کر لی اور مزید عافیت اس میں دیکھی کہ لفظ وہابی سے جان چھڑالی جائے۔ جہاد کے خلاف فتویٰ دے کر وہ پہلے ہی حکومت کے یہاں اعزاز کے مستحق قرار پاچکے تھے۔ اب انھوں نے حکومت کو درخواست دی کہ آئندہ حکومت ان لوگوں کو وہابی نہ کہے بلکہ اہل حدیث کہے۔ اس سلسلہ میں ملک کے مختلف حصوں سے محضر نامے حکومت کی خدمت میں ارسال کیے گئے۔ وفاداریوں کا یقین دلایا گیا۔ سالوں کی سخت جدوجہد کے بعد وہ اپنی مہم میں کامیاب ہوئے۔ ۱۹ر جنوری ۱۸۸۷ء کو مرکزی حکومت ہندوستان نے ایک مراسلہ جاری کیا کہ آئندہ سے اس فرقہ کو وہابی نہ کہا جائے بلکہ اہل حدیث کہا جائے۔[1]

## رد احناف کی مہم

جہاد اور حکومت کی جانب سے یکسو ہو کر مولوی محمد حسین بٹالوی نے اپنی سرگرمیوں کے لیے نیا میدان تلاش کیا۔ انھوں نے ملک کی اکثریت کے مسلک احناف کے خلاف محاذ کھول دیا۔ ـــــ وہ عدم تقلید، رفع یدین، فاتحہ خلف الامام جیسے مسائل کی بحث میں پوری شدت کے ساتھ مشغول ہوگئے۔ اس کے نتیجہ میں قومی وحدت تفرقہ کا شکار ہوگئی۔ وحدت ملی کو اس سے سخت نقصان پہنچا۔

---

[1] ماہنامہ اشاعۃ السنہ۔ مدیر مولوی محمد حسین بٹالوی۔ اشاعت فروری ۱۸۸۷ء

# اہل حدیث کی دلچسپیاں

حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان میں عمل بالحدیث کا آغاز مولوی محمد اسماعیل شہید کی ذات سے ہوا ہے۔ ان کا اصل مقصد احیاءِ اسلام اور اعلائے کلمۃ اللہ تھا۔ اس غرض کے لیے انھوں نے سرفروشی اور جاں نثاری کا راستہ اختیار کیا اور کافروں کے خلاف جہاد کیا۔ ان کے اخلاف میں مولوی محمد حسین بٹالوی کے دور میں احیاءِ اسلام اور احیاءِ سنت سے نیچے گر کر احیاءِ حدیث کا شغل اختیار کر لیا گیا۔ ڈھونڈ ڈھونڈ کر چھپی احادیث پر عمل کرنا اور جمہور مسلمانوں کو مشتعل کرنا ان کا کام ہو گیا۔ کافروں سے جہاد کی بجائے احناف سے جہاد شروع ہو گیا۔ نئے نئے مسائل استنباط کیے گئے۔ جمہور امت کے خلاف — سنی، شیعہ، خوارج — محجوب الارث کو رد کر دیا گیا (مولانا اسلم جیراجپوری) آئمہ اربعہ کو مشرک قرار دیا گیا۔ (عبدالحق بنارسی) قدیم علما اور فقہاء کا اعتماد ختم ہو گیا۔ بند ٹوٹ گیا۔ خودسری کے لیے راستہ کھل گیا۔ اب کسی نے احادیث کے دفتر کو غلط قرار دیا (پرویز اور عبداللہ چکڑالوی) کسی نے تاریخ کے دفتر کو غلط قرار دیا۔ (محمود احمد عباسی)۔ غرضیکہ وحدت ملت پہ اور سرچشمہ وحدت پر ہر چہار جانب سے سنگ باری ہونے لگی۔ اور لطف یہ ہے کہ تحقیق اور حق پسندی کے نام پر ہونے لگی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ سب "بزرگانِ قوم و ملت" تفرقہ پیدا کر کے انگریزی پالیسی پر گام زنی کر رہے تھے۔ ان کے "مشاغل حسنہ" سے سب سے زیادہ خوشی جس کو تھی وہ انگریزی حکومت تھی اس لیے کل تک جن کے خلاف وہابی مقدمات قائم کیے جا رہے تھے، آج ان کو شمس العلماء کے خطابات سے نوازا جا رہا تھا۔

واضح رہے کہ یہاں عمل بالحدیث کے فقہی مذہب پر گفتگو نہیں ہو رہی ہے۔ عمل بالحدیث کو قدیم زمانہ میں ظاہری مسلک کہتے تھے۔ امام داؤد ظاہری اور امام ابن حزم اندلسی اس مسلک کے بڑے نمائندے ہیں۔ متاخرین میں امام ابن تیمیہ اور ابن قیم الجوزیہ بھی اسی مسلک کے داعی تھے۔

یہ سب اہلِ سُنّت کے امام ہیں۔ یہاں تو اختلاف اور انتشار پر افسوس کیا جا رہا ہے۔

## جعلی نبوّت

استحکامِ سلطنت اور انسدادِ جذبہ جہاد کے لیے برطانوی پارلیمنٹ کے مذکورہ بالا کمیشن نے یہ سفارش بھی کی تھی۔

”یہاں کے لوگوں کی بھاری اکثریت پیری مریدی کے رجحانات کی حامل ہے۔ اگر حکومت اس وقت کسی ایسے شخص کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جائے، جو ظلی نبوت کا دعویٰ کرنے کو تیار ہو تو اس کے حلقہ میں ہزاروں لوگ جوق در جوق شامل ہو جائیں گے۔ لیکن مسلمانوں میں اس قسم کا دعویٰ کرنے کے لیے کسی کو تیار کرنا بنیادی کام ہے۔ یہ مشکل حل ہو جائے تو اس شخص کی نبوت کو حکومت کے زیرِ سایہ پروان چڑھایا جا سکتا ہے۔ ہم اس سے پہلے برِصغیر کی تمام حکومتوں کو غدار تلاش کرنے کی حکمتِ عملی کے ذریعے شکست دے چکے ہیں۔ وہ مرحلہ اور تھا۔ اس وقت غداروں کو تلاش کیا گیا۔ لیکن اب جب کہ ہم برِصغیر کے چپہ چپہ کے حکمران بن چکے ہیں۔ اور ہر طرف امن و امان بحال ہو چکا ہے۔ تو ان حالات میں کسی ایسے منصوبہ پر عمل کرنا چاہیے، جو یہاں کے باشندوں کو داخلی انتشار میں مبتلا کر دے۔“ [۱]

انگریزی حکومت کو ظلی نبوت مرزا غلام احمد قادیانی (۱۹۰۸ء - ۱۸۳۹ء) کی صورت میں مل گئی۔ مرزا خود بھی اعتراف کرتا ہے ”میں انگریزوں کا خود کاشتہ پودا ہوں“ [۲] واضح رہے اس سے

---

۱ بیس بڑے علماء۔ از عبدالرشید ارشد۔ ص ۲۔ مکتبہ رشیدیہ۔ لاہور

۲ درخواست مرزا غلام احمد قادیانی۔ ۲۴ فروری ۱۸۹۹ء۔ تبلیغ رسالت جلد ہفتم۔ قومی ڈائجسٹ خصوصی اشاعت، ۱۹۸۳ء۔

قبل زار روس نے ایران میں "بہاء اللہ" کی صورت میں ایک جعلی نبی کھڑا کر دیا تھا[1] روس کی تقلید میں انگریزوں نے بھی یہ اقدام کیا۔

مرزا غلام احمد قادیانی نے ۱۸۷۰ء کے بعد اپنی نبوت کا اعلان کیا۔ نبی بننے کے بعد سب سے اہم اعلان مرزا قادیانی نے یہ کیا کہ جہاد بالسیف ہمیشہ کے لیے منسوخ ہے۔ اب جہاد بالقلم کا زمانہ ہے۔ اس اعلان سے حکومت کی زبردست تائید ہوگئی۔ اور نبوت کے اعلان نے مسلمان قوم کو سخت انتشار کی حالت میں مبتلا کر دیا۔ کفر کے فتوے۔ مناظرہ بازی، تردیدی رسائل میں علماء باہم دست و گریبان ہوگئے۔ اور سب کی توجہ حکومت کی طرف سے منعطف ہوگئی۔ باہمی تفرقہ اور تصادم سے حکومت کی پالیسی کامیاب ہوگئی۔ اس طرح حکومت کو سکھ اور چین میسر آگیا۔

## دین و دنیا کی تفریق

جہاد کو ختم کرنے کے لیے انگریزوں نے زندگی کی تفریق کا یورپ کا آزمودہ کار نسخہ یہاں ہندوستان میں استعمال کیا۔ دین و دنیا کی تفریق کی ہر طرح اشاعت کی گئی۔ سرکاری ملازمین میں اس تصور کو پھیلایا۔ درس گاہوں میں اس تصور کو خوب پھیلایا۔ علی گڑھ کالج کے پرنسپل تھیوڈور بک نے سب سے پہلے اس تصور کی اشاعت کی ہے۔ دین جدا ہے۔ دنیاوی زندگی جدا ہے۔ سیاست کا دین سے کوئی تعلق نہیں[2]۔ مولوی چراغ علی نے دین اور سیاست کی تفریق کا پہلا مر[...]

---

[1] لوح باب و بہا۔ از مرزا احمد علی قبلہ۔ امامیہ مشن پاکستان۔ لاہور۔

[2] مسلمانوں کا روشن مستقبل۔ از مولانا طفیل احمد علیگ بنگلوری طبع بدایوں۔ ۱۹۳۹ء

برملا اعلان کیا اور انھوں نے ہی انگریزی حکومت کو سب سے بڑی اسلامی حکومت بنایا۔[1] بعض گروہوں نے تفریق کا یہ نظریہ قبول کر لیا آج بھی علماء کی بعض جماعتیں سیاست کو شجر ممنوعہ سمجھتی ہیں۔ علامہ اقبال مرحوم کا یہ عظیم الشان کارنامہ ہے کہ انھوں نے اپنے ایک شعر کی ضرب کلیمی سے سامری کا سارا صنم خانہ پاش پاش کر دیا۔

رشی[2] کے فاقوں سے ٹوٹا نہ برہمن کا طلسم
عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کار بے بنیاد

اور ؎ جدا ہو دین سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

## کتاب تاریخ سے ایک صدی غائب

جہاد کے خلاف منصوبہ کی ایک شق یہ بھی تھی کہ مجاہدین کے کارناموں کو عوام کی نگاہوں سے مخفی رکھا جاتے۔ اس لیے کامل ایک صدی (۱۷۵۸ء - ۱۸۵۷ء) کے واقعات پر پردہ ڈال دیا گیا۔ مجاہدین کے کارناموں کو کتاب تاریخ سے حذف کر دیا۔ تاکہ نئی نسلیں مجاہدین اسلام کے نام سے ہی واقف نہ ہوں۔ تاریخ کی کسی کتاب میں ان مجاہدین کا ذکر نہیں ملتا ہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کا ذکر ضرور ملتا ہے مگر "غدر" کے نام سے جس کا مطلب یہ ہے کہ ہندوستانیوں نے بدعہدی کی اور بے وفائی کی۔ اس لفظ کو خوب شہرت دی گئی۔ اپنے پرائے سب یہی لفظ استعمال کرتے ہیں۔

جادوئے محمود کی تاثیر سے چشم ایاز
دیکھتی ہے اپنی گردن میں طوق دلبری

حقیقت میں کتنی باضمیر اور صاحب عزیمت تھی وہ قوم جس کے حکمران ــــ بادشاہ اور امراء

---

[1] اعظم الکلام دار تقاء اسلام۔ از مولوی چراغ علی۔

[2] رشی سے مراد مہاتما بدھ ہے۔ جس نے قدیم زمانہ میں ہندو مذہب میں پائی جانے والی ذات پات کی تفریق ختم کرنا چاہی تھی۔ یہی کوشش حال میں گاندھی نے کی تھی۔ دونوں ناکام ہوئے۔

جب انگریزوں سے شکست کھا گئے تو اس کے علماء اور مشائخ نے بادشاہوں اور درباروں سے بے نیاز عوام مسلمانوں کی طاقت اور قوت کے بل پر انگریزوں کے خلاف علم جہاد بلند کیا اور بے سروسامانی میں انگریز جیسی طاقت سے نبرد آزمائی کرتے رہے۔ اور جب جہاد کی آگ سرد پڑ گئی تو غیرت اور حمیت کے ان پیکروں نے حرمین شریفین میں ہجرت اختیار کی۔ لیکن طاغوت کی قوت کے سامنے سجدہ ریز نہیں ہوئے۔

انگریزی حکومت نے قانون نافذ کیا کہ اگر کوئی شخص ان واقعات (مجاہدین) کے چہرے سے نقاب کشائی کرے گا، وہ تاج برطانیہ کے خلاف بغاوت کے جرم کا مرتکب پائے گا۔ اس کو انتہائی سنگین سزا دی جائے گی۔ اس تدبیر سے حکومت نے مجاہدانہ سرگرمیوں پر پردہ ڈالے رکھا۔ حتیٰ کہ ۱۹۳۴ء میں اشرف پبلی کیشنز لاہور نے مولانا محمد جوہر مرحوم کی خود نوشت سوانح حیات۔ [illegible] شائع کی۔ اس موقعہ پر ناشر نے کوشش کی کہ مولانا محمد علی کا مشہور زمانہ مضمون Choice of The Turks کو کتاب میں شامل کر کے شائع کر دیا جائے۔ مگر حکومت نے اس کی اجازت نہ دی۔ واضح رہے ۲۶ ستمبر ۱۹۱۴ء سے وہ مضمون ممنوع ہے۔

۱۹۳۷ء میں پہلی مرتبہ جب صوبوں میں خود مختار قومی حکومتیں قائم ہو گئیں۔ اور بعض آزادیاں ملیں تب ان فراموش کردہ واقعات کو شائع کرنے اور عوام کے سامنے پیش کرنے کا موقعہ ملا۔ سید احمد شہید پر ابوالحسن علی ندوی اور مسعود عالم ندوی نے کتابیں لکھیں مسلم اسٹوڈنٹ فیڈریشن کے صدر عبداللہ بٹ نے ایک صدی گزرنے کے بعد "یوم اسمٰعیل شہید" منایا۔ (۱۹۴۱ء) ان کے بعد مولانا غلام رسول مہر نے تین کتابیں لکھ کر تحریک مجاہدین کے کارناموں کو عام کر دیا۔ پاکستان بن جانے کے بعد ڈاکٹر معین الدین احمد خان ڈھاکہ نے فقیروں کی جدوجہد اور فرائضی تحریک پر انگریزی میں کتابیں شائع کیں۔ اس طرح یہ مجاہدین گمنامی اور فراموشی کے اندھیرے سے نکل کر علم کی روشنی میں عوام کے سامنے آئے۔[1]

---

[1] مجنوں شاہ مستانہ پر اردو میں سب سے پہلے راقم نے ایک مضمون لکھا جسارت کراچی۔ ۱۰ فروری ۱۹۸۰ء

## وفادار قیادت

حکومت کے منصوبہ کا ایک جزو یہ بھی تھا کہ مسلمانوں میں وفادار قیادت سامنے لائی جائے۔ جہاد کی ناکامی کے بعد وہ علماء جو علم و تقویٰ میں مسلمانوں کے معتمد تھے۔ جو لوگوں کے لیے مرجع تھے، وہ یا تو ہجرت کر کے حجاز مقدس چلے گئے یا پھر شکست خوردہ اور پست حوصلہ ہو کر گوشہ نشین ہو گئے۔ اس کی وجہ سے قیادت میں خلا پیدا ہو گیا۔ ان حالات سے حکومت نے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا۔ حکومت نے ایسے افراد کو آگے بڑھایا جو حکومت کے یہاں مقبول تھے علماء کرام کی موجودگی میں ایسے افراد کا چراغ نہیں جل سکتا تھا۔

اس غرض کے لیے انگریزی حکومت نے سرسید احمد خان دہلوی کو مسلمانوں کے متکلم اور سربرآوردہ شخصیت کی حیثیت سے پیش کیا۔ اس لیے کہ ان کی وفاداری آزمائش کی بھٹی میں کندن بن کر نکلی تھی۔ حکومت کے درباروں میں، سرکاری کمیٹیوں میں، تجاویز اور مشوروں میں حکومت ان کو اہمیت دیتی تھی۔ تاکہ وہ اپنے ہم مذہبوں میں ایک ممتاز مقام کے حامل نظر آئیں۔ جب وہ انگلستان گئے تو مراحم خسروانہ کے سزاوار قرار پائے جس سے نواب اور مہاراجے محروم تھے۔ ملکہ معظمہ نے شرف ہمکلامی بخشا۔ لندن کے اخباروں نے تعریف اور توصیف میں مضامین لکھے۔ جب مسلمانوں نے دیکھا انگریزی حکومت ایک مسلمان کی عزت و توقیر کرتی ہے۔ تو وہ پیچھے کیوں رہتے۔ انھوں نے بھی ان کو اپنا رہبر و رہنما تسلیم کر لیا۔ اس طرح مسلمان معاشرہ کی قیادت جو گزشتہ ایک صدی سے ولی اللٰہی خاندان اور ان کے متوسلین کے ہاتھوں میں تھی وہ اب سرسید احمد خان کے ہاتھوں میں آ گئی۔ انگریزی تدابیر کامیاب ہو گئیں۔ وفادار لوگوں کا ایک گروہ سرسید احمد خان کے گرد جمع ہو گیا۔ سابقہ قیادت کے بقیہ افراد مسجدوں، مدرسوں اور خانقاہوں میں پناہ گزین ہو گئے۔

۱۸۸۵ء کرنل گریہم نے سرسید احمد خان کی زندگی کے کارنامے انگریزی زبان میں

لکھے۔

Life and work of Sir Syed Ahmad Khan by Lieutenent Colonel G.F.I. Graham, London 1885-1901

انگریزوں کے ڈیڑھ سو سالہ دورِ حکومت میں غالباً یہ پہلا موقعہ تھا کہ کسی انگریز نے کسی ہندوستانی کو اپنا ممدوح بنایا ہو۔ اور اس کی سوانح حیات لکھی ہو۔ اس کتاب کی اشاعت کے بعد سرسید احمد خان کی شہرت سرکاری حلقوں میں اور انگریزی خواں طبقہ میں نصف النہار پر پہنچ گئی۔ وہ بلا شرکت غیرے مسلمانوں کے رہبر اور رہنما تسلیم کر لیے گئے۔

انگریزی میں سوانح حیات شائع ہو جانے کے بعد خواجہ الطاف حسین حالی کو ترغیب ہوئی کہ وہ اردو زبان میں سرسید احمد خان کی سوانح حیات مرتب کریں۔ حیات جاوید تیار تو سرسید کی زندگی میں ہی ہو گئی تھی مگر اس کی اشاعت کی نوبت ان کے مرنے کے بعد ۱۹۰۱ء میں آئی۔ اسی سال ایک اور کتاب بھی شائع ہوئی۔ محمڈن کالج ھسٹری یعنی مدرسۃ العلوم مسلمانان۔ علی گڑھ۔ از سید افتخار عالم مارہروی مطبع مفید عام آگرہ۔ ۱۹۰۱ء۔ مگر یہ کتاب گوشہ گمنامی میں پڑی ہوئی ہے۔ معلوم نہیں اسے مقبولیت کیوں حاصل نہیں ہوئی۔

پسندیدہ قیادت کے مسئلہ پر انگریزی حکومت کی دلچسپی اس قدر زیادہ تھی کہ سرسید کے آخری ایام میں کالج کے ٹرسٹی (معتمد) کے منصب کے لیے سبھی لوگ ان کے رفیق دیرینہ مولوی سمیع اللہ خاں دہلوی کو موزوں سمجھتے تھے۔ حکومت انگریزی کے لیے ان کی خدمات بھی کچھ کم نہیں تھیں۔ مگر کالج کے انگریز اساتذہ ان سے خوش نہیں تھے۔ اس لیے سرسید نے اس منصب کے لیے اپنے صاحبزادے جسٹس سید محمود کا نام پیش کیا۔ جو انگریزی اساتذہ کو قبول تھے حالانکہ جسٹس سید محمود کے عیوب سب کو معلوم تھے۔ اس مسئلہ پر سخت تلخ کلامی ہوئی مگر سرسید کسی صورت میں کوئی بات ماننے کو تیار نہیں تھے۔

ان کے بعد نواب محسن الملک معتمد مقرر ہوئے۔ ان کے بعد نواب وقار الملک

مستفید ہوئے۔ جب نواب وقار الملک نے انگریز اساتذہ کی بے جا مداخلت کو کم کرنا چاہا تو تمام اساتذہ نے استعفے دے دیا۔ اور گورنر یو پی نے علانیہ مداخلت کی اور اساتذہ کی تائید کی۔ فہمیدہ نواب نے بہر حال معاملہ رفع دفع کرا دیا۔ وفادار قیادت نواب وقار الملک کی وفات ۱۹۱۷ء تک یعنی نصف صدی تک جاری رہی۔ یہی زمانہ مسلمانانِ ہند کا سیاسی اور فکری لحاظ سے تشکیلی دور ہے۔

*******

## ساتواں باب

# حکومت کی زیرِ نگرانی جدید نسلوں کی تعلیم و تربیت

## ہندوؤں کی جدید نسلوں کی تعلیم

ہندوؤں کی جدید نسلوں کی تعلیم و تربیت میں انگریزوں نے خصوصی دلچسپی لی۔ کمپنی کی حکومت نے ملکی تعلیم کا ڈھانچہ ہی ہندوؤں کو پیشِ نظر رکھ کر بنایا تھا۔ اس میں ان کے لیے خصوصی رعایات رکھی گئی تھیں۔ پہلے مسیحی مشنری تعلیمی ادارے اور بعد میں حکومتی تعلیمی ادارے ہندوؤں کی تعلیم پر خصوصی توجہ دیتے تھے۔ ایک صدی بلکہ ڈیڑھ صدی تک ان کی تعلیم پر پوری توجہ مبذول کی گئی۔ انگریزوں کے پیشِ نظر صرف انگریزی زبان کی تلقین نہیں تھی بلکہ وہ درحقیقت مغربی افکار و نظریات اور مغربی اقدارِ حیات اور معاشرتی آداب سکھانا چاہتے تھے۔ ہندو قوم کی اپنے طریقہ کے مطابق ذہنی اور فکری تشکیل کرنا چاہتے تھے۔ ان کو اس میں کامیابی ہوئی۔ جدید مغربی تصورات ہندوؤں نے آسانی سے قبول کر لیے۔ ان کے خلاف کوئی مذہبی مانع ان کے یہاں موجود نہیں تھا۔ اس لیے مغربی افکار و نظریات کو ان کے اندر خوب فروغ حاصل ہوا۔ انگریزوں نے بھی ہندوؤں کی بہت خدمات انجام دیں۔

- سنسکرت جیسی مردہ زبان کو زندہ کیا۔ اسکولوں اور کالجوں میں رائج کیا۔
- مذہبی کتابوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالا۔ ان کی تصحیح کی۔ اور عام اشاعت کی۔
- ہندو مذہب اور ہندو علوم کا نہایت ہمدردی سے مطالعہ کیا۔ خرافات، لغویات اور فحش مضامین کو نظر انداز کر کے، ان کا صاف ستھرا ملخص پیش کیا۔

- ـــــــ ہندو مذہب اور ہندو فلسفہ کو یورپ میں روشناس کرایا۔
- ـــــــ جدید ہندی زبان کی تشکیل کی اور پھر اس کو خوب پھیلایا۔
- ـــــــ ہندوؤں کو اپنے مذہب اور اپنے فلسفہ پر فخر کرنا سکھایا۔ اس کے بعد ہی ان کے اندر قوم پرستی اور خود شناسی کا رجحان پیدا ہوا۔
- ـــــــ تعلیمی اور تہذیبی سرگرمیوں میں حصہ لینے کے لیے ایک درجہ کی آسودگی اور فارغ البالی قوم کے اندر ہونا ضروری ہے۔ وہ سرکاری ملازمتوں سے اور دولت کی بارش سے پہلے ہی ان کو حاصل تھی۔

یہ خدمات جو انگریزی حکومت ہندو قوم کی انجام دے رہی تھی درحقیقت ان کا حکومت کے بنیادی فرائض سے کوئی تعلق نہیں ہے چونکہ ہندوؤں کو ہر طرح ایک قوم بنانے کا ناتمام وظیفہ انگریزوں نے اپنے اوپر عائد کر لیا تھا۔ اس لیے وہ یہ خدمات انجام دے رہے تھے۔

## ہندو مصلحین

قوم پرستی اور خود شناسی کا تخم تن آور درخت بن گیا۔ اور خوب برگ و بار لایا۔ خود شناسی کا شعور ہو جانے کے بعد ہندو اہل علم مذہب اور معاشرہ کی اصلاح کی جانب متوجہ ہوئے۔ ہندو مصلحین اور نئی نئی تحریکیں پیدا ہونے لگیں۔

یہاں ایک حقیقت کا ادراک کر لینا ضروری ہے۔ ماضی کے مذہبی مصلحین ــــ کبیر، نانک دادو وغیرہ ــــ درحقیقت حق و صداقت کے متلاشی تھے۔ وہ ہندو مذہب کی رسومات پرستی سے بیزار نظر آتے ہیں۔ ان کو جہاں حق نظر آتا ہے وہ قبول کر لیتے ہیں۔ ان کے برخلاف جدید دور کے مصلحین ہندو قوم اور ہندو مذہب کی عظمت کے داعی تھے۔ اس کے بعد وہ مذہب اور معاشرہ کی اصلاح کرنا چاہتے تھے۔ وہ غلط اور فرسودہ رسوم و رواجات کی اصلاح چاہتے تھے۔ وہ مذہب کو مہذب اور معاشرہ کو شائستہ بنانے کے درپے تھے۔

## (۱) برہمو سماج (الٰہی معاشرہ)

یہ سب سے پہلی اصلاحی تحریک ہے۔ اس کا بانی راجہ رام موہن رائے (۱۸۳۱ء-۱۷۷۲ء) تھا۔ وہ ہندو گھر میں پیدا ہوا۔ مسیحی پادریوں سے اس کا ربط وضبط تھا۔ اسلام کا اس نے مطالعہ کیا تھا۔ سید سعید الدین بریلوی (۱۸۷۶ء/ ۱۲۹۳ھ) سے اس نے اسلامی تعلیمات حاصل کی تھیں۔ وہ اس کے ہم جلیس تھے۔ وہ انگریزی زبان سے بھی بخوبی واقف تھے[1] اس طرح راجہ نے مختلف مذاہب کا مطالعہ کیا۔ ۱۸۰۴ء میں اُس نے ایک کتاب تحفۃ الموحدین لکھی تھی۔ کتاب فارسی زبان میں تھی البتہ اس کا مقدمہ عربی زبان میں تھا۔ ایک اور کتاب اس نے مناظرۃ الادیان[1] بھی لکھی تھی۔ اس میں اس نے اسلام پر بھی تنقید کی تھی۔ شاہ ولی اللہ دہلوی کے شاگرد رشید الدین دہلوی (۱۲۴۳ھ) نے راجہ کی کتاب کا رد لکھا تھا۔ جس کا نام "اعانۃ الموحدین واہانۃ الملحدین"[2] تھا۔ راجہ آخری زمانہ میں یونی ٹیرین چرچ میں شامل ہوگیا تھا۔ راجہ نے برہمو سماج کے نام سے ایک جدید مذہب جاری کیا تھا۔ جس میں مختلف مذاہب کی خوبیاں جمع کر دی تھیں۔ ٹیگور خاندان کے افراد بھی اسی مسلک سے تعلق رکھتے تھے۔ اس مسلک کو سب سے زیادہ فروغ کیشب چندر سین (۱۸۸۴ء-۱۸۲۸ء) نے دیا تھا۔ ہندو اس کو اس مذہب کا نبی تسلیم کرتے تھے[1]

---

لہ فقہائے ہند۔ تیرہویں صدی۔ ص-۲۸۸۔ از مولانا محمد اسحاق بھٹی۔ ادارہ ثقافت اسلامی لاہور

ئہ " " " ص ۲۴۴ " " " " " " " "

نوٹ:۔ (۱) یہ کتاب ہندوؤں کی اصلاح کے لیے بنگال میں لکھی گئی۔ مگر زبان فارسی استعمال کی گئی اس کے معنی یہ ہیں کہ علمی زبان ہندوؤں کی بھی فارسی تھی۔ بنگلہ بولی ہوسکتی ہے۔ زبان نہیں ہوسکتی۔

(۲) ولی اللّٰہی خانوادہ اس وقت تک میدان میں سرگرم عمل تھا۔ ہر فکری زیغ پر نظر رکھتا تھا اور مدلل تردید کرتا تھا۔ اس لیے مولانا رشید الدین نے راجہ کی تردید کی۔

کی قدیم ہندی، بنگلہ، انگریزی کے علاوہ عربی میں بھی کتبہ درج ہے۔ بنگال سے یہ مسلک سارے ہندوستان میں پھیل گیا۔ مگر اس کو خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔

ایک بحری سفر میں سید سلیمان ندوی اور رابندر ناتھ ٹیگور ہم سفر ہو گئے ۔"ان سے سوال کیا گیا کہ برہمو سماج کی ناکامی کا سبب کیا تھا۔ حالانکہ اس کے اصول بہت منصفانہ صلح کل کے تھے۔ اس میں عقل اور منطق کے خلاف کوئی چیز نہ تھی"۔ شاعر فلسفی نے جواب دیا "یہ اس لیے ناکامیاب ہوا کہ اس کے پیچھے کوئی شخصی زندگی اور عملی شہرت نہ تھی"۔ اس میں سب لوگ شش (شاگرد) تھے گرو (معلم) کوئی نہیں تھا۔ بہر کیف برہمو سماج نے ہندو مذہب کی اصلاح کی۔ اس میں شامل سب لوگ جدید تعلیم یافتہ تھے۔

## (۲) سادھارن برہمو سماج (آسان برہمو سماج)

اس کا بانی آنند موہن بوس تھا۔ ۱۸۷۸ء میں اس نے برہمو سماج کا آسان مسلک پیش کیا تھا تاکہ عوام کی فہم کے قریب تر ہو۔ پھر بھی اس کی مقبولیت محدود رہی۔

## (۳) تھیوسوفیکل سوسائٹی (انجمن الٰہیات)

یہ ادارہ سب سے پہلے امریکہ میں قائم ہوا تھا۔ (۱۸۷۵ء) یہاں ایسے مستشرق اور اہل علم جمع ہوئے تھے جن کا نظریہ یہ تھا کہ وجدان کے ذریعہ خدا کا علم ممکن ہے۔ میڈم بلاوٹسکی Madam Balavatsky اور کرنل آلکاٹ Col. Alcot ۱۸۷۹ء میں اس تحریک کو لے کر ہندوستان میں آگئے۔ اس کا مرکزی دفتر ۱۸۸۲ء میں اڈیار مدراس میں قائم ہوا تھا۔ یورپی مستشرقین جو سنسکرت زبان اور ہندو مذہب کے دل دادہ تھے۔ وہ اس سوسائٹی میں

---

لہ خطبات مدراس۔ از سید سلیمان ندوی۔ ناشران قرآن لمیٹڈ۔ لاہور۔ ص ۲۵

شریک ہوگئے۔ اوّل تو یہ لوگ اس کوشش میں مصروف تھے کہ ہندو مذہب کو خرافات سے پاک صاف کردیا جائے۔ ثانیاً وہ تمام دوسرے مذاہب کو ملاکر ایک نیا مرکب تیار کرنا چاہتے تھے۔ ایک انگریز عورت اینی بسنت [illegible] ۱۸۹۳ء میں ہندوستان آگئی۔ وہ اس سوسائٹی کی صدر مقرر ہوئی۔ اس سوسائٹی نے ہندوؤں کو اپنے مذہب پر فخر کرنا سکھایا۔ ہندو ذہن کی تشکیل میں اس سوسائٹی نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ سارے ملک میں اس کی شاخیں قائم تھیں۔ یہی بات ہندوؤں کے لیے قابل فخر تھی کہ حاکم قوم انگریز کے افراد ہمارے مذہب کا مطالعہ کر رہے ہیں اور ہمارا مذہب قبول کر رہے ہیں۔

## (۴) آریہ سماج

اس مسلک کا بانی پنڈت دیانند سرسوتی تھا۔ (۱۸۸۴ - ۱۸۲۴ء) یہ آریہ کے قدیم مذہب کو بنیاد قرار دے کر موجودہ ہندو دھرم کی اصلاح کرنا چاہتا تھا۔ تمام غلط رسوم و رواجات کے یہ لوگ منکر تھے۔ سرسوتی نے ۱۸۷۵ء میں ستیارتھ پرکاش (اظہار حق) کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی جس کا مقصد یہ تھا کہ مذہب وہ جو آریوں کا تھا۔ ملک صرف آریوں کے لیے۔ غیر ہندو سکھ، عیسائی، پارسی، مسلمان سب کے یہ مخالف تھے۔ مسلمانوں سے یہ مناظرہ کرتے تھے۔ ان کا انداز جارحانہ تھا مولانا ثناء اللہ امرتسری نے اس کتاب کا جواب "حق پرکاش" کے نام سے دیا تھا۔ اس کے ایک لیڈر لالہ لاجپت رائے نے سنگھٹن تحریک جاری کی۔ لاہور میں اس کا مرکز ۱۸۷۵ء میں قائم ہوا تھا۔ یہ لوگ بت پرستی کے مخالف تھے۔ اصلاح معاشرہ میں ان کی خدمات بہت زیادہ ہیں۔ دیال سنگھ کالج لاہور انہی لوگوں کا قائم کردہ ہے۔

## (۵) پرارتھنا سماج

اس کا بانی مشہور مرہٹہ لیڈر راناڈے تھا (۱۹۰۱ء - ۱۸۴۲ء) یہ ویدک عہد کا احیاء کرنا چاہتے تھے۔

## (۶) رام کرشن مشن

اس مشن کو سوامی رام کرشن پرم ہنس (۱۸۳۴ء - ۱۹۰۵ء) نے جاری کیا تھا۔ یہ ہوگلی کلکتہ کا رہنے والا تھا۔ ہر شے جو ہندو مذہب اور ہندو تہذیب سے متعلق ہے اس کا یہ دفاع کرتا تھا۔ حتیٰ کہ بت پرستی کا بھی دفاع کرتا تھا۔

برہمو سماج، آریہ سماج اور رام کرشن مشن ہندوؤں میں مقبول ترین انجمنیں تھیں۔ ان کی شاخیں ملک کے گوشہ گوشہ میں قائم تھیں۔ ان کے کارکن مخلص، محنتی اور نہایت سادگی پسند ہوتے تھے۔ سارا ہندو معاشرہ ان لوگوں کا احترام کرتا تھا۔ قومیت کے جذبات پروان چڑھانے میں اُنھوں نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ رادھا سوامی مت اور دیو سماج بھی اصلاحی انجمنیں تھیں۔ ان کی خدمات بھی اہم ہیں۔

## ہندو قوم پرستی

یُوں تو انگریز مستشرقین، ہندو مصلحین، ادیب اور مصنفین سب لوگ گزشتہ صدی سے ہندو مذہب کا احیاء، ہندو تہذیب کا فروغ اور ہندو قومیت کی پرورش کر رہے تھے۔ لیکن قومیت کے معمار درحقیقت اربندو گھوش، بال گنگادھر تلک، لالہ لاجپت رائے اور پنڈت ہردیال تھے۔ (۱۸۵۶ء - ۱۹۲۰ء) تلک مہاراشٹر کا برہمن تھا۔ اس کی زندگی کا مقصد ہندو مت کا احیاء تھا اسی مقصد کے لیے اخبارات نکالے۔ ادارے قائم کیے۔ سیواجی کو قومی ہیرو قرار دیا۔ گئو رکشا تنظیم قائم کی۔ گنپتی کا میلہ قائم کیا۔ لاٹھی کلب قائم کی۔ ہندو کو جارح بنایا۔ مُسلمانوں کا سخت دشمن تھا۔ یہ ہندوؤں کا مقبول ترین رہنما ہے۔ دوسرا مقبول رہنما بنکم چٹرجی ہے۔ یہ بنگالی ادیب ہے۔ اس نے ایک ناول آنند ماٹھ ۱۸۸۲ء میں لکھا جس میں کالی ماتا ہندوؤں کو ترغیب دیتی ہے کہ وطن کو ناپاک مسلمانوں سے خالی کراؤ۔ دھرتی ماتا کو ملیچھوں سے پاک کرو۔ اس ناول میں بندے ماترم کا گیت گایا ہے جو آج بھی ہندوستان کا ترانہ ہے۔ اس میں سندھ اور پنجاب پر بھی ہندو حکومت قائم کرنے کا ذکر ہے۔ ان احیائی تحریکوں کی تنگ نظری اور

مسلمان دشمنی کا اعتراف ہندو مصنفین بھی کرتے ہیں۔ پام دت لکھتا ہے۔

"سختی سے ہندو مذہب کی پابندی پر اصرار کرنا جو قومی تحریک کا خاصہ قرار پایا۔ اور جدید مغربی تہذیب پر قدیم ہندو تہذیب کی مزعومہ روحانی برتری ثابت کرنا ان عوامل نے حقیقی قومی تحریک اور سیاسی شعور کو ناگزیر طور پر پسپا کیا اور کمزور کیا۔ ہندو مذہب پر زور دینے کا نتیجہ مسلمانوں کو قومی تحریک سے بیگانہ رکھنے کی صورت میں ظاہر ہوا" وہ مزید لکھتا ہے۔

"قومی بیداری کی پہلی لہر میں ـــ جنگ سے ماقبل ـــ عسکری قومی تحریک کے رہنما تلک اور ارہند گھوش تھے۔ انھوں نے ہندو تہذیب کی بنیادوں پر سیاسی شورش کی عمارت کھڑی کی۔ انھوں نے قومی بیداری کو ہندو تہذیب کے احیاء کا ہم معنی بنا دیا۔ اسی فعل نے مسلمان عوام کو ان سے کاٹ دیا۔ یہ غلطی اس دور کے انتہا پسند قوم پرستوں تک محدود نہیں رہی۔ بلکہ جدید دور تک قائم رہی۔ اور گاندھی جی کے احتجاجات اور پروپاگنڈے میں یہ صاف نظر آتی ہے۔ گاندھی جی کا پروپاگنڈا، ان کی ہندومت کی تبلیغ، ان کا تصور مذہب اور عام سیاسی مقاصد کی ان کی تبلیغ یہ سب چیزیں گڈمڈ ہیں۔[1]"

❋❋❋❋❋❋❋

[1] انڈیا ٹوڈے۔ از پام دت ص ۳۸۴

## آٹھواں باب

# مُسلمانوں کی جدید نسلوں کی تعلیم و تربیت

## مقاصد تعلیم

نئی پالیسی اختیار کرتے وقت سول سروس کے ایک کہنہ افسر ولیم ہنٹر نے مُسلمانوں کے مسائل کا جائزہ لیا تھا۔ تعلیم کے باب میں اس نے حکومت کو مشورہ دیا تھا۔

"مُسلمان لڑکوں کو ہمیں اپنے طریقے پر تعلیم دینا چاہیے۔ ان کے مذہب میں عدم مداخلت کے ساتھ بلکہ مذہبی فرائض کی پوری ادائیگی کے ساتھ، ہم ان کے مذہبی اخلاص اور دینی احکام کی پابندی میں ضعف اور کمزوری پیدا کر دیں گے۔ مُسلمانوں کی نوخیز نسلیں بھی اسی راستہ پر چل پڑیں گی، جس پر چل کر ہندو آج روادار بن چکے ہیں۔ ورنہ سابق میں وہ ایک انتہائی متعصب قوم تھی۔ رواداری کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے بزرگوں کی طرح اعتقادات میں متشدد نہیں رہیں گے۔ غلط مذہب کے نام پر جو بے رحمی وہ کرتے ہیں، جن جرائم کا ارتکاب وہ کرتے ہیں۔ یہ رواداری ان کو ان تمام باتوں سے رہائی دلا دے گی۔"[1]

مذکورہ بالا سفارشات کو قبول کر کے لارڈ میو وائسرائے ہندوستان نے ۱۸۷۱ء میں سابقہ تعلیمی پالیسی میں ترمیم کی۔ اب مسلمانوں کو جداگانہ اسکول اور کالج کھولنے کی اجازت دے دی گئی۔ جس سے

---

[1] Indian Musalman W. Hunter Page. 183. Lahore 1974

ایک مدت سے محروم تھے۔ اس رعایت سے فائدہ اٹھا کر سرسید احمد خان نے علی گڑھ میں جدید طرز کا کالج قائم کیا (۱۸۷۵ء) یہ کالج ۱۹۲۲ء میں مسلم یونیورسٹی بن گیا۔ یہ وہ شہرہ آفاق کالج ہے جس نے برصغیر ہند و پاکستان اور بنگلہ دیش کے مسلمانوں کی تشکیل ذہنیت اور تعمیر قومیت اور ترقی میں بہت فعال کردار ادا کیا ہے۔ مذکورہ بالا تینوں ملکوں کی جدید نسلیں اس کالج کی ساختہ پرداختہ ہیں۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مادر درس گاہ کی خصوصیات اور امتیازات پر ایک نظر ڈالی جائے۔

۱۔ اس کالج کے قیام سے جو مقصد انگریزی حکومت کے پیش نظر تھا وہ ہنٹر کے الفاظ میں یہ تھا۔

"مذہبی اخلاص اور دینی احکام کی پابندی میں ضعف اور کمزوری پیدا کرنا۔ نیز یہ کہ وہ اپنے بزرگوں کی طرح اعتقادات میں متشدد نہ رہیں۔"

علی گڑھ کالج اور دوسرے اسلامیہ کالجوں کی دوسری خدمات خواہ کتنی ہی ہوں۔ دینی پہلو میں ان کالجوں کے تعلیم یافتہ اور پروردہ طلبہ ٹھیک اسی معیار پر پورے اترے جس کی پیش گوئی ہنٹر نے پہلے ہی کر دی تھی۔ ان مدارس میں اسلام سے تعلق بڑی حد تک محض زبانی تھا۔ "ذہنی دورنگی اور منافقت کے بیج سرسید نے علی گڑھ میں بوئے تھے۔"[1]

۲۔ سرسید خود بھی بھرپور دینی تعلیم کو گوارا نہیں کرتے تھے۔ نصاب تعلیم بنانے والی کمیٹی سے انھوں نے صاف صاف کہہ دیا تھا۔

"مگر مذہبی کورس کو ایسی معتدل مقدار پر قرار دینا ضروری ہوگا جس سے انگریزی کی تعلیم میں حرج نہ پڑے۔"[2]

---

[1] Education in Pakistan Dr. Ishtiaq Hussain Qureshi p. 65

[2] تاریخ مدرسۃ العلوم علی گڑھ۔ از سید افتخار عالم مارہروی ص ۱۴۲ مسلمان علماء کی تحقیر کا آغاز بھی سید سے شروع ہوا۔ ملا کا لفظ بطور گالی کے انھوں نے استعمال کیا۔ رسالہ تہذیب اخلاق۔

۳ ۔ دینی مقاصد کے ساتھ کچھ سیاسی اور تہذیبی مقاصد بھی سرسید احمد خاں کے پیشِ نظر تھے۔ سیاسی مقاصد کا اظہار انھوں نے واضح الفاظ میں کیا ہے۔

"ہندوستان کے مسلمانوں کو سلطنت انگریزی کے لائق اور کارآمد بنانا۔" [۱]

۴ ۔ اسٹوڈنٹ یونین کلب کا افتتاح ۔ ۲۶ اگست ۱۸۸۴ء / ۱۳۰۱ھ کے موقع پر تقریر کرتے ہوئے سرسید نے زیادہ وضاحت سے سیاسی مقاصد کا تذکرہ کیا ہے۔

"اگر تم حاضرین کی خواہش یہ ہے کہ ہم قوموں میں عمدہ تعلیم پھیلے، تو سب سے عمدہ حکمتِ عملی یہ ہے کہ تم کریسنٹ اور کروس کو ملا دو۔ بعض انگریز اور بعض ہندوستانی دوست یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ ناممکن ہے مگر میرا خیال ہے کہ ایک دن ایسا ہوگا کہ دونوں اس طرح مل جائیں گے۔" [۲]

کریسنٹ کے معنی ہلال ہیں اور کروس کے معنی صلیب ہیں۔ یہ اسلام اور مسیحیت کے مخصوص مذہبی نشان ہیں۔

پہلے جملے میں تو سرسید مسلمانوں کو تاجِ برطانیہ کے لائق اور کارآمد بنانا چاہتے ہیں۔ لیکن دوسرے جملے میں تو انھوں نے غضب کر دیا۔ وہ اسلام اور مسیحیت کا نیا مرکب تیار کرنا چاہتے ہیں۔ اس اقدام کی سنگینی کو ہر قاری محسوس کر سکتا ہے۔

۵ ۔ مغربی علوم کی تحصیل کا مقصد سرسید اس طرح بیان کرتے ہیں۔

"اصلی مقصد اس کالج کا یہ ہے کہ مسلمانوں میں عموماً اور بالتخصیص اعلیٰ درجے کے مسلمان خاندانوں میں یورپین سینسز (سائنس) اور لٹریچر کو رواج دے اور ایک ایسا فرقہ پیدا کرے جو از روئے مذہب مسلمان اور از روئے خون و رنگ کے ہندوستانی

---

۱ ۔ تاریخ مدرستہ العلوم علی گڑھ ۔ از سید افتخار عالم مارہروی ۔ ص ۴۲

۲ ۔ " " " " " " " " ص ۱۲۵

ہو مگر باعتبار مذاق اور رائے و فہم کے انگریز ہوں"۔[1]

اسی نوعیت کی کوشش کے لیے نواب عبداللطیف خان صدر محمڈن لٹریری سوسائٹی کلکتہ نے یہ سوسائٹی قائم کی تھی (۱۸۶۲ء) سوسائٹی کے مقاصد وہ اس طرح بیان کرتے ہیں۔

"اونچے خاندان کے نوجوانوں کو انگریزی تعلیم حاصل کرنے پر آمادہ کیا جائے۔ ان کو روشن خیال اور رواداربنایا جائے اور حکومت کا وفادار بنایا جائے"۔

## علی گڑھ کالج کے خاص امتیازات

- ملکہ معظمہ وکٹوریہ کی سالگرہ کے مبارک دن ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کو اس کالج کا افتتاح کیا گیا۔
- کالج کا نام انگریزی میں اینگلو محمڈن اورینٹل کالج اور اردو میں مدرسۃ العلوم رکھا گیا۔
- دربار قیصری دہلی سے لوٹتے وقت لارڈ لٹن وائسرائے ہندوستان نے ۸ جنوری ۱۸۷۷ء کو کالج کے لیے عمارت کا سنگ بنیاد رکھا۔
- کالج کی عمارت کیمبرج یونیورسٹی کے نمونہ پر بنائی گئی۔
- کالج کے مونوگرام میں ہلال اور کھجور کے ساتھ تاج برطانیہ کو بھی شامل کیا گیا ہندوستان کے کسی دوسرے کالج کے مونوگرام میں تاج شامل نہیں ہے۔
- دارالاقامہ کے دروازوں پر ہلال اور تاج کندہ کرائے گئے۔ تاکہ یہ ہر دم طالب علموں کی نظروں کے سامنے رہیں۔ وفاداری کی تعلیم ملتی رہے"۔

---

[1] ایڈریس اور اسپیچیس متعلق محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ۔ از ابتدائے فونڈیشن لغایت ۱۸۹۸ء مرتبہ محسن الملک۔ دیباچہ ص ۲۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ پریس۔

- ــــــ جگہ جگہ انگریزی زبان کے مقولے اور انگریز افسروں کے نام کندہ کراتے گئے۔
- ــــــ استادوں کی غالب اکثریت انگریزوں پر مشتمل تھی۔
- ــــــ طلبا اور استادوں کے لیے مغربی لباس استعمال کرنا لازمی قرار دیا۔ برخلاف اس کے ہندو کالجوں کے اساتذہ و طلبہ انتہائی سادہ لباس پہنتے تھے۔
- ــــــ لارڈ نارتھ بروک وائسرائے ہندوستان نے اس کالج کو دس ہزار روپیہ چندہ دیا
- ــــــ ولیم میور لیفٹیننٹ گورنر یوپی نے ایک ہزار چندہ دیا۔ دوسرے انگریزوں نے چندہ دیا۔
- ــــــ آکسفورڈ (آکسن) کیمبرج (کینٹب) کے نمونہ علی گڑھ سے علیگ بنایا گیا۔ ہندوستان کی کسی یونیورسٹی کے نام کے ساتھ یہ خصوصیت نہیں ہے۔

میکالے کے بیان کردہ مقصد تعلیم۔ "اس تعلیم سے ایسا طبقہ پیدا کرنا مقصود تھا جو خون رنگ کے اعتبار سے ہندوستانی ہو، مگر مذاق رائے، اخلاق اور عقل و فہم کے نقطہ نظر سے انگریز ہو" کو حاصل کرنے کے لیے ہندوستان کے طول و عرض میں اگر کسی کالج میں دانستہ اور شعوری کوشش کی گئی تو وہ صرف اینگلو محمڈن اورینٹل کالج علی گڑھ ہے۔ مذکورہ بالا امتیازات اور خصوصیات کے حامل کالج سے تعلیم پاکر جو طالب علم نکلے وہ فی الواقع میکالے کے معیار تصور کے مطابق تھے۔ ایک طرف ہندوؤں کے کالجوں سے پکے ہندو اور سادہ مزاج طلبہ پیدا ہو رہے تھے۔ دوسری طرف علی گڑھ کالج سے کالے انگریز پیدا کیے جا رہے تھے۔

طائروں پر سحر ہے صیاد کے اقبال کا
اپنی منقاروں سے حلقہ کس رہے ہیں جال کا

## مغربی تصورات کا غلبہ

علی گڑھ کالج میں ہندوستان کے مسلمانوں کا ذہین طبقہ۔ نوخیز نسلیں جمع ہوگئیں مسٹر بیک

کالج کے پرنسپل اپنے ذاتی اثر و رسوخ کو استعمال کر کے تقریباً سارے ہی طالب علموں کو نوکری دلا دیتے تھے۔ نصف صدی قبل سرکاری ملازمت کا جو دروازہ مسلمانوں پر بند ہو گیا تھا وہ اس کالج کے طلبہ پر چوپٹ کھول دیا گیا۔ یہ ایک ایسا اشتہار تھا جس کی وجہ سے سارے ہندوستان سے طلبہ کھنچ کھنچ کر علی گڑھ کالج پہنچ رہے تھے۔

وہاں انگریزی استادوں کے زیر نگرانی تعلیم و تربیت حاصل کرتے ۔ مغربی زبان اور مغربی علوم پڑھتے۔ مغربی معاشرت اور مغربی آداب سیکھتے۔ ظاہر کی تبدیلی باطن کی تبدیلی پر منتج ہوئی۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ پسند و ناپسند کا معیار انگریزی بن گیا۔ بقول اکبر الہ آبادی۔

چیز وہ ہے جو آئے لندن سے
بات وہ ہے جو پانیر[1] میں چھپے

ہندوستان کے مسلمان معاشرہ میں مغربیت کا سیلاب علی گڑھ کالج قائم ہو جانے کے بعد آیا ہے۔ اس لیے بجا طور پر اس کو ہی ذمہ دار ٹھہرایا جاتا ہے۔ مشہور شاعر عبدالغفور نساخ کلکتوی اپنی سوانح عمری میں لکھتے ہیں۔

"۱۵ اکتوبر ۱۸۸۵ء کو تین مہینہ کی رخصت پر دہلی گیا۔ اس دفعہ جو گیا تو دیکھا کہ بعضے بعضے ہندو اور مسلمان انگریزی کپڑے پہنے ہوئے تھے۔"[2]

انگریز پرستی کے متعلق جو اس دور میں زوروں پر تھی ایک ہندو مصنف لکھتا ہے۔

the people had been hyponotized to believe in the altruism of their foreign rulers

"عوام پر ایسا افسوں کر دیا گیا تھا کہ وہ اس بات پر سخت یقین رکھتے تھے کہ غیر ملکی حکمران

---

۱۔ POINEER اس دور کا انگریزی اخبار تھا۔

۲۔ نساخ از ڈاکٹر صدرالحق۔ ص ۱۷۔ انجمن ترقی اردو۔ کراچی۔ ۱۹۷۹ء

فی الواقع ان کے حقیقی محسن ہیں "

# فکر و نظر کی تبدیلی

علی گڑھ کالج اور اسی قبیل کے دوسرے اسلامیہ کالجوں میں پڑھ کر مسلمانوں کی ایسی نسل تیار ہوئی جو اپنے اسلاف سے فکر و عمل میں یکسر مختلف ہے۔ انھوں نے انگریزی حکومت کے بنا کردہ سانچے (Frame Work) میں تربیت پائی ہے۔ ان کی عمومی خصوصیات یہ ہیں۔

- اسلام کو اور مسلمانوں کی تاریخ کو یہ قومی ورثہ قرار دیتے ہیں۔ مگر عملی زندگی میں رہنمائی کے لیے مغربی افکار و خیالات کو ضروری سمجھتے ہیں۔
- حسن عقیدت کے باوجود شریعت کی پابندی کے معاملہ میں یہ سخت کوتاہ عمل ہیں۔
- "دین کی ابتدائی معلومات کو یہ کافی تصور کرتے ہیں۔ علماء سے حصول علم کے یہ لوگ قائل نہیں — اس لیے ان کی دینی معلومات بالکل سطحی ہیں"[1]
- ان کی معراج خیال سرکاری ملازمت میں ڈپٹی کلکٹر کا عہدہ حاصل کرنا۔

- "یہ مادیت اور ظاہر پسندی کے رسیا۔ علمی دنیا ویران، ان کی زندگی خوش حال رہے خواہ قومی خدمت کی شاخ مرجھا جائے"[2]
- حاکم وقت کی وفاداری ہر حال میں ان کا شعار ہے۔
- یہ دین و دنیا کی تفریق کے مسیحی تصور کے قائل ہیں۔ یہ پرنسپل تھیوڈور بک کا سکھایا ہوا سبق ہے۔

---

[1] Education in Pakistan — Dr. Ishtiaq Hussain Qureshi

[2] موج کوثر۔ از شیخ محمد اکرام ص ۱۵۳ - فیروز اینڈ سنز۔ لاہور

۔ ـــــــــ وطنی قومیت کے مغربی تصور کے قائل بن گئے۔ اسلامی ورثہ پر فخر ہے۔

۔ ـــــــــ سیاسی اور معاشی میدان میں یہ جدید طبقہ مسلمان قوم کے مفادات کا زبردست محافظ ہے۔

۔ ـــــــــ انگریز اور ہندو دونوں کی چالوں کو بہتر طریقے پر سمجھتے ہیں۔

۔ ـــــــــ دارالعلوم علی گڑھ کے ستر سالہ دور رہنمائی اور رہبری میں مسلمانوں کے اندر ایک بھی احیائے مذہب اور اصلاح معاشرہ کی تحریک نہیں اُٹھی۔ سرسید کی اس سلسلہ میں کوششیں اوّل تو انفرادی تھیں جو ان کی ذات پر ہی ختم ہوگئی تھیں۔ دوسرے وہ احیاء مذہب کم بلکہ مرمت مذہب زیادہ تھی۔ جس کو جمہور علماء اسلام نے رد کر دیا تھا۔ دوسری طرف ہندوؤں میں اصلاح مذہب اور معاشرہ کی ایک سے زائد تحریکیں پیدا ہوئیں اور پروان چڑھیں۔

## ہندوؤں اور مُسلمانوں کی تعلیم کا فرق

انگریزی حکومت نے جدید نسلوں کی تعلیم و تربیت میں بھی اپنی حکومت کے بنیادی اصول تفریق کو پُوری طرح ملحوظ رکھا۔ ہندوؤں کو جہاں مغربی علوم و فنون کی تعلیم دی وہاں ان کو اپنے مذہب کا احیاء، سنسکرت زبان کا احیاء، اپنی تہذیب اور اپنی قوم پر فخر کرنا سکھایا۔ اسکولوں اور کالجوں کا ماحول ہندو معاشرت سے ہم آہنگ رکھا۔ انگریز اساتذہ وہ تھے جو ہندو تہذیب کے دلدادہ تھے۔ وہاں اساتذہ اور طلبہ حد درجہ سادگی پسند ہوتے تھے۔ اور ہندو لباس ہی پہنتے تھے۔ ان کے روایتی رہن سہن کو تبدیل کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ اس کے برخلاف مُسلمان نسلوں کو جدید علوم و فنون کی تعلیم کے ساتھ مذہب اسلام کی پیروی اور اطاعت میں دانستہ ضعف و اضمحلال پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ ان کے اردگرد مغربی اقوال تھے۔ سارا ماحول مغربی رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ اساتذہ اور طلبہ کا لباس خالص مغربی ہوتا تھا مغربی معاشرت اور مغربی لباس کی وجہ سے

تعلیم یافتہ مسلمان اپنے معاشرہ سے کٹ جاتا تھا۔ وہ اپنے معاشرہ پر حقارت سے نظر ڈالتا تھا۔ بقول اکبر الہ آبادی بعض تو ان میں سے اپنے باپ کو خبطی سمجھتے تھے۔ اس وجہ سے وہ اپنے مذہب سے، اپنی تہذیب سے اور اپنی معاشرت سے بیگانہ بن جاتے تھے۔

نگہ دارد برہمن کار خود را  نمی گوید بکس اسرار خود را
بمن گوید کہ از تسبیح بگذر  بدوشش خود برد زنار خود را

اس نہج پر دونوں قوموں کی جدید نسلیں مغربی درس گاہوں سے تربیت پاکر نکلیں۔

## قدیم علماء کے پیروکار

علی گڑھ میں انگریزی منصوبہ کے مطابق مسلمانوں کی جدید نسلیں تیار کی جا رہی تھیں۔ ان کے اذہان و افکار کو ایک خاص نہج پر استوار کیا جا رہا تھا۔ بلاشبہ سربرآوردہ اور آسودہ حال طبقہ ان کا ہمنوا بن گیا تھا۔ لیکن کوئی شخص اگر اس واقعہ سے یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ ساری مسلمان قوم ہی اس کے تعلیمی اور سیاسی مرکز کے گرد طواف کر رہی تھی۔ تو یہ خیال ہرگز صحیح نہیں ہے۔

وہ مسلمان جن کے ذہن و فکر کی آبیاری شاہ ولی اللہ دہلوی اور مجاہد ملت سید احمد شہید بریلوی کی رہنمائی میں ہوئی تھی۔ وہ اگرچہ جہادوں میں ناکامی کی وجہ سے کمزور اور مضمحل ہو گئے تھے۔ مگر نہ انھوں نے شکست تسلیم کی نہ وہ انگریز کے حضور سجدہ ریز ہوئے وہ عملی سیاست سے کنارہ کش ہو گئے تھے۔ مگر بدستور اپنے مسلک پر قائم رہے۔

ان کے متعلق علامہ شبیر احمد عثمانی لکھتے ہیں۔

"ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے بعد ان کو ایسی بری طرح کچلا گیا کہ مدت تک موت کی سی بیہوشی سارے ملک پر طاری رہی۔ کچھ افاقہ ہوا تو چاروں طرف مایوسی کی گھٹا چھائی ہوئی تھی"[1]

---

[1] خطبات۔ از علامہ شبیر احمد عثمانی۔ ص ۲۱۔

اس لیے یہ طبقہ شاہراہ سیاست سے کٹ کر مدرسوں میں جا پہنچا۔ وہاں اس نے قوم کے دینی اور علمی ورثہ کو محفوظ رکھنے کی سعی کی۔ خود کو اس کام کے لیے وقف کر دیا۔ مدرسہ دیوبند اور اس نوع کے دوسرے مدارس اسی غرض کے لیے قائم کیے گئے تھے۔ وہ ہزیمت خوردہ ضرور تھے مگر انھوں نے ہار ہرگز تسلیم نہیں کی۔ سرکار کے در پر جبہ سائی نہیں کی۔ عوام مسلمان بدستور اس طبقہ سے وابستہ رہے۔ انھوں نے بھی عملاً حکومت سے لاتعلقی اختیار کر لی۔ نہ انگریزی تعلیم حاصل کی۔ نہ انگریزی ملازمت اختیار کی۔ نہ انگریزی معاشرت اختیار کی۔

********

# نواں باب

# دورِ خود فراموشی

## (۱۸۶۰ء ـــ ۱۹۰۸ء)

### نئے دَور کا آغاز

گزشتہ ایک صدی سے ہندوستان کے مسلمانوں کی رہنمائی علماء کرام کر رہے تھے۔ انھوں نے انگریزی تسلط سے آزادی حاصل کرنے کے لیے تلوار کی طاقت استعمال کی۔ ایک صدی تک علم جہاد بلند رکھا۔ مگر برتر انگریزی اسلحہ کے سامنے وہ ناکام رہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد سے ہندوستانی مسلمانوں کی رہنمائی علی گڑھ کالج سے وابستہ افراد کے ہاتھوں میں آئی۔ علماء سیاست کے میدان سے دست کش ہو گئے تھے۔ تبدیلی قیادت سے طریقہ کار میں بھی تبدیلی آئی۔ توپ اور تلوار کا زمانہ ختم ہُوا۔ جدید دَور کے رہنماؤں نے رائے عامہ کی قوت استعمال کی۔ انھوں نے پہلے عوام کو بیدار کیا۔ پھر ان کی طاقت کے بل پر حکومت پر دباؤ ڈالا۔ ملک کی آزادی کا مطالبہ کیا۔ بالآخر ایک آزاد جداگانہ اسلامی ریاست پاکستان کا قیام عمل میں آیا۔

آئینی جدوجہد کے نوّے سالہ دَور کو سہولت کی خاطر ہم چار ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ان ادوار میں مسلمانوں پر بعض خاص کیفیات طاری رہی ہیں۔ مختلف ادوار سے گزر کر آخر کار وہ آزادی سے ہم کنار ہو گئے۔

| | | | |
|---|---|---|---|
| (۱) دورِ خود فراموشی | ۱۹۰۸ء | — | ۱۸۶۰ء |
| (۲) ہیجانی سیاست | ۱۹۲۴ء | — | ۱۹۰۸ء |

(۳) ناکامی و پراگندہ خیالی ۱۹۳۹ء — ۱۹۲۴ء

(۴) قیام پاکستان ۱۹۴۷ء — ۱۹۴۰ء

## پارلیمانی طرزِ حکومت کا آغاز

جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء سے انگریزی حکومت نے یہ سبق حاصل کیا کہ کاروبارِ حکومت سے عوام کو بالکل بے دخل اور غیر متعلق رکھنا خطرہ سے خالی نہیں ہے۔ اس لیے برطانوی پارلیمنٹ نے ۱۸۶۱ء میں ہندوستان کے لیے قانون مشاورت منظور کیا۔ اس کے تحت سابقہ آمرانہ اور استبدادی طور میں تبدیلی آئی۔ اور ملک میں آئینی طرزِ حکومت کا آغاز ہوا۔

۱۔ انگریزوں نے ملک میں نیابتی اور پارلیمانی نظامِ حکومت کا آغاز کیا۔ یہی وہ نظامِ حکومت تھا جس سے انگریز اپنے ملک میں واقف تھے۔

۲۔ وائسرائے کی مجلس انتظامیہ میں وسعت دی گئی۔ نصف انگریز اور نصف ہندوستانی ممبر اس میں شریک ہوتے تھے۔ اور دونوں نامزد ہوتے تھے۔

۳۔ یورپی انتظامیہ کو مجلس وضع قانون کے فرائض بھی سپرد کر دیے گئے۔

۴۔ ایسی ہی مجالس صوبوں میں بھی قائم کی گئیں۔ بمبئی، مدراس، بنگال، یوپی اور پنجاب میں۔

## ہندوؤں کی شادمانی

ہندو خاص طور پر بنگال کے ہندو نصف صدی سے زائد عرصہ سے انگریزی زبان اور انگریزی علوم پڑھ رہے تھے۔ تعلیم یافتہ افراد انگریزی اوضاع و اطوار انگریزی معاشرت، انگریزی سیاست اور طریقِ حکومت سے بخوبی واقف تھے۔ وہ جانتے تھے کہ برطانوی پارلیمانی طرزِ حکومت

دو بنیادوں پر قائم ہوتا ہے ___ وحدت ملک اور وحدت قوم۔ ہندو ملک کی غالب اکثریت ہیں۔ایک نہ ایک دن وہ ہندوستان میں قومی حکومت بنانے میں کامیاب ہوجائیں گے۔ اس لیے انھوں نے انگریزی حکومت کے آئینی اور دستوری اقدامات کا خیر مقدم کیا۔ اور ان کو اپنے لیے ایک نعمت غیر مترقبہ سمجھا۔

## مُسلمانوں میں حرکت

۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔مُسلمانوں کے خلاف انگریز کا غُصّہ ابھی تک ٹھنڈا نہیں پڑا تھا۔مُسلمانوں پر وہ کڑی نظریں رکھے ہُوئے تھا۔اس لیے مُسلمان قیادت نے خاموشی کی پالیسی اختیار کر رکھی تھی۔ آئینی اصلاحات پر اظہار خیال کرکے وہ انگریز کی ناراضگی مول لینا نہیں چاہتے تھے۔

بنگال کے مُسلمان نسبتۃً بہتر فضا میں سانس لے رہے تھے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں ان کا حصّہ بہت کم تھا۔اُنھوں نے محسوس کیا کہ اب ملک میں سیاسی عمل شروع ہو گیا ہے۔ مُسلمانوں کی کوئی آواز ہونی چاہیے۔ کوئی پلیٹ فارم ہونا چاہیے۔ نواب عبداللطیف خاں نے ۱۸۶۳ء میں کلکتہ میں مُسلمانوں کی ایک تنظیم محمڈن لٹریری سوسائٹی قائم کی۔جسٹس سید امیر علی نے بھی ایک انجمن قائم کی (سینٹرل محمڈن نیشنل ایسوسی ایشن) اس طرح انجمن بن گئی اور پلیٹ فارم تیار ہو گیا۔ اس کے مقاصد حسب ذیل تھے۔

۱۔ مسلمانوں کی فلاح اور بہبود کے لیے کام کرنا۔

۲۔ ماضی کی شاندار روایات سے استفادہ کرنا۔

۳۔ زمانہ کے ترقی پذیر رجحانات کے ساتھ ہم آہنگی پیدا کرنا۔

اس کے بعد شمالی ہندوستان میں بھی سر سید احمد خان نے ایک انجمن قائم کی۔ برٹش انڈین ایسوسی ایشن۔ اس کے مقاصد میں یہ بات شامل تھی کہ ہندوستانی اپنے حقوق حاصل کرنے

کے لیے برطانوی پارلیمنٹ سے رابطہ اور تعلق قائم کریں۔ گویا اس طرح مسلمانوں میں کس قدر بیداری پیدا ہوئی۔

## حکومت خود اختیاری

۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے بعد انگریزی حکومت نے عوام پر نئی نئی پابندیاں عائد کیں۔ جن سے وہ ناواقف تھے۔ نئے نئے ٹیکس لگائے گئے جن کا انھوں نے نام بھی نہیں سنا تھا۔ نئے نئے قوانین نافذ کیے گئے۔ مثلاً قانون اسلحہ کے تحت بندوق رکھنے کے لیے پہلے اجازت (لائسنس) لینا ضروری ہو گیا۔ اسٹامپ ایکٹ نافذ ہوا۔ انصاف حاصل کرنے کے لیے فیس دینا پڑتی تھی۔ پولیس کا نیا محکمہ کھولا گیا تھا جس میں رذیل لوگ بھرتی ہوتے تھے۔ وہ مظالم کرتے تھے۔ ان وجوہات کی بنا پر عوام میں بے چینی بڑھنے لگی۔

بے چینی کے معاملہ میں حکومت اب بہت حساس ہو گئی تھی۔ وہ ان حالات سے گھبرا گئی۔ لندن کی حکومت نے اس کا نوٹس لیا۔ بے چینی ختم کرنے کے لیے حکومت نے ملک میں آئینی اصلاحات کی نئی قسط نافذ کی۔ لوکل سیلف ایکٹ ۱۸۸۲ء کے ذریعے انگریزی حکومت نے ہندوستان میں پارلیمانی نظام حکومت کی بنیاد رکھ دی۔ اس قانون کے تحت بڑے شہروں میں میونسپل کونسل اور اضلاع میں ڈسٹرکٹ کونسل قائم کی گئیں۔

۱۔ نمائندوں کے انتخاب کے لیے مخلوط حلقے قائم کیے گئے جس میں ہندو اور مسلمان دونوں مل کر ایک اُمیدوار کو منتخب کرتے تھے۔

۲۔ انتخابات براہِ راست ہوتے تھے۔

یہ قانون نیابتی طرزِ حکومت کا پہلا سنگِ میل ہے۔ اس قانون کے تحت جب ملک میں انتخابات ہوتے تو مسلمان رہنماؤں کے خطرات اور اندیشے بالکل درست ثابت ہوئے۔ مسلمانوں کے اکثریتی حلقوں میں بھی مسلمان اُمیدوار کامیاب نہ ہو سکے۔

تنگ دل ہندوؤں کی اکثریتی حکومت میں مسلمانوں کے مذہب ان کی تہذیب کا جو حشر ہونے والا تھا

وہ اب ہر چشم بینا کو نظر آنے لگا تھا آئندہ مسلمانوں کی ہر چیز ہندو اکثریت کے رحم و کرم پر ہوگی۔

بالآخر سرسید احمد خاں نے زبان کھولی۔ ایکٹ کے خلاف تقریر کرتے ہوئے ۱۸۸۲ء میں انھوں نے کہا۔

"جب تک قوم اور مذہب کے اختلاف اور ذاتوں کا امتیاز ہندوستان کی سوشل اور پولیٹکل حالت میں ایک جزو اعظم رہے گا اور ان معاملات میں جو ملک کے انتظام اور بہبودی سے بیشتر متعلق ہیں، ان کے باشندوں پر اثر ڈالے گا، اس وقت تک الیکشن کا خالص قاعدہ طمانیت کے ساتھ جاری نہیں کیا جاسکتا۔ بڑی قوم چھوٹی قوم کے مطالب پر بالکل غالب آجائے گی۔"[1]

اس تقریر میں مسلمانوں کو پہنچنے والے نقصانات اور مستقبل کے خطرات اور اندیشے پہلی مرتبہ حکومت پر واضح کیے گئے۔ اس مخلوط طریقہ انتخاب کی سرسید نے علانیہ مخالفت شروع کردی۔

علم سیاست کے مشہور انگریزی ماہر بال برلی (۱۸۳۸-۱۹۰۳) نے بھی ان اقدامات پر تنقید کی ہے۔ وہ لکھتا ہے۔

"ہندوستان میں بعض ایسے (سیاسی) طریقوں کو رواج دیا جارہا ہے جو جدید یورپی جمہوریت سے مستعار ہیں اور جو مشرقی لوگوں کے لیے قطعی طور پر غیر مناسب اور ان میں بے جوڑ ہیں۔"[2]

## اکثریت اور اقلیت کا تصادم

مغربی طرز جمہوریت کا ایک اثر یہ مرتب ہوتا ہے کہ عددی اکثریت والے گروہ کو عددی اقلیت والے گروہ پر فوقیت، اور حاکمیت عطا کردیتا ہے۔ اس جمہوریت میں حاکم گروہ اور مخالف گروہ کا پیدا ہوجانا ایک لازمی امر ہے جن ملکوں میں ایک نسل، ایک زبان اور ایک مذہب ہو وہاں حزب موافق اور حزب مخالف کا فرق عارضی اور غیر اہم ہوتا ہے لیکن جن ملکوں میں زبان، نسل اور مذہب کے اختلافات موجود ہوں وہاں فریقین کا اختلاف مستقل اور دوامی ہوتا ہے۔ وہاں جمہوریت کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ ایک مذہبی عددی اقلیت دائماً محکوم اور مقہور رہے۔ "دراصل جمہوری

---

[1] خطبات سرسید احمد خاں۔ جلد اول۔ ص ۱۴۱۔ مجلس ترقی ادب۔ لاہور۔ ۱۹۷۵ء

[2] ڈیموکریسی اینڈ لبرٹی ص ۲۵۰

حکومت کے معنی یہ ہیں کہ اکثریت اقلیت کو ڈرا کر اور دھمکا کر اپنے قابو میں رکھنا چاہتی ہے"[2] ——— پھر چونکہ حاکمیت اعلیٰ پارلیمان کے ہاتھ میں ہوتی ہے اس لیے اکثریت اقلیت کے لیے جو قانون چاہے پاس کر دے اقلیت کا مذہب، اس کی تہذیب اس کی معاشرت کوئی چیز محفوظ نہیں رہتی[1]۔ آج کل ساری دنیا میں جمہوریت کا غلغلہ بلند ہے۔ اس لیے ساری دنیا میں ہی اقلیت اور اکثریت کا تنازعہ برپا ہے جو ملی اور قومی وحدت کو اندر سے پارہ پارہ کرتا رہتا ہے۔

بہرکیف ہندوستان میں اکثریت کی سیاست کا اصول رائج کر کے انگریزوں نے ہندوؤں کی بہت بڑی خدمت کی ہے۔ انگریز رہے یا جائے ملک کی حکومت ہندوؤں کو ملنی ہے۔ اس اصول نے سیاسی انقلاب برپا کر دیا۔ مسلمان جو کل تک حاکم تھے اب ان کے لیے مقدر ہو گیا کہ وہ محکوم بن کر رہیں۔ ہندو اپنے سامنے روشن مستقبل دیکھتے تھے اور مسلمان تاریک مستقبل دیکھتے تھے۔

## کانگریس کا قیام

ان آئینی اصلاحات سے متمول اور پڑھے لکھے لوگوں کی تسلی ہوئی ہو تو خیر ورنہ عوام الناس جو مختلف پابندیوں اور ٹیکسوں کے بوجھ کے تلے دبے چلے جا رہے تھے، ان کو کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ بے چینی کی لہر بدستور ان میں بڑھتی رہی۔ انگریزی حکومت بے چینی سے بہت گھبراتی تھی۔ حکومت نے خیال کیا کہ کونسلوں میں چند افراد کے اظہار خیال کرنے سے دل کا

---

[1] اسلامی حکومت میں بنیادی حقوق کا دائرہ وسیع ہے۔ جان، مال، عزت اور مذہب کی آزادی کے ساتھ وہ تہذیب اور ثقافت کو بھی محترم مانتی ہے اور تحفظ عطا کرتی ہے۔ ان حقوق پر کوئی مسلمان حکومت دست درازی نہیں کر سکتی۔ پھر بنیادی حقوق کے معاملہ میں اقلیت و اکثریت کا کوئی مسئلہ نہیں۔ اگر ایک فرد ہے تو وہ بھی اپنے حقوق سے متمتع ہونے کا حق رکھتا ہے۔ مسلمانوں نے اپنے دورِ حکومت میں ملت کا نظام نافذ کیا۔ جس میں اقلیتوں کو ہر طرح کا تحفظ حاصل تھا۔

[2] پنڈت جواہر لال نہرو۔ میری کہانی۔ جلد دوم ص ۴۵۵

غبار دُور نہیں ہو سکتا۔ عوام الناس کے پاس ایک پلیٹ فارم ہونا چاہیے۔ جہاں جمع ہو کر وہ اظہار خیال کریں۔ اپنے دل کا غبار نکال سکیں۔ حکومت کو اپنی شکایات اور تکالیف بتائیں۔ تاکہ حکومت شکایات کے ازالہ کی تدبیر کرے۔ اس طریقہ سے حکومت کو عوام کے دل کی باتیں معلوم ہوتی رہیں گی۔ اس بہانہ سے دلوں میں غبار جمع نہیں ہوگا۔ کہ لاوا بن کر پھٹنے کی نوبت آئے۔

ان گوناگوں فوائد کو حاصل کرنے کے لیے لارڈ ڈفرن وائسرائے ہندوستان[1] نے سول سروس کے ایک سینئر افسر مسٹر ہیوم Allan Hume کو اشارہ کیا کہ وہ ہندوستانیوں کی ایک انجمن تشکیل کرے۔ ۱۸۸۵ء میں سربرآوردہ ہندوؤں کا ایک اجلاس مسٹر ہوم نے پونا میں طلب کیا اور وہاں All India National Congress کی تشکیل عمل میں آئی۔ دوسرے سال (۱۸۸۶ء) میں کانفرنس کے تمام شرکا کو لارڈ ڈفرن نے گورنمنٹ ہاؤس کلکتہ میں دعوت دی تیسرے سال (۱۸۸۷ء) مدراس کے گورنر نے شرکا کانفرنس کی دعوت کی[2]

مسٹر ہیوم نے اس کا نام آل انڈیا نیشنل کانگریس رکھا۔ اس کا پہلا اجلاس ۲۸ دسمبر ۱۸۸۵ء کو مسٹر ہیوم کی صدارت میں ہُوا۔ اور ایک عرصہ تک سول سروس کے انگریز اس کے صدر بنتے رہے۔ اور وہی اس کی پالیسیاں ترتیب دیتے تھے۔ عام طور پر سب سے پہلا ریزولیشن برطانوی حکومت کی وفاداری کے اظہار پر مشتمل ہوتا تھا۔ لالہ لاجپت رائے اس کے متعلق لکھتے ہیں۔

"یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ کانگریس اس لیے قائم کی گئی تھی کہ برطانوی شہنشاہیت کو پیش آمدہ خطرات سے محفوظ رکھا جائے۔ نہ کہ اہل ہند کو آزادی دلانے کے لیے"[3]

درحقیقت کانگریس انگریزوں کے ہاتھوں میں ایک کھلونا تھی۔ بقول لاجپت رائے۔ ۱۹۰۵ء تک کانگریس کو قومی مسائل (سیاسی) سے کوئی دلچسپی نہیں تھی[4] بہرکیف آل انڈیا

---

[1] [2] Young India — By Lajpat Rai, Lahore 1927 P 131 P 147

[3] [4] Young India — By Lajpat Rai P 134

* اس اجلاس میں ۷۲ مندوبین نے شرکت کی مسلمان صرف دو تھے۔

نیشنل کانگریس نے ہندوؤں کی من حیث القوم بہت خدمات انجام دیں۔

۱۔ آل انڈیا نیشنل کانگریس قائم کر کے انگریزوں نے ہندوؤں کے اندر ایک قوم ——— قومی وحدت ——— کا شعور پیدا کیا۔ سارے ملک میں اس انجمن کی شاخیں قائم کی گئیں۔ اور ہر جگہ پس پردہ سرکاری حمایت اس کو حاصل رہی۔ اس طرح ملک کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے ہندوؤں کے اندر ایک قوم ہونے کا تصور جاگزیں کیا گیا۔ ورنہ اس سے قبل ہندوؤں کے اندر ملکی پیمانہ پر قومی وحدت ان کے اندر مفقود تھی۔ وہ جاتیوں کے بندھنوں میں جکڑے ہوئے تھے۔ اپنی جات کے باہر نہیں دیکھتے تھے۔ کانگریس نے ان کو ہندوستان گیر قومی وحدت کا تصور عطا کیا۔ یہ انتہائی اہم خدمت ہے جو انگریزوں نے انجام دی ہے۔

۲۔ اس انجمن کو قائم کر کے انگریزوں نے سیاسی اور پارلیمانی امور میں ہندوؤں کی تربیت کی اور آنے والے دور کے لیے ان کو تیار کیا۔

۳۔ کانگریس کی شکل میں ایک ادارہ وجود میں آگیا جس کے ذریعہ ہندوؤں اور سول سروس کے افسروں کے درمیان باقاعدہ اور سالانہ رابطہ قائم ہو گیا اور پھر بالواسطہ وائسرائے ہندوستان سے بھی واسطہ قائم ہو گیا۔ کانگریس نے ہندو جاتی کا حکومت وقت سے تعلق قائم کر دیا۔ دنیا میں کوئی دوسری مثال نہیں مل سکتی کہ غیر ملکی حاکمان وقت نے خود پبلک کو سیاسی امور میں تربیت دی ہو۔

۴۔ کانگریس کے قیام کے دو سال بعد ۱۸۸۷ء میں سول سروس کی ملازمت کے دروازے ہندوستانیوں پر بھی کھول دیے گئے۔ یعنی اب ہندوؤں کو براہ راست حکومت کے اعلیٰ مناصب پر فائز ہونے کے مواقع حاصل ہو گئے۔

## سرسید کی مخالفت

۱۔ کانگریس نے اور بالواسطہ انگریزوں نے مسلمانوں کو نظر انداز کر دیا۔ مسلمان ہندوستان کی دوسری بڑی قوم ہیں۔ جب کل ہند پیمانہ پر ایک انجمن تشکیل دی جا رہی تھی تو منتظمین

اور ذمہ دار لوگوں کا فرض تھا کہ وہ مسلمانوں کو بھی بحیثیت قوم اس میں شرکت کی دعوت دیتے مسلمانوں کے ذمہ دار رہنماؤں سے گفتگو کرتے۔ ان کو اعتماد میں لیتے۔ ہندوؤں نے ایسی کوئی کوشش نہیں کی۔ اپنے طور پر دو چار غیر معروف قسم کے مسلمانوں کو اجلاس میں شریک کر لیا۔ اور اپنے طور پر یہ اطمینان کر لیا کہ مسلمان بھی کانگریس میں شریک ہو گئے۔

۲۔ کانگریس نے اپنے اجلاس میں ایک قرارداد کے ذریعے حکومت سے مطالبہ کیا کہ وہ ہندوستان میں خالص پارلیمانی اور نیابتی طرز حکومت نافذ کرے۔ اس قسم کا مطالبہ کرنے سے قبل ہندو رہنماؤں کا فرض تھا کہ وہ پہلے مسلمان رہنماؤں سے سیاسی مفاہمت کرتے مسلمانوں کے اندیشے اور خطرات دور کرتے اور ان کو مطمئن کرتے۔ اس کے بعد ہی اس قسم کا مطالبہ کرنا درست ہو سکتا تھا موجودہ صورت میں یک طرفہ مطالبہ کرنا درحقیقت مسلمانوں کو نظر انداز کرنے کے مترادف تھا۔

۳۔ یہ اندیشے اور خطرات وہمی یا ظنی نہیں تھے۔ بلدیاتی انتخابات کے نتائج مسلمان دیکھ چکے تھے۔ رائے دہندہ کے لیے پانچ ہزار روپیہ کی ملکیت کا حامل ہونا ضروری تھا۔ اس شرط کی وجہ سے مسلمان رائے دہندوں کی تعداد بہت کم ہو گئی۔ پھر طریقہ انتخاب بھی مخلوط تھا۔ ان وجوہات کی بنا پر علی گڑھ جیسے خالص مسلمانوں کے علاقہ میں بھی کوئی امیدوار منتخب نہ ہو سکا تھا۔ ان دونوں شرطوں کو برقرار رکھنے کے صاف معنی یہ تھے کہ انتخاب کے میدان میں مسلمانوں کو پیچھے دھکیلا جا رہا تھا جس طرح اس سے قبل تعلیم کے میدان اور ملازمتوں کے میدان میں ان کو پیچھے دھکیلا گیا تھا۔ ان اسباب کی بنا پر سرسید احمد خاں کو یقین ہو گیا تھا کہ کانگریس کے عزائم مسلمانوں کے متعلق اچھے نہیں ہیں۔

۱۸۸۷ء میں کانگریس نے سرسید کو اجلاس میں شرکت کی دعوت دی اس کے جواب میں سرسید نے صدر کانگریس کو ایک خط لکھا۔

"میں نیشنل کانگریس کا مفہوم سمجھنے سے قاصر ہوں۔ کیا یہ فرض کر لیا گیا ہے۔ کہ ہندوستان

ہیں مختلف ذاتیں، فرقے اور مذاہب کے افراد بستے ہیں وہ ایک قوم کے افراد بن یا ایک قوم بن سکتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ بالکل ناممکنات میں سے ہے۔ اور جب یہ ناممکن ہے تو پھر نیشنل کانگریس کے نام کی بھی کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔ اور نہ یہ اس ملک میں بسنے والی تمام قوموں کے لیے سود مند ہو سکتی ہے۔"[1]

اس کے بعد سرسید نے کانگریس کی مخالفت میں لکھنؤ (۱۶ مارچ ۱۸۸۷ء) اور میرٹھ (۲۸ دسمبر ۱۸۸۷ء) میں تقریریں کیں۔ جن میں مخلوط طریقہ انتخاب کو ہندوستان کے لیے ناموزوں قرار دیا۔ جہاں ایک سے زائد قومیں آباد ہیں۔ انھوں نے کانگریس کی کھل کر مخالفت کی۔ اور مسلمانوں کو اس میں شرکت کرنے سے منع کیا۔ انھوں نے کہا۔

"اس میں (ہندوستان) ہندو اور مسلمان اور کئی دوسری قومیں آباد ہیں اور انگلستان کی مختلف اقوام کی طرح مل جل کر ایک نہیں بن گئیں ہیں۔ اس لیے یہاں یہ طریقہ انتخاب ناموزوں ہے۔ کانگریس کی یہ تجویز ایسے ملک کے لیے جہاں دو مختلف قومیں رہتی ہوں مناسب نہیں۔ نہایت بداندیشی کی تجویز ہے۔ ایک کی دوسرے سے عداوت پیدا کر دینا ہے۔ نہ دین کے لیے مفید ہے، نہ ملک کے لیے، نہ شہر کے لیے"[2]

سرسید کی مخالفت کی ایک وجہ اور بھی تھی۔ وہ مسلمانوں کے سیاست میں در آنے کو مصلحت وقت کے خلاف سمجھتے تھے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"یاد رکھو، گورنمنٹ تم پر نہایت سخت نظر رکھے ہوتے ہے۔ کیوں؟ کہ تم بڑے مفسد، بڑے بہادر، بڑے سپاہی اور بڑے لڑنے والے ہو۔"[3]

---

[1] حیات جاوید، خواجہ الطاف حسین حالی [2] سرسید کے لیکچر۔ ص ۳۰۱۔

[3] سرسید کے لیکچر۔ ص ۲۱۸۔

سرسید کی مخالفت کرنے سے ایک فائدہ ضرور ہُوا کہ مُسلمان ہندو لیڈروں کے زیرِ قیادت آنے سے بچ گئے۔ ہندو قوم میں ضم ہونے سے بچ گئے۔ مسلمانوں کی انفرادیت بہرکیف برقرار رہی۔ ان کا انفرادی تشخص محفوظ رہا۔ اور یہ کوئی کم فائدہ نہیں ہے۔

بعض لوگ سرسید کی مخالفت کو انگریز کے اشارے پر اور انگریز کی خوشامد پر محمول کرتے ہیں۔ یہ نادان لوگ ہیں۔ ان بیچاروں کو یہ خبر نہیں ہے کہ اس زمانہ میں کانگریس بھی خوشامدیوں کا سب سے بڑا ٹولہ تھا۔ کانگریس کے ہر اجلاس میں پہلا ریزولیشن اس مضمون کا پاس کیا جاتا تھا۔

"ہم اعلان کرتے ہیں کہ ہم ریڑھ کی ہڈی تک انگریز کے وفادار ہیں"

انگریز تو اس دور میں کانگریس کا حامی اور سرپرست تھا۔ اس دور میں کانگریس کی مخالفت کرنا تو درحقیقت انگریز کی ناراضگی مول لینا تھا۔ ان حالات میں تو سرسید کا اقدام ایک جرأت مندانہ مظاہرہ تھا۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ انگریز کے مقابلہ میں وہ کیسا ہی مؤدبانہ اور مرعوبانہ رویہ رکھتے ہوں مگر ہندو کی بالادستی اور ماتحتی قبول کرنے کو وہ ہرگز تیار نہیں تھے۔

## مزید اختیارات کی قسط

۱۸۹۲ء میں لینس ڈاؤن وائسرائے ہندوستان کے زمانہ میں اہلِ ہند کو مزید آئینی اختیارات دیے گئے۔

- مرکزی اور صوبائی کونسلوں کے ممبران کی تعداد میں اضافہ ہُوا۔
- غیر سرکاری ممبروں کو اجلاس میں سوالات دریافت کرنے کا حق ملا۔
- انتخابات کا طریقہ حسبِ سابق مخلوط رہا۔

ان اصلاحات کے بعد ۱۸۹۳ء کے انتخابات میں بھی مسلمان امیدواروں کا وہی حشر ہُوا جو اس سے قبل میونسپل اور ڈسٹرکٹ کونسلوں کے انتخابات میں ہو چکا تھا۔ سرسید کے اندیشے

جو درست ثابت ہوئے۔ اس انتخاب میں بھی ہندوؤں کو غیر معمولی غلبہ حاصل ہوا۔

## جداگانہ انتخاب

اس مرتبہ سرسید نے مخلوط انتخاب کی صرف مخالفت ہی نہیں کی بلکہ متبادل تجاویز بھی پیش کیں۔ ان میں سے ایک تجویز یہ تھی۔

"وائسرائے کی کونسل میں ایک معین تعداد سے ہندو ہوں اور مسلمان ہوں۔ ہندو ممبر کو ہندو منتخب کریں اور مسلمان ممبر کو مسلمان۔ اور یہ بھی فرض کرتا ہوں کہ دونوں کی تعداد مساوی ہو"

یہی وہ تجویز ہے جس کو بعد میں جداگانہ انتخاب کا نام دیا گیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جداگانہ انتخاب کی تجویز سرسید نے پیش کی تھی۔

## قدیم علماء کا طرزِ عمل

۱۔ پچھلے جہادوں میں علماء اور ان کے پیروکار انگریزوں کے خلاف برسرِ جنگ رہے تھے۔ اس لیے انگریز دشمنی ان کے رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے تھی۔

۲۔ سرسید احمد خان نے اور جدید نسل نے مغربی تعلیم کو قبول کر لیا تھا۔ وہ انگریز کے ساتھ تعاون کر رہے تھے۔ یہ بات ان علماء کے نزدیک سخت ناگوار تھی۔ اس لیے علماء کی اکثریت سرسید سے، دارالعلوم علی گڑھ سے، اور جدید تعلیم یافتہ نسل سے نفرت کرتی تھی۔

۳۔ طبقہ علماء کی ایک کمزوری تھی۔ یہ خانقاہوں اور مدرسوں سے گوشہ گیر تھے۔ یہ اس ہند کو جانتے تھے جو ۱۸۵۷ء میں ان کے ساتھ جنگ میں شریک تھا۔ اس عرصہ میں ہندو دل میں جو غیر معمولی تبدیلیاں آگئی تھیں ان سے یہ بے خبر تھے۔ انگریزوں نے قومی اور سیاسی تعلیم ان کو دی تھی۔ جدید مصلحین نے ان کے اندر ایک نئی روح پھونک دی تھی وہ اب مذہب

کا ایک جارحانہ تصور رکھتے تھے۔ مسلمانوں سے کھلم کھلا نفرت کی اشاعت کرتے تھے۔ ان علما کا ہندوؤں سے کوئی تصادم نہیں تھا۔ نہ ملازمت میں نہ انتخابات میں۔ یہ عملی زندگی سے کٹ کر گوشہ گیر ہوگئے تھے۔ ان وجوہ سے وہ ہندو سے حسن ظن رکھتے تھے۔

البتہ علما۔لدھیانہ کا معاملہ ذرا مختلف ہے۔ فتح پنجاب (۱۸۴۸ء) سے قبل تک برطانوی ہندوستان کی سرحد لدھیانہ تک تھی۔ یہاں فوجوں کی چھاؤنی تھی۔ اور یہاں انگریز ریذیڈنٹ رہتا تھا۔ جنگ افغان کے بعد کابل کے حکمرانوں میں سے بعض افراد کو یہاں نظر بند رکھا گیا تھا۔ زمان شاہ بادشاہ کابل یہاں نظر بند تھا۔ وہ نابینا تھا۔ مولانا عبدالقادر لدھیانوی (۱۸۶۰ - ۱۷۹۱ء) کی مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھتا تھا بلکہ اذان دیتا تھا۔ اس لیے علما۔لدھیانہ کے یہاں انگریز دشمنی کا جذبہ کچھ زیادہ ہی شدید تھا مولانا عبدالقادر کے بیٹے مولانا محمد لدھیانوی نے جہاد ۱۸۵۷ء کے فتویٰ پر بھی دستخط کیے تھے۔

سرسید کی زیر قیادت جب جدید تعلیم یافتہ طبقہ کانگریس کی مخالفت کر رہا تھا علما۔لدھیانہ کانگریس کی تائید کر رہے تھے۔ انھوں نے کانگریس کی شرکت کے جواز پر ایک فتویٰ شائع کیا تھا۔[1] جس پر ہندوستان اور عرب کے سو علما۔ کے دستخط ثبت تھے۔ اور سرسید کی جماعت "محب وطن ہندوستانیوں کی انجمن" Patriotic India Association میں شرکت کی مخالفت کی گئی تھی۔ یہ فتویٰ نصرۃ الابرار کے نام سے شائع ہوا تھا۔ اس فتویٰ کا محرک محض سرسید کی دشمنی تھا۔

## ہندو قوم پرستوں کے اقدامات

۱۔ **ہندی سرکاری زبان**:۔ انگریزی نوازشات سے تقویت پاکر ہندوؤں کے رہنما ایسے اقدامات کر رہے تھے جن سے قوم پرستی کو تقویت ملتی تھی۔ ایسے بیشتر اقدامات

---

[1] چند حریت۔ از مولانا محمد خلیل اللہ ربانی۔ ص ۷۷۔ طبع خیر پور پریس۔ سندھ۔ نیز تحریک آزادی میں اردو کا حصہ۔ از ڈاکٹر معین الدین عقیل۔ ص ۳۱۹۔ انجمن ترقی اردو۔ کراچی ۱۹۷۶ء

...مانوں کے خلاف ہوتے تھے۔ ان میں سرفہرست ہندی زبان کی ترویج ہے۔ اور اُردو زبان کو خارج البلد کرنا ہے۔

موجودہ ہندی زبان کی تخلیق اور تشکیل مستشرقین کی زیر نگرانی فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں ۱۸۰۴ء میں ہوئی ہے۔ انگریز مستشرقین خاص طور پر پادریوں کی سرپرستی میں ہندی زبان کی تحریک نے فروغ پایا۔ جان بیمز John Beames اور گروز Grose نے شدھ (خالص) ہندی لکھنے کی تحریک کی اشاعت کی۔ ۱۸۵۷ء تک صرف انگریز پادری شدھ ہندی لکھتے تھے۔ اس کے بعد ہندو حمیت پسندوں نے اس تحریک کو اپنالیا۔ راجہ شیو پرشاد اور راجہ لکشمن سنگھ اور بابو ہریش چندر نے اس سنسکرت زدہ ہندی کو رواج دینے کی مقدور بھر کوشش کی۔

اس کے بعد ان کی یہ خواہش ہوئی کہ یہ شدھ ہندی صوبوں کی سرکاری زبان بن جائے۔ اس وقت تک اُردو کو صوبوں میں سرکاری زبان کی حیثیت حاصل تھی۔ سب سے پہلے بنارس کے ہندوؤں نے اُردو کی جگہ دیوناگری رسم الخط رائج کرنے کا مطالبہ کیا۔ سرسید کو ہندوؤں کے اس اقدام سے سخت تکلیف پہنچی جس کا اظہار انھوں نے اپنے دوست مسٹر شیکسپیئر سے کیا۔ پیرس فرانس میں بیٹھے ہوئے اُردو زبان کے محقق گارساں دتاسی نے بھی ہندوؤں کے اس اقدام کو بُرا محسوس کیا۔ ہندو ذہنیت کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے۔

> "ہندو اپنے تعصب کی وجہ سے ہر اس امر کے مزاحم بن رہے ہیں۔ جو ان کو مسلمانوں کی حکومت کا زمانہ یاد دلاتے ہیں"[1]

سرکاری زبان کی تبدیلی ایک اہم مسئلہ ہے۔ اور یہ کام درحقیقت مرکزی حکومت کے دائرہ کار میں آتا ہے۔ مگر ستم ظریفی دیکھیے ایک معمولی کلکٹر نے اتنا بڑا کام کر ڈالا۔ انھوں نے میکڈانلڈ نے بحیثیت کلکٹر بہار میں ہندی زبان اور کیتھی رسم الخط رائج کرنے کا حکم نامہ جاری کر دیا۔ پھر جب

---

[1] حیات جاوید۔ از الطاف حسین حالی۔ ص ۱۹۷۔

وہ صوبہ یوپی کا لیفٹیننٹ گورنر بن کر آیا تو یہاں بھی اس نے ہندی زبان اور دیوناگری رسم الخط کو حکماً رائج کر دیا۔ (۸ ۔ اپریل ۱۹۰۰ء) حالانکہ یوپی اُردو کا گہوارہ ہے۔

اس زمانہ میں سرسید کا انتقال ہو چکا تھا (۱۸۹۸ء) حکومت کے اس اقدام سے جو اضطراب مسلمانوں میں پیدا ہوا تھا۔ اس سے اثر لے کر نواب محسن الملک معتمد علی گڑھ نے احتجاج کرنا ۔ با۔ گورنر نے کالج کی امداد بند کر دینے کی دھمکی دی۔ بیچارہ نواب خاموش ہو کر رہ گیا۔ بہار اور یوپی میں جس طرح ہندی زبان کو رائج کیا گیا[1] اس سے صاف نظر آتا ہے کہ سب کچھ حکومت کے اشارے پر ہو رہا تھا۔

**۲۔ گنپتی پوجا:** مشہور ہندو قوم پرست لیڈر بال گنگا دھر تلک نے ۱۸۹۳ء میں گنپتی دیوتا کی پوجا کی رسم جاری کی۔ اس کو میلہ کی شکل دی۔ گنپتی مورتی کا جلوس شاندار طریقے سے نکالا جاتا ہے۔ اس کو مسلمانوں کے تعزیہ کے نمونہ پر ترتیب دیا جاتا ہے اور اس کے ذریعے مذہبی جذبات اور مسلمانوں سے نفرت کو بھڑکایا جاتا ہے۔

**۳۔ شیواجی:** تلک نے شیواجی مرہٹہ کو ہندو جاتی کے قومی رہنما کے طور پر پیش کیا۔ ہر سال شیواجی کی یاد منائی جاتی ہے جلسے جلوس نکالے جاتے ہیں۔ اس پروگرام میں مسلمان بادشاہوں خاص طور پر اورنگ زیب کی مذمت کی جاتی ہے۔ اس طرح نئی نسلوں کے ذہنوں کو مسلمانوں کی نفرت اور عداوت سے مسموم کیا جاتا ہے۔

**۴۔ گئو پوجا:** تلک نے گئو رکھشا (گائے کی حفاظت) کے نام سے سارے ملک میں انجمنیں اور ادارے قائم کیے۔ گئوپال کے نام سے باڑے بنائے گئے جہاں گایوں کی نگہداشت ہوتی ہے۔ گاؤ کشی کو بجبر روکنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ ساری مہم بھی

---

[1] پرنول چیڑجی (۱۹۰۸ء-۱۸۴۸ء) نے قیام لاہور کے زمانہ میں اُردو کو پنجاب کی سرکاری زبان بنانے کی مخالفت کی تھی۔ قاموس المشاہیر جلد اول ص ۱۵۰

درحقیقت مسلمانوں کے خلاف ہے۔

۵۔ مسجد کے سامنے باجا:۔ ہندوؤں کی جارحانہ ذہنیت اس قدر بڑھ گئی کہ انھوں نے مسجدوں کے سامنے عین نماز کے اوقات میں گاتے بجاتے گزرنا شروع کیا محض مسلمانوں کو تنگ کرنے کے لیے۔ مسلمان مزاحمت کرتے تھے۔ اس طرح ہندو مسلمان فسادات کا آغاز ہوا۔ آئے دن بڑے بڑے شہروں میں یہ فسادات ہوتے تھے۔

جدید قوم پرستی نفرت اور عداوت سے غذا پاکر پروان چڑھتی ہے۔ تصادم اور ٹکراؤ سے قوی ہوتی ہے۔ ہندو رہنماؤں نے یہ تمام طریقے اختیار کیے اور ہندو قومیت کو مستحکم کیا۔

۶۔ فوجی تربیت:۔ فتنہ و فساد میں حصہ لینے کے لیے ضروری تھا کہ ہندو نوجوانوں کو فوجی تربیت دی جائے۔ اس کے لیے اکھاڑے قائم کیے گئے۔ جہاں جسمانی ورزش اور عسکری تربیت دی جاتی ہے۔ اس قسم کے اکھاڑے سارے ملک میں قائم کیے گئے۔ شاید ہی کوئی شہر ہو جہاں ہندو سبھا اور ہندو اکھاڑے نہ ہوں۔ جہاں ہندو نوجوان جسمانی ورزش کرتے تھے۔ لکڑی، تلوار، خنجر چلانے کی مشق کرتے تھے۔ عسکری تربیت کا یہ سلسلہ ۱۹۰۵ء سے شروع ہو گیا تھا۔[۵] بعد میں راشٹریہ سیوک سنگھ جیسی انجمنیں ان کاموں کی سرپرستی کرتی رہیں۔ یہاں لاکھوں ہندو نوجوان فوجی تربیت حاصل کرتے تھے۔

## مسلمانوں کا وفد شملہ

ہندوؤں کی ہنگامہ کن سیاست سے متاثر ہو کر انگلستان کی ٹوری پارٹی نے اعلان کیا کہ برطانوی حکومت ہندوستان میں مزید سیاسی اصلاحات نافذ کرنا چاہتی ہے۔ اس کے بعد مسلمان زعماء کو خیال آیا کہ اس موقعہ پر مسلمانوں کو اپنے حقوق حاصل کرنے کے لیے کوشش کرنا چاہیے۔

---

۵۔ Young India Lajpat Rai, p. 187, Lahore 1927

نواب محسن الملک نے سارے ملک سے سربرآوردہ مسلمانوں پر مشتمل ایک وفد ترتیب دیا جس کی سربراہی سر محمد آغا خاں نے کی۔ اس وفد میں ۳۵ مسلمان زعماء شریک تھے۔ یہ وفد شملہ میں یکم اکتوبر ۱۹۰۶ء کو وائسرائے ہندوستان لارڈ منٹو سے ملا۔ وفد نے وائسرائے کی خدمت میں ایک عرض داشت پیش کی۔ اس میں تعلیم اور ملازمتوں کے باب میں مسلمانوں کے ساتھ کی گئی زیادتیوں کا ذکر تھا اور پھر نیابتی طریقہ انتخاب میں مسلمانوں کے ساتھ زیادتیوں کا بڑی تفصیل سے ذکر تھا۔ اس کے جواب میں وائسرائے لارڈ منٹو نے وفد کو یقین دلایا کہ آئندہ انتخابی نظام میں "مسلمان جماعت کی نیابت جماعت کی حیثیت سے ہونی چاہیے۔ میں اس باب میں آپ سے متفق ہوں"۔

اس کے بعد ۱۹۰۹ء میں جب منٹو مارلے اسکیم کے نام سے ملک میں سیاسی اصلاحات نافذ کی گئیں۔ تو اس میں جداگانہ طریقہ انتخاب کو تسلیم کر لیا گیا تھا۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ مسلمانوں کا مطالبہ حکومت نے منظور کیا۔

## مسلم لیگ کا قیام

اس وقت تک مسلمانوں کی کوئی سیاسی تنظیم نہیں تھی۔ مذکورہ بالا وفد عارضی طور پر تشکیل دیا گیا تھا۔ اس موقعہ پر رہبران قوم نے ایک سیاسی انجمن کی ضرورت کو شدت سے محسوس کیا۔ اس احساس کے تحت سر سلیم اللہ خاں نواب ڈھاکہ نے ہندوستان بھر سے مسلمان زعماء کو ایک اجتماع میں شرکت کی دعوت دی۔ ۳۰ دسمبر ۱۹۰۶ء کو ڈھاکہ میں نواب وقار الملک کی صدارت میں یہ اجتماع ہوا۔ خطبہ صدارت میں انھوں نے فرمایا۔

"مسلمانان ہندوستان میں دوسری ہمسایہ قوموں کے مقابلہ میں ایک خمس کے قریب ہیں۔ اور اس لیے یہ ایک صاف مضمون ہے کہ اگر کسی وقت برٹش حکومت ہندوستان میں قائم نہ رہے تو اس وقت وہی قوم ملک پر حکمران ہوگی جو تعداد میں ہم سے چار

حصہ زیادہ ہے اور اب، صاحبو! ہر ایک شخص کو چاہیے کہ اپنے دل میں اس بات پر غور کرے کہ اس وقت ہماری حالت یہ ہوگی کہ ہمارا مال، ہماری آبرو، ہمارا مذہب سب خطرے میں ہوگا۔ آج جب کہ برٹش کی زبردست سلطنت اپنی رعایا کی محافظ ہے جس قسم کی مشکلات بسا اوقات ہم کو اپنے ہمسایہ دوستوں سے پیش آتی ہیں، اس کی نظائر کم وبیش ہر صوبہ میں موجود ہیں۔ تو وائے اس وقت پر جب ہم کو ان لوگوں کا محکوم ہو کر رہنا پڑے گا، جو اورنگ زیب کا بدلہ صدہا برس بعد آج ہم سے لینا چاہتے ہیں۔[1]

اس کے بعد ڈھاکہ میں مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا۔ جس کے تین بڑے مقاصد طے کیے گئے۔

۱۔ حکومت برطانیہ کی وفاداری۔

۲۔ مسلمانان ہند کے سیاسی حقوق کا تحفظ۔

۳۔ دوسری جماعتوں کے اندر مسلمانوں کے خلاف نفرت وعداوت کا انسداد۔

تشکیل کے بعد مسلم لیگ کا پہلا باقاعدہ اجلاس ۲۹ دسمبر ۱۹۰۷ء کو کراچی میں منعقد ہوا۔ جس میں مسلم لیگ کے دستور کی منظوری دی گئی۔

سرسید کے دورِ قیادت میں سیاست کاری مسلمانوں کے لیے ممنوع تھی۔ اب مسلم لیگ کے قیام سے وہ کفر ٹوٹا۔ پہلی مرتبہ مسلمانوں نے من حیث القوم ملکی سیاست میں حصہ لینے کا اعلان کیا۔ جب حالات کا تقاضا دیکھا تو مسلمانوں نے خود اپنی مرضی سے سیاسی جماعت

---

[1] تذکرہ وقار الملک، ص ۱۶۸ بحوالہ پاکستان ناگزیر تھا از حسن ریاض۔ ص ۴۵

مولانا سعید احمد سیکرٹری جمعیت العلماء ہند فرماتے ہیں: "اسلامی حکومت کے زوال پر اس ملک میں ہندوؤں کی حکومت قائم ہوجاتی تو مسلمانوں کو چھٹی کا کھایا یاد آجاتا۔ جو قوم موجودہ غلامی کی حالت میں یہ ستم ڈھا رہی ہے حکمران بن کر خدا جانے مسلمانوں کے ساتھ کیا کرتی۔ (الجمعیۃ ۱۰ جنوری ۱۹۳۶ء)

مسلم لیگ سے بنائی۔ برخلاف اس کے ہندو انجمن کانگریس کا قیام انگریز حکمرانوں کے مشورہ سے عمل میں آیا تھا۔ مسلم لیگ کے قیام نے یہ بات واضح کر دی کہ اب سر سید کا دورِ قیادت ختم ہو گیا۔ نئے تقاضوں کے تحت نئے قائدین نے عملی سیاست میں حصہ لینا شروع کر دیا۔

## اس دَور کی سیاست پر تبصرہ

مسلمانانِ ہند کا سیاسی دور سر سید سے شروع ہُوا، اور ان کے جانشین نواب محسن الملک کی وفات پر اکتوبر ۱۹۰۷ء میں ختم ہُوا۔ یہ دَور تقریباً نصف صدی کے عرصہ پر محیط ہے۔

علامہ شبیر احمد عثمانی (۱۹۴۹ء – ۱۸۸۵ء) اس دَور کی سیاست پر تبصرہ کرتے ہیں۔

"ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے بعد ایسی بری طرح ہم کو کچلا گیا کہ مدت تک موت کی سی بیہوشی سارے ملک پر طاری رہی۔ کچھ افاقہ ہُوا تو چاروں طرف مایوسی کی گھٹا چھائی دیکھی۔ مایوسی کے بعد حکومت کے سامنے چاپلوسی اور خوشامد کا دَور آیا۔ پھر مدت کے دبے ہُوئے جذبات کچھ اُبھرنے لگے۔ یہاں کے حاکموں نے جب دیکھا کہ مدت کی نیند سونے والے کچھ کروٹیں بدلنے اور جھرجھری لینے لگے ہیں۔ تو انھوں نے معروضات اور گزارشات پیش کرنے کا راستہ سمجھا دیا۔ مبادا یہ تازہ حرکت اُٹھتے ہُوئے جذبات اور بیدار کن احساسات کے نکلنے کا کوئی دوسرا خطرناک راستہ اختیار کر لے۔ معروضات کی منزل سے گزر کر پھر نرم پھر گرم لہجہ میں مطالبات کا آغاز ہُوا"[۱]

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اس دَور پر اسلامی نقطہ نظر سے تبصرہ کرتے ہُوئے لکھتے ہیں۔

"پہلا دَور سر سید احمد خان کا ہے جس میں مسلمان ایک مسلک اور مشن رکھنے والی جماعت[۲] کی بجائے محض ایک "قوم" بن کر رہ گئے۔ اور اس قوم کی پالیسی یہ قرار

---

[۱] خطبات عثمانی۔ علامہ شبیر احمد عثمانی۔ ص۔ ۱۹۔ ہاشمی بک ڈپو۔ لاہور۔ ۱۹۴۶ء

[۲] جیسا کہ مجدد الف ثانی، شاہ ولی اللہ دہلوی اور سید احمد شہید کی جماعت کی تعلیمات کے زیر اثر مسلمان بن چکے تھے۔

پامالی مگر اپنی دنیا بنانے کے لیے وقت اور موقعہ کے لحاظ سے جو طریقہ کارگر نظر آئے بے تکلف استعمال کیا جائے۔ اگرچہ نام پھر بھی اسلام کا اور مسلمانوں کا لیا جاتا رہے۔ مگر جو ذہنیت اس دَور میں کارفرما تھی اس کا عطر حالی نے اپنے اس مصرعہ میں کھینچ کر رکھ دیا ہے ؎ چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی۔ ۱۹۰۸ء کے لگ بھگ یہ دَور اپنی طبعی عمر کو پہنچ گیا۔“[1]

*******

---

[1] ادبیات مودودی۔ مرتب پروفیسر خورشید احمد۔ ص ۲۸۹۔ اسلامک پبلی کیشنز لاہور۔ ۱۹۷۶ء

# دسواں باب

# ہیجانی سیاست

(۱۹۰۸ء ——— ۱۹۲۴ء)

## تقسیم بنگال کی تنسیخ

اس دور کا آغاز تقسیم بنگال کے سرکاری اعلان کو واپس لینے سے ہوا۔ انگریزی سلطنت میں صوبوں کی حدبندی کسی مصلحت یا مناسبت سے نہیں کی گئی تھی۔ بلکہ کلکتہ۔ مدراس اور بمبئی انگریزی حکومت کے تین اہم مقامات تھے۔ پھر جو علاقہ فتح ہوتا تھا۔ وہ جس صوبے کے قریب ہوتا تھا اس میں ضم کر دیا جاتا تھا۔ اس طرح ان صوبوں کے رقبے بہت وسیع اور عریض ہو گئے تھے۔ نظم و نسق کی سہولت اس امر کی متقاضی تھی کہ چھوٹے صوبے بنائے جائیں۔ اس میں بنگال کا صوبہ چپا گام سے لے کر لدھیانہ تک پھیلا ہوا تھا۔ ۱۸۵۸ء میں یوپی کا صوبہ علیحدہ کیا گیا۔ ۱۸۷۴ء میں آسام کا صوبہ جدا کیا گیا۔ اس مصلحت کی خاطر اب ۱۹۰۵ء میں مشرقی بنگال کا صوبہ جدا کیا گیا۔ مشرقی بنگال میں مسلمانوں کی آبادی زیادہ ہے۔ یہ ان کی اکثریت کا صوبہ بن گیا۔ اس طرح ان کو سیاسی اور معاشی فوائد اور منافع از خود حاصل ہو گئے۔

حکومت کی منشیر ہی بر اول روز سے بنگال کے ہندو بابو قابض تھے۔ وہ اس تقسیم سے ناراض تھے۔

۱۔ جب صوبہ سرحد کو ۱۹۰۱ء میں پنجاب سے جُدا کیا گیا تب بھی ہندوؤں نے مخالفت کی۔ جب صوبہ سندھ کو ۱۹۳۵ء کو بمبئی سے جُدا کیا گیا تب بھی ہندوؤں نے مخالفت کی جو لوگ ۱۹۱۱ء میں تقسیم بنگال کی تنسیخ کراتے ہیں۔ وہی ۳۶ سال بعد ۱۹۴۷ء میں خود بنگال کو تقسیم کراتے ہیں۔ ہندو سیاست کے عجیب و غریب روپ ہیں۔

ابق میں آسام کی علیحدگی اور اڑیسہ کی علیحدگی پر ان کے اندر کوئی ناراضگی پیدا نہیں ہوئی۔ مشرقی بنگال کی علیحدگی پر انھوں نے بڑی شدت سے مخالفت کی۔ دہشت پسند ہندوؤں نے توڑ پھوڑ اور قتل و غارت گری شروع کر دی ان واقعات سے برطانوی حکومت خوف زدہ ہو گئی اور اس نے دہلی دربار منعقدہ ۱۹۱ء میں تقسیم بنگال کو منسوخ کر کے ہندوؤں کو خوش کر دیا۔

اس اعلان سے مسلمانوں کو سخت مایوسی ہوئی۔ حکومت پر ان کے اعتماد کو ٹھیس پہنچی۔ پہلی مرتبہ انھیں معلوم ہوا کہ انگریزی حکومت حق و انصاف کو بالائے طاق رکھ کر طاقت کے سامنے جھک جاتی ہے۔ انھیں یہ بھی معلوم ہوا کہ ہندو ان کے مفادات کی مخالفت میں کس حد تک جا سکتے ہیں۔ مسلمانوں میں مایوسی اور نامرادی کی لہر دوڑ گئی۔

## مقتل کانپور

ایک اور اشتعال انگیز واقعہ پیش آیا۔ سڑک سیدھی کرنے کے خیال سے حکومت نے مچھلی بازار کانپور کی مسجد کا ایک حصہ منہدم کرا دیا۔ حکومت کے اس نامناسب رویہ پر مسلمانوں نے شدید احتجاج کیا۔ (۳ اگست ۱۹۱۳ء) حکومت نے مزید تشدد کیا۔ پولیس نے ان پر بے تحاشا گولی برسا دی۔ بیسیوں مسلمان شہید ہو گئے اور سینکڑوں زخمی ہو گئے۔ اس ظلم اور بے دردی کو دیکھ کر جگر جیسا شاعر بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

مقتل کانپور [illegible]

۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ [illegible] مسلمانوں کا خون [illegible] بہایا گیا۔ اس واقعہ سے سارے ملک کے مسلمانوں میں غم و غصہ کی ایک لہر دوڑ گئی۔ مولانا محمد علی جوہر [illegible] ایک وفد لے کر انگلستان گئے۔ مگر وہاں [illegible] یہ بات واضح ہو گئی کہ برطانوی [illegible] کے کان بہرے ہیں۔ وہ کلمہ حق سننے کے لئے تیار نہیں [illegible] عظیم آبادی ممبر کونسل وائسرائے اور لارڈ ہارڈنگ وائسرائے ہندوستان نے ذاتی مداخلت کی

کسی نہ کسی طرح اس مسئلہ کو حل کیا۔

## میثاق لکھنؤ

منٹو مارلے اسکیم ۱۹۰۹ء نے مسلمانوں کا مطالبہ جداگانہ انتخاب منظور کر لیا تھا اس کا ایک اہم نتیجہ اس صورت میں ظاہر ہوا کہ مسلمان مخلوط انتخاب کے ذریعہ مخلوط قوم کا حصہ نہ بن سکے۔ اس سے مسلمانوں کا وقار بھی بلند ہو گیا۔ اور سیاسی صورتِ حال بھی واضح ہو گئی۔ مسجد کانپور کے سلسلہ میں عظیم قربانیاں دے کر مسلمانوں نے اپنی اہمیت کو ملک بھر میں تسلیم کرا لیا تھا۔ ادھر مسلمانوں کی انجمن مسلم لیگ نے اجلاس لکھنؤ میں اپنا سیاسی مطمح نظر حکومت خود اختیاری کو قرار دیا جس سے ان کے سیاسی فہم کا اندازہ ہوا۔

ادھر کانگریس میں چند اعتدال پسند رہنما غالب آ گئے تھے۔ مسٹر محمد علی جناح قدیم زمانہ سے ہندو مسلم اتحاد کی کوشش کر رہے تھے۔ کانگریسی لیڈروں نے مسلمانوں کا وزن محسوس کیا۔ اور یہ بھی محسوس کیا کہ مسلمانوں سے سیاسی مفاہمت کیے بغیر حکومت سے مزید آئینی حقوق حاصل کرنا سود مند نہیں ہوگا۔ اس طرح اتحاد کے لیے ملکی فضا سازگار تھی۔ ان حالات میں مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان لکھنؤ میں ۱۹۱۶ء میں ایک معاہدہ ہوا۔ کانگریس نے مسلمانوں کے مطالبات تسلیم کر لیے۔

- جداگانہ طریق انتخاب مسلمانوں کا حق ہے۔
- قانون ساز اسمبلی میں جس بل کی مخالفت مسلمان ممبروں کی ایک تہائی تعداد کر دے وہ بل اسمبلی میں زیرِ بحث نہیں آئے گا۔
- اقلیتی صوبوں میں مسلمانوں ممبروں کی تعداد ذرا زیادہ ہوگی۔ یہ زیادتی اکثریتی صوبوں میں مسلمان ممبروں کی تعداد سے واضح کی جائے گی۔
- مرکزی قانون ساز اسمبلی میں مسلمان ممبروں کی تعداد لازماً ۳۳ فیصد ہوگی۔

میثاق لکھنؤ کے منظور کرانے میں مسٹر محمد علی جناح کی کوششوں کو بہت اہمیت حاصل

ہے۔ میثاق لکھنؤ کو حکومت نے بھی تسلیم کر لیا۔ اور ۱۹۱۹ء کی اصلاحات میں میثاق کی دفعات کو شامل کر لیا۔ اس طرح یہ ملکی قانون بن گیا۔

میثاق لکھنؤ بہت اہمیت کا حامل ہے۔ انگریزی دور حکومت میں ہندو مسلمان اتحاد کی یہ پہلی کامیاب کوشش ہے۔ اس کے بعد ہندوستان کی فضا میں اتحاد کے اثرات واضح نظر آتے ہیں۔ تقریباً دس سال تک دونوں قوموں میں اتحاد اور دوستی برقرار رہی۔ خلافت مسلمانوں کا قومی مسئلہ تھا مگر ہندوؤں نے اس میں بھرپور حصہ لیا۔ ادھر مسلمان جو کانگریس سے کنارہ کش رہتے تھے انھوں نے سوراج اور حکومت خود اختیاری کی تحریک میں شامل ہو کر اس میں جان ڈال دی۔ مسلمانوں کی شرکت نے نیا جوش اور ولولہ پیدا کر دیا۔

## رولٹ ایکٹ

ایک اور اشتعال انگیز واقعہ رونما ہوا۔ جنگ عظیم اول (۱۹۱۸ء - ۱۹۱۴ء) کے خاتمہ کے بعد انگریزی حکومت نے ہندوستان میں ایک نیا قانون پولیس سے متعلق نافذ کیا اس کو رولٹ ایکٹ کہتے ہیں اس کے تحت جرم ثابت کرنا پولیس کی ذمہ داری نہیں ہے۔ بلکہ مجرم کا فرض ہے کہ وہ اپنی صفائی ثابت کر دے۔ اس کے تحت مقدمہ کی پیروی کے لیے کوئی وکیل نہیں کیا جا سکتا۔ اور سزا کے خلاف کوئی مرافعہ (اپیل) نہیں کیا جا سکتا۔ اس قانون کے متعلق مولانا محمد علی کا جملہ بہت مشہور ہے "نا دلیل، نا وکیل، نا اپیل" یہ ایک انتہائی ظالمانہ قانون تھا۔ جو برطانوی حکومت نے اہل ہند کو جنگی خدمات کے صلہ کے طور پر عطا کیا تھا۔ سارا ملک اس کے خلاف سراپا احتجاج بن گیا۔ ہر شہر میں اس کے خلاف احتجاجی جلسے ہوئے۔ گاندھی جی نے اس موقعہ پر احتجاج کا مخصوص طریقہ کار "ستیہ گرہ" پہلی مرتبہ استعمال کیا۔

## جلیانوالہ باغ کا قتل عام

انگریزی حکومت نے ایک اور اشتعال انگیزی کی۔ امرتسر کے باغ جلیانوالہ میں ایک احتجاجی جلسہ ہو رہا تھا۔

اپریل ۱۹۱۹ء گورا فوج کے ایک افسر "ڈائر"[1] نے اس باغ کا محاصرہ کر لیا۔ اور پھر نہتے لوگوں پر گولی برسا دی۔ سینکڑوں افراد مقتول ہوئے۔ اور ہزاروں افراد مجروح ہوئے۔ مزید ستم ہوا کہ پنجاب کے گورنر "اوڈائر"[1] نے اس فعل کی تحسین کی۔ ہزاروں افراد کو گرفتار کیا۔ ان کو کوڑوں کی سزا دی۔ ان ظالمانہ کارروائیوں کے خلاف ملک کے اندر اور ملک کے باہر احتجاجی جلسے ہوئے۔ حکومت پر سخت تنقید کی گئی۔ ان واقعات نے ہندوستان کے لوگوں کے اندر ایک ہلچل مچا دی۔ ان کے دل و دماغ میں ایک آگ سی لگا دی۔

## خلافت عثمانیہ ترکیہ پر یلغار

اشتعال انگیزی کا ایک موقعہ غیر ملکی واقعات سے ہندوستانی مسلمانوں کی زندگی میں داخل ہو گیا۔ مسلمان ملکوں میں صرف برصغیر ہندو پاکستان کے مسلمان جدید مغربی زبانوں سے بہرہ ور تھے۔ اس لیے وہ بیدار تھے۔ مغربی حکومتوں کی استعماری چالوں کو بخوبی سمجھتے تھے۔ یورپ کی وطنی قومیت کی تنگ نظری اور تنگ دلی نے ان کی بینائی اور شنوائی کو ابھی تک ماؤف اور مجروح نہیں کیا تھا۔ وہ سید جمال الدین افغانی کی تحریک اتحاد اسلامی ( [illegible] ) سے متاثر تھے۔ علامہ اقبال کی وحدت ملت کی نظموں سے ہندوستان کی فضا گونج رہی تھی۔ اس لیے جہاں کہیں اسلامی ملک پر ظلم و ستم ہوتا تھا، برصغیر کے مسلمان پیش قدمی کرتے تھے اور ظالم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے تھے۔

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

بیسویں صدی کے پہلے عشرہ میں خلافت عثمانیہ ترکیہ پر چاروں طرف سے دشمنوں کی یلغار تھی۔

---

[1] ان ظالموں سے اللہ تعالیٰ نے انتقام لیا۔ جنرل ڈائر تو فالج کے حملے میں مر گیا (۲۳ جولائی ۱۹۲۷ء) اور گورنر پنجاب جنرل اوڈائر کو ایک سکھ نوجوان اودھم سنگھ نے ۱۹۴۰ء میں لندن میں گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ اودھم سنگھ نے اس خونی حادثہ کے بعد اپنا نام رام محمد سنگھ رکھ لیا تھا وہ ہندو مسلمان سکھ تینوں قوموں کی نمائندگی کرتا تھا۔

یوروپی حکومتیں اس کے حصے بخرے کرنے پر تلی ہوئی تھیں اطالیہ نے لیبیا پر قبضہ کر لیا تھا ۱۹۱۱ء بلقان کی ریاستیں یکے بعد دیگرے خلافت سے کٹ کر آزاد ہو رہی تھیں۔ اب وہ خلافت کے مرکز پر نظریں گاڑے ہوئے تھے۔

ان سب واقعات اور حوادثات کی چوٹ براہ راست ہندوستانی مسلمان اپنے سینوں میں محسوس کرتے تھے۔ اور بے تاب ہو جاتے تھے۔ مختلف اشتعال انگیزیوں کے سبب اس دور میں ہندوستانی مسلمانوں کے مزاج میں ایک جذباتی اور ہیجانی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ اس دور میں انھوں نے غیر معمولی جدوجہد کا مظاہرہ کیا۔ عظیم الشان احتجاجی مظاہرات کیے۔ اور غیر معمولی قربانیاں پیش کیں۔ خلافت کے واقعات سے متاثر ہو کر مسلمانوں نے مختلف سمتوں میں کوششیں کیں، جدوجہد کی۔ اس دور میں انھوں نے مندرجہ ذیل تحریکیں برپا کیں۔

۱۔ خدام کعبہ

۲۔ ریشمی رومال تحریک

۳۔ خلافت تحریک

۴۔ ترک موالات اور ہجرت

۵۔ سودیشی مال کی تحریک

## مردان کار

معاشرتی زندگی میں قیادت اور رہنمائی کی ضرورت ناگزیر ہے۔ لیکن سیاسی زندگی میں تو سب سے اہم کردار قیادت اور رہنمائی ہی ادا کرتی ہے۔ کسی قوم کو مناسب قیادت میسر آجاتی ہے تو وہ منزل مقصود کو پہنچ جاتی ہے۔ اور اگر وہ موزوں قیادت سے محروم رہ جاتی ہے تو وہ قوم مدتوں بھٹکتی پھرتی ہے۔ اور اس بے راہ روی میں بعض اوقات منزل مقصود ان نظروں سے اوجھل ہو جاتی

رہے۔

سرسید احمد خان اور ان کے جانشین ساری زندگی ۱۸۵۷ء کے اُٹھاتے ہوئے گرد و غبار کو صاف کرتے رہے۔ وہ انگریزوں اور ہندوؤں کے ساتھ مفاہمت پیدا کرتے رہے۔ وہ دور گزر گیا۔ اب نئے دَور کا آغاز ہو رہا تھا۔ اس کے لیے نئی قسم کے مردانِ کار درکار تھے۔ نئے راہنما اور نئے راہبر درکار تھے۔ بفضلِ خداوندی سے اس دَور میں ہر قسم کے رہنما اور رہبر مسلمانوں میں پیدا ہوئے۔ دینی عُلما میں مولانا عبدالباری فرنگی محلی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا سید سلیمان ندوی وغیرہ سیاسی رہنماؤں میں مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، مولانا حسرت موہانی، سید شبیر حسین قدوائی، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، مولانا عبدالماجد دریابادی، مقررین اور خطبا میں مولانا محمد علی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ظفر علی خان، مولانا آزاد سبحانی، مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا احمد سعید دہلوی، مولانا فاخر الہ آبادی، سیٹھ چھوٹانی وغیرہ صحافت میں، الہلال (کلکتہ) کامریڈ (کلکتہ) ہمدرد (دہلی) زمیندار (لاہور) قومی شعرا میں، علامہ محمد اقبال، علامہ شبلی، مولانا ظفر علی خان، مولانا حسرت موہانی، مولانا محمد علی وغیرہ۔ غرضیکہ رحمتِ باری کی فیاضی بے اندازہ تھی۔ ہر قسم اور ہر نوع کی صلاحیتوں اور قابلیتوں کے اشخاص بہ کثرت مسلمان معاشرہ میں موجود تھے۔ جنھوں نے دل و دماغ کی بہترین صلاحیتیں تحریکِ خلافت میں صرف کر دیں۔ اس راہ میں بڑی سے بڑی قربانی سے دریغ نہیں کیا۔ یہ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل و انعام تھا۔ ایسے مردانِ کار پھر ملتِ اسلامیہ ہندیہ کو میسر نہ آسکے۔

## خدامِ کعبہ

۱۹۱۲ء میں اطالیہ نے افریقہ کے ساحل پر طرابلس الغرب (لیبیا) پر قبضہ کر لیا۔ اس موقعہ پر اطالیہ کے بادشاہ عمانوئیل نے کہا تھا: "ہمارے ہوائی جہاز مسلمانوں کے کعبہ سے بھی نمٹ سکتے ہیں۔" اس جملہ نے برصغیر کے مسلمانوں کے دلوں میں اضطراب پیدا کر دیا۔ اس دور کے مسلمانوں کا اضطراب

علامہ شبلی کے ان اشعار میں جلوہ گر ہے۔

کہیں اڑ کر تر دامان حرم کو نہ چھو آئے
غبار کفر کی بے محابا شوخیاں کب تک
حرم کی سمت بھی صید افگنوں کی جب نگاہیں ہیں
تو پھر سمجھو کہ مرغان حرم کے آشیاں کب تک
جو ہجرت کرکے بھی جائیں تو شبلیؔ اب کہاں جائیں
کہ اب امن و امان شام و نجد و قیروان کب تک

ملت کے بہی خواہ اور دردمند افراد سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ ترکیہ کے کمزور پڑ جانے کے بعد اب خانہ کعبہ کی حفاظت کس طرح کی جائے۔

ان ہی افکار و جذبات کے تحت لکھنؤ میں ۱۳ر دسمبر ۱۹۱۲ء کو زعماء ملت جمع ہوئے۔ اور انجمن خدام کعبہ وجود میں آئی۔ مولانا عبدالباری فرنگی محلی اس کے صدر ہوئے۔ مولانا شوکت علی اس کے سیکرٹری مقرر ہوئے۔ اس انجمن کا بنیادی مقصد حرمین شریفین کا تحفظ تھا۔ دو قسم کے لوگ اس کے ارکان ہوتے تھے۔ خادم کعبہ اور شیدائی کعبہ۔ صدر کو خادم الخدام کہتے تھے۔ یہ ایک غیر سیاسی تنظیم تھی۔ برِصغیر کے مسلمانوں کی یہ اس قبیل کی سب سے پہلی تحریک تھی۔ اس نے مسلمانوں میں اسلامی جذبات کو خوب اُبھارا۔ حجاج کرام کی خدمت کو اپنا شعار بنایا۔ مئی ۱۹۱۵ء میں علی برادران (محمد علی اور شوکت علی) گرفتار ہو گئے۔ اور مسلسل چار سال تک نظر بند رہے۔ ان کے بعد یہ تحریک سرد پڑ گئی۔

## ریشمی رومال تحریک

جنگِ عظیم اوّل شروع ہو جانے سے دُنیا کا امن تہ و بالا ہو گیا تھا۔ برطانوی حکومت جنگ کی پریشانیوں میں گھر گئی تھی۔ خلافت کے خلاف اعلانِ جنگ کرنے کی وجہ سے مسلمانان

ہند کے جذبات انگریزوں کے خلاف بھڑکے ہوئے تھے۔ ان حالات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے شیخ الہند مولانا محمود الحسن صدر مدرس دیوبند نے آزادی وطن کی ایک انقلابی اسکیم تیار کی۔ وہ چاہتے تھے کہ ترکی افواج کو افغانستان کے راستے ہندوستان پر حملے کی ترغیب دی جائے۔ ہر جگہ ان کی تائید ہوگی۔ ان کا استقبال ہوگا۔ اس طرح ہندوستان میں برطانوی حکومت کا خاتمہ کیا جا سکتا ہے۔

۱۹۱۵ء میں کالجوں کے بعض پُرجوش طلبا اور بعض ہندوستانی انقلابی کابل افغانستان میں جمع ہو گئے تھے۔ شیخ الہند نے اپنے شاگرد خاص مولانا عبیداللہ سندھی کو کابل بھیج دیا۔ (۱۹۱۵ء) غدر پارٹی کے افراد مولوی برکت اللہ بھوپالی اور راجہ مہندر پرتاپ علی گڑھی بھی وہاں پہنچ گئے۔ وہاں ان سب نے مل کر ایک عارضی ہندوستانی حکومت قائم کر لی۔ شیخ محمود الحسن حجاز تشریف لے گئے وہاں ترکی گورنر غالب پاشا سے ملاقات کی۔ اور ان سے مشورہ کیا۔

مولانا عبیداللہ سندھی نے مولانا محمود الحسن کو کابل کے حالات سے باخبر کرنے کے لیے تحریر روانہ کی۔ انھوں نے ریشمی رومالوں میں عربی زبان میں یہ تحریر کشیدہ کاری کے طریقہ پر لکھ دی۔ حاجیوں کے ذریعہ انھوں نے یہ رومال حجاز بھیجے۔ انگریزی جاسوسوں کو اس کی خبر ہوگئی انھوں نے راستہ ہی میں اس کو حاصل کر لیا۔ ہندوستان میں بڑے پیمانہ پر گرفتاریاں عمل میں آئیں۔ مولانا محمود الحسن کو شریف مکّہ سے حاصل کر کے انگریزوں نے جزیرہ مالٹا میں نظر بند کر دیا۔ جنگ ختم ہونے کے بعد ۱۹۱۹ء میں ان کو رہا کر دیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا حسرت موہانی کی ہمدردیاں بھی اس تحریک کے ساتھ تھیں یہ تحریک ابھی برسرِ پیکار بھی نہیں آئی تھی کہ حکومت نے اس کو کچل دیا۔ یہ تحریک مخفی تھی مگر ہندوستان میں سینکڑوں افراد کسی نہ کسی طرح اس سے متاثر ہوتے رہے بہت سوں نے جان اور مال کی قربانی دی۔ اسلامی افکار و نظریات کو بہر کیف فروغ حاصل ہوا۔

## خلافت تحریک

جنگِ عظیم اوّل (۱۹۱۸ء – ۱۹۱۴ء) میں ایک فریق برطانیہ، فرانس امریکہ وغیرہ تھے اور

دو سرا فریق جرمنی ترکی وغیرہ تھے۔ اس لئے برطانیہ اور برطانوی مقبوضات اور نوآبادیات بشمول ہندستان خلافت عثمانیہ ترکیہ کے خلاف صف آرا ہو گئے۔ یہ صورت حالات ہندوستانی مسلمانوں کے لیے انتہائی پریشان کن اور اضطراب انگیز تھی۔ ان کے سامنے ہندوستان کے علماء کرام کا فتویٰ موجود تھا۔

"صدیوں سے خلافت اسلامی کا منصب سلاطین عثمانیہ ترکی کو حاصل ہے اس لیے ازروئے شرع ان کی اطاعت اور اعانت عام مسلمانوں پر فرض ہے اگر خلیفہ دشمنوں میں گھر جائے تو عام مسلمانان عالم کو لازمی مدد اور نصرت کرنا چاہیے۔"[۱]

ان حالات میں ہندوستان کے مسلمانوں نے جنگ کا زمانہ بڑے اضطراب اور پریشانی میں گزارا۔ وہ ترکوں کی مالی اور اخلاقی امداد کرتے رہے۔ اور ہندوستانی حکومت کے توسط سے انگلستان کی حکومت پر زور دباؤ ڈالتے رہے کہ وہ مقدس ادارہ "خلافت" کو اور مقامات مقدسہ کی حرمت کو محفوظ رکھے۔ اس کے جواب میں ہندوستان کی حکومت نے اعلان کیا۔ ۲ نومبر ۱۹۱۴ء۔ اور تحفظات کا یقین دلایا۔ پھر وزیر اعظم انگلستان نے بھی اس قسم کی یاد دہانی کرائی۔ ۔۔۔ ۱۹۱۸ء کی جنگ میں ترکی کو شکست ہو گئی۔ انگریزوں نے دارالخلافت قسطنطنیہ پر ۳ اکتوبر ۱۹۱۸ء کو قبضہ کر لیا۔ اس کو انھوں نے فوجی قبضہ کا نام دیا جس کے تحت فاتح قوم کو مفتوح قوم کے ذاتی اور سکونتی مکانات پر بھی تصرفات کا حق ہو جاتا ہے۔ فوراً برطانوی فوج نے موصل اور کرکوک کے علاقہ پر قبضہ کر لیا جہاں آگے چل کر تیل کے چشمے نکلے۔

## خلافت کمیٹی کا قیام

سقوطِ قسطنطنیہ کی خبر نے برصغیر کے مسلمانوں کو انتہائی درد و کرب اور اضطراب در پریشانی

---

۱۔ مسئلہ خلافت۔ ابوالکلام آزاد۔

میں مبتلا کر دیا۔ بے تابانہ انھوں نے احتجاجی جلسے منعقد کرنے شروع کر دیے۔ مدراس (۱۷ جنوری ۱۹۱۹ء) لکھنؤ (۲۶ جنوری ۱۹۱۹ء) پھر لکھنؤ (۲۲ ستمبر ۱۹۱۹ء) کے اجلاس میں خلافت کمیٹی کا قیام عمل میں آیا۔ اس طرح ساٹھ سال بعد علماء کرام باقاعدہ طور پر پھر سیاست میں داخل ہو گئے۔ آغاز تو خلافت کمیٹی کے صدر سیٹھ جان محمد چھوٹانی (بمبئی) اور سیکرٹری حاجی محمد صدیق مقرر ہوئے۔ مگر بعد میں صدر عبدالباری فرنگی محلی اور سیکرٹری مولانا شوکت علی مقرر ہوئے۔ برطانوی حکومت جشن فتح منا رہی تھی۔ اور پورا ملک ان تقریبات کا بائیکاٹ کر رہا تھا۔ اور رنج وغم میں مبتلا تھا۔ ترکوں کی امداد کے لیے انجمن ہلالِ احمر کا قیام عمل میں آیا۔ سارے ہندوستان کے مسلمانوں نے بڑھ چڑھ کر اس میں حصہ لیا۔ عورتوں نے اپنے زیورات دیدیئے۔ مردوں نے اپنے مکان بیچ کر چندہ دیا مسلمانوں نے غیر معمولی ایثار و قربانی کا مظاہرہ کیا۔

## جمعیت العلماء کا قیام

حکیم اجمل خاں کی دعوت پر تمام زعماء قوم دہلی میں جمع ہوئے۔ مولوی فضل الحق (بنگال) کی صدارت میں خلافت کمیٹی کا اجلاس منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں علماء کرام کی ایک جداگانہ تنظیم جمعیت العلماء ہند کے نام سے عمل میں آئی۔ ۲۵ نومبر ۱۹۱۹ء۔ اس کے صدر مفتی کفایت اللہ دہلوی اور سیکرٹری مولوی احمد سعید دہلوی مقرر ہوئے۔ تاکہ علماء پوری قوت کے ساتھ سرگرم عمل ہو سکیں۔

## ہندوؤں کی شرکت

ہندو لیڈر گوکھلے کا ۱۹۱۵ء میں انتقال ہو گیا تھا خالی جگہ پُر کرنے کے لیے ہندوؤں نے گاندھی جی کو آگے بڑھایا۔ گاندھی نے جنوبی افریقہ میں رفاہی کام کر کے شہرت حاصل کی تھی۔ مگر ہندوستان میں وہ غیر معروف تھے۔ مقبولیت حاصل کرنے کا یہ بہترین موقعہ تھا۔ گاندھی نے مسلمانوں کی اس عظیم الشان تحریک میں حصہ لینے کا ارادہ کیا۔ اور انھوں نے ہندوؤں سے اپیل کی کہ وہ اس مشکل وقت میں اپنے مسلمان بھائیوں کی غیر مشروط حمایت کریں۔ گاندھی جی پر اس وقت تک جنوبی افریقہ کی بیساکھی

---

لہ صرف قادیان میں جشن چراغاں منایا گیا۔ اخبار الفضل ۲۰ دسمبر ۱۹۱۸ء بحوالہ قومی ڈائجسٹ علامہ اقبال نمبر خاص ۱۹۸۴ء

فضا کی ذریعہ تھا۔ گاندھی جی کے دل میں یہ خیال بھی تھا کہ اس طرح مسلمانوں کی تائید حاصل کر کے سوراج حاصل کرنے کی جدوجہد تیز کی جائے۔ گاندھی جی کے اس اعلان نے مسلمانوں کے دل موہ لیے۔ ملک میں ہندو مسلمان اتحاد اور یگانگت کی غیر معمولی فضا چھا گئی۔ خلافت کمیٹی کے پہلے اجلاس میں مشہور ہندو لیڈر۔ مدن موہن مالویہ، ویر ساورکر، سوامی شردھانند جیسے لوگ بھی شریک ہوئے تھے۔ مسلمانوں نے ہندوؤں کی اس پیشکش کا اس اخلاص کے ساتھ جواب دیا کہ آریہ لیڈر سوامی شردھانند کو جامع مسجد دہلی کے منبر پر بٹھا کر تقریر کرا دی۔ عید قربان کے موقع پر سارے شہر دہلی نے گائے کی قربانی سے احتراز کیا[1]

## خلافت کمیٹیوں کے اجلاس

ملک کے گوشے گوشے میں خلافت کا پیغام پہنچانے کے لیے مرکزی اور صوبائی شہروں میں خلافت کمیٹی کی شاخیں قائم کی گئیں۔ وہاں ان کے اجلاس ہوتے رہتے تھے۔ جس میں مقامی اور مرکزی رہنما شرکت کرتے تھے۔ حیدرآباد سندھ کانفرنس (۱۵ جنوری ۱۹۲۰ء) لاڑکانہ (۹ فروری ۱۹۲۰ء) بمبئی (۱۵ فروری ۱۹۲۰ء) کلکتہ (۲۸ فروری ۱۹۲۰ء) کانپور (۹ مارچ ۱۹۲۰ء) جیکب آباد (۲ مئی ۱۹۲۰ء) کراچی (۲۵ جولائی ۱۹۲۰ء) اس میں مولانا شوکت علی نے اور گاندھی جی نے شرکت کی تھی۔ ملک کے گوشہ گوشہ میں یہ کانفرنسیں منعقد ہو رہی تھیں جن میں لوگ انتہائی جوش و خروش کے ساتھ شرکت کرتے تھے۔ خطباء اور مقررین انتہائی جذباتی انداز میں تقریریں کرتے تھے بقول ایک مصنف "ہر مولوی اور مولانا کی زبان شعلے اگل رہی ہے۔ انگریزی حکومت کے خلاف آگ برسا رہی ہے" سارے ملک میں ایک ہلچل مچی ہوئی تھی۔ مسلمانوں پر ایک جذباتی اور ہیجانی کیفیت

---

[1] بعض علماء نے اس موقع پر عدم ذبیحہ گاؤ کا فتویٰ دیا تھا جس کے خلاف مولانا خلیل احمد دیوبندی نے تقریر کی اور فتویٰ ذبیحہ گاؤ لکھا تھا۔ جو اخبار وکیل امرتسر ۲۶ اپریل ۱۹۱۹ء میں شائع ہوا تھا۔

طاری تھی۔

## امرتسر کانفرنس

اتفاق واتحاد کی عجیب وغریب فضا جو ملک میں پیدا ہو گئی تھی۔ اس کا ایک منظر امرتسر کانفرنس تھا۔ امرتسر میں جلیانوالہ باغ کا خونی ڈرامہ کھیلا جا چکا تھا۔ (اپریل ۱۹۱۹ء) ۔ اس لیے دوسرے آل انڈیا خلافت کمیٹی کا اجلاس امرتسر میں طے ہوا۔ ملک کی تمام دوسری سیاسی جماعتوں نے بھی اپنے اجلاس امرتسر میں انہی تاریخوں میں رکھ لیے۔ کانگریس کا اجلاس پنڈت موتی لال نہرو کی صدارت میں، مسلم لیگ کا اجلاس حکیم اجمل خاں کی صدارت میں، خلافت کمیٹی کا اجلاس مولانا شوکت علی کی صدارت میں، جمعیت العلماء کا اجلاس مولانا عبدالباری فرنگی محلی کی صدارت میں منعقد ہوتے۔ (۳۰ دسمبر ۱۹۱۹ء) بیتول (سی پی) میں چار سال نظر بندی کے کاٹ کر علی برادران سیدھے امرتسر پہنچے۔ جہاں ہندوستان کے سارے رہبران قوم یکجا جمع ہو رہے تھے۔ علی برادران کی رہائی کی خبر سن کر علامہ اقبال کار میں بیٹھ کر امرتسر پہنچے تھے۔ اور وہاں انھوں نے علی برادران کو خطاب کر کے چند اشعار پڑھے تھے

ہے اسیری اعتبار افزا جو فطرت ہو بلند
قطرۂ نیساں ہے زندان صدف سے ارجمند
شہپر زاغ و زغن در خور قید و بند نیست
ایں سعادت قسمت شہباز و شاہیں کردہ اند

سیاسی جماعتوں کا ایسا اجتماع ۔ قران السعدین ۔ پھر چشم فلک نے کبھی نہیں دیکھا۔ خلافت کمیٹی اور سوراج کی قیادت گاندھی جی کے سپرد کر دی گئی۔ واضح رہے کہ خلافت کمیٹی کی دینی قیادت مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے ہاتھ میں تھی۔ اس اجلاس میں فیصلہ ہوا کہ ایک وفد خلافت کے بارے میں وائسرائے ہندوستان سے ملے۔ اور دوسرا وفد انگلستان کے وزیر اعظم سے ملے۔

## وفود

۱۹ جنوری ۱۹۲۰ء کو ایک وفد وائسرائے ہندوستان سے ملا۔ اس وفد میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے چوٹی کے بیس رہنما شریک تھے۔ گاندھی جی وفد کے لیڈر تھے۔ وفد نے ایک یادداشت وائسرائے کی خدمت میں پیش کی جس میں خلافت ترکیہ کے تحفظ اور بحالی حاکمیت کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ مگر وائسرائے نے سردمہری برتی اور اس کا جواب مایوس کن تھا۔

دوسرا وفد اوائل مارچ ۱۹۲۰ء میں مولانا محمد علی، سید حسین اور سید سلیمان ندوی پر مشتمل یورپ روانہ ہوا۔ برطانوی وزیر اعظم کا جواب بھی نہایت مایوس کن تھا۔ اس خبر سے ہندوستان میں سخت برہمی پھیلی۔ اور پورے ملک میں یوم سیاہ منایا گیا۔ احتجاجی جلسے ہوئے۔ وفد نے واپس آ کر اپنی ناکامی کی داستان سنائی جس سے برطانیہ کے خلاف غیظ و غضب اور بڑھ گیا۔

## تحریک ہجرت

ہجرت سے ہندوستان کی انگریزی حکومت پر غیر معمولی دباؤ ڈالنا مقصود تھا۔ ہجرت کے محرکین علی برادران اور مولانا ابوالکلام آزاد تھے۔ مولانا محمد علی اور مولانا شوکت نے چیمس فورڈ وائسرائے ہندوستان کو ایک یادداشت پیش کی (۲۴ اپریل ۱۹۱۹ء) جس میں انھوں نے لکھا تھا کہ "ہماری موجودہ خستہ حالی کے پیش نظر صرف ہجرت ہی ہمارے لیے ایک واحد متبادل صورت رہ گئی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ یہ اقدام ہم اب تمام تر سنجیدگی کے ساتھ جو اس کا تقاضا ہے ترجیح دیتے ہیں۔" مولانا ابوالکلام آزاد ہجرت کو اسلام کی پانچ ابدی حقیقتوں میں ایک سمجھتے تھے۔ تحریک خلافت اور ترک موالات نے ملک کی فضا ایسا سنگین اقدام کرنے کے لیے ہموار کر دی تھی۔

تحریک ہجرت دو طرفہ عمل تھا۔ ایک فریق ہندوستان کے مسلمان تھے جو ہجرت کرنے پر آمادہ تھے۔ دوسرا فریق افغانستان کی حکومت تھی جو مہاجرین کو اپنے یہاں قبول کرنے پر آمادہ تھی۔ مسلمانوں

کا معاملہ تو واضح ہے وہ خلافت کی خاطر بڑے سے بڑے اقدام کے لیے تیار تھے۔ ان پر جذباتی ہیجانی کیفیت طاری تھی۔ البتہ حکومت افغانستان نے اس ہجرت کو ایک دوسرے ہی مقصد سے قبول کیا تھا وہ اس کے ذریعہ حکومت برطانیہ پر دباؤ ڈال کر اپنے مفادات حاصل کرنا چاہتی تھی امیر امان اللہ خان شاہ افغانستان نے اپنے والد کی برسی کے موقع پر ۲۰، ۲۱ فروری ۱۹۲۰ء ہندوستانی مسلمانوں کو افغانستان آنے کی اجازت دے دی۔ افغانستان کے وزیر خارجہ محمود طرزی نے مسوری یوپی کی مسجد میں جمعہ کے دن تقریر کرتے ہوئے (۱۲ اپریل ۱۹۲۰ء) ہندوستانی مسلمانوں کو افغانستان آنے کے لیے خوش آمدید کہا۔[1]

زعماء خلافت نے نہ مزید تحقیق کی نہ کسی معاہدہ کی ضرورت محسوس کی بس اس پیش کش کو کافی سمجھا اور قبول کر لیا۔ (خلافت کانفرنس کا اجلاس منعقدہ دہلی۔ اپریل ۱۹۲۰ء) آغاز کار میں بعض علماء نے تذبذب کا اظہار کیا۔ البتہ قومی جذبات کے پیش نظر مخالفت کسی نے نہیں کی بہرحال سب اس میں شریک ہو گئے۔ سارے ملک میں مقررین اور خطیبوں نے آگ لگا رکھی تھی۔ جذباتی فضا پیدا کردی تھی۔ بی اماں (والدہ علی برادران) نے پالکی میں بیٹھ کر سارے ملک کا دورہ کیا۔ عورتوں میں بے حد جوش پیدا ہو گیا تھا۔

بولی اماں محمد علی کی ۔ جان بیٹا خلافت پہ دیدو

اس دور میں مسلمانوں کا قومی ترانہ بن گیا تھا جس کا دلوں پر بے حد اثر ہوتا تھا

بہرحال ہجرت کا آغاز ہوا۔ خدام المہاجرین کے نام سے ایک دفتر دہلی میں اور دوسرا دفتر پشاور میں قائم کیا گیا ہجرت کرنے والوں کا زیادہ زور صوبہ متحدہ آگرہ و اودھ، سندھ، پنجاب اور سرحد میں تھا۔ بعض لوگوں کے اندازہ کے مطابق ۶۰ ہزار افراد ہجرت کر کے کابل گئے۔ حکومت افغانستان

---

[1] تحریکات ملی۔ گورنمنٹ نیشنل کالج میگزین۔ مضمون تحریک ہجرت از پروفیسر معین الدین عقیل ص ۲۰۶۔ کراچی ۸۳-۱۹۸۲ء

نے بیان دیا تھا کہ ۴۰ ہزار مہاجرین یہاں آئے۔

افغانستان کی حکومت کے معاشی وسائل اتنے زیادہ نہیں تھے کہ وہ اتنے زیادہ مہاجرین کا بار برداشت کر سکتی۔ نہ وہاں کی حکومت میں انتظامی صلاحیت اعلیٰ پیمانہ پر تھی۔ اس عرصہ میں کابل اور دہلی کے تعلقات بہتر ہو گئے تھے بہر کیف مختلف اسباب کی بنا پر افغانستان حکومت نے ۳ اگست ۱۹۲۰ء کو اپنی سرحد مہاجرین پر بند کر دی جس کے نتیجہ میں ہجرت یک لخت بند ہو گئی جو لوگ وہاں گئے تھے وہ بھی بیروزگاری اور عدم تعاون کی وجہ سے واپس لوٹ آئے۔ تحریک ہجرت بری طرح ناکام ہوئی۔ ہزاروں گھر اُجڑ گئے۔ لاکھوں افراد تباہ ہو گئے۔

## ترکِ موالات

وفود کی ناکامی کے بعد ہندوستانی زعما مسلمان اور ہندو بہت اشتعال کی حالت میں تھے۔ اس موقع پر گاندھی جی عدم تشدد اور حکومت سے عدم تعاون کا طریقہ کار پیش کیا۔ ہمارے علماء نے اس کو ترک موالات کا نام دیا۔ ۲ رجون ۱۹۲۰ء کو آل پارٹیز کانفرنس الہ آباد میں سب نے متفق ہو کر ترک موالات کے طریقہ کار کو قبول کر لیا۔ اس سلسلہ میں مولانا ابوالکلام آزاد کا رویہ اتنا شدید تھا کہ وہ فرماتے ہیں۔

"اگر مسلمان کے دل میں ایک آخری چنگاری بھی ایمان کی باقی ہے۔ تو کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ صلح یا صفائی کا ہاتھ انگریزوں کی طرف بڑھا سکے۔ وہ مسلمان اپنے آباد گھروں کو چھوڑ دے، جنگلوں میں جائے۔ وہاں سانپ اور بچھوؤں کے ساتھ صلح کرے، مگر انگریزی گورنمنٹ کے ساتھ صلح نہیں کر سکتا ہے[1]

یہاں ایک کمیٹی تشکیل دی گئی جس نے "ترکِ موالات" کو روبعمل لانے کے لیے ایک پروگرام بنایا جس کی کانفرنس نے منظوری دی۔ وہ درج ذیل اجزاء پر مشتمل تھا۔

---

[1] خطبات آزاد۔ مرتب مالک رام۔ طبع دہلی ۱۹۷۴ء۔ ص ۴۹

۱۔ ہر قسم کے سرکاری خطابات واپس کر دیے جائیں۔

۲۔ سرکاری اسکولوں اور کالجوں کا بائیکاٹ کیا جائے۔

۳۔ سرکاری عدالتوں کا بائیکاٹ کیا جائے۔

۴۔ سرکاری ملازمتوں سے استعفے دے دیا جائے۔

۵۔ سرکاری اسمبلیوں کے انتخابات میں حصہ نہ لیا جائے۔

۶۔ صرف اپنی ملکی اشیا اور مصنوعات استعمال کی جائیں۔

ان تمام ذرائع سے حکومت پر دباؤ ڈالا جائے تاکہ مقصد خلافت اور مقصد سوراج حاصل کیا جائے۔ مولانا شیخ محمود الحسن نے ان اصولوں کی بنیاد پر ایک فتویٰ مرتب کیا جس پر پانچ سو علماء نے دستخط ثبت کیے۔

قوم نے اس پروگرام پر سختی سے عمل کیا۔ خطابات واپس کر دیے۔ انتخابات کا بائیکاٹ کیا۔ جیلیں ویران ہوگئیں۔ طلباء اور استادوں نے اسکول اور کالج چھوڑ دیے۔ سرکاری ملازمت سے کثیر تعداد نے استعفے دے دیے۔ حتیٰ کہ فوج سے بھی بعض لوگوں نے استعفے دے دیے۔ گرفتاریاں پیش کر کے جیل خانے بھر دیے۔

## خلافت تحریک کا عدالتی نظام

اس زمانہ میں مولانا منظور نعمانی لکھتے ہیں۔ اس سلسلہ میں میرا قیام مئو میں تھا یوں تو ملک کے سب ہی حصوں میں تحریک خلافت کا زور شور تھا لیکن مئو ضلع اعظم گڑھ کا جو حال تھا وہ شاید ہی ہندوستان کے کسی دوسرے بڑے یا چھوٹے شہر کا رہا ہو۔ معلوم ہوتا تھا کہ یہاں اسلامی حکومت قائم ہوگئی ہے۔ چونکہ تحریک کے پروگرام میں سرکاری عدالتوں کا بائیکاٹ بھی شامل تھا۔ اس لیے خلافت کمیٹی نے اپنی عدالتیں بھی قائم کی تھیں۔ یاد آتا ہے کہ مئو کے معمر بزرگ شاہی جامع مسجد کے امام بشیر اللہ اور دارالعلوم دیوبند کے فاضل مولانا محمد

(مولانا عبداللہ غازی مرحوم جو ایک بہت نیک اور فرض شناس اہل حدیث عالم تھے) اس عدالت کے قاضی (جج) تھے۔ ہر قسم مقدمات اور نزاعات مسلمانوں کے بھی اور غیر مسلموں کے بھی اس عدالت میں آتے تھے اور ان کے فیصلے کیے جاتے تھے۔ اور فریقین بلا چون وچرا ان فیصلوں کو مانتے تھے۔

مسلمانوں نے ایک پولیس فورس بنائی تھی۔ یہ لوگ خاکی پہنے ہوتے تھے اور ایک طرح کی شراب بندی (خلافت کے رضاکار) جو پولیس کی خدمات انجام دیتے تھے۔ ان کو پکڑ لاتے اور عدالت کے حکم سے ان کے کوڑے لگائے جاتے اور کوئی سرکشی اور سرتابی کا مظاہرہ نہیں کرتا تھا۔

شہر میں سرکاری تھانہ اسی طرح تھے، دوسرے سرکاری ادارے اور محکمے موجود تھے لیکن اس عرصہ میں ان لوگوں کے لیے گویا کوئی کام نہیں تھا۔ عوام کے اخلاق اور کردار پر بھی غیر معمولی اثر پڑا تھا۔ جرائم اور لڑائی جھگڑے تقریباً ختم ہو گئے تھے۔ کم از کم مئو کا تو یہی حال تھا۔ وہ حقیقی معنی میں دارالامن بلکہ ایک طرح کا دارالاسلام بن گیا تھا۔[1]

## انگریزی مال کا بائیکاٹ

ایک آخری ضرب حکومت پر انگریزی مال کا بائیکاٹ تھا۔ سودیشی مال کو پھیلانے اور کھدر پہننے کی اشاعت کی گئی۔ گھر گھر میں چرخے چلنے لگے اور کھڈیاں کھل گئیں۔ گاڑھا کھدر تیار ہونے لگا۔ گلیوں کوچوں میں لوگ یہ نعرہ لگاتے پھرتے تھے۔

"میری ماں بہنو، چرخہ چلا لو"

یہ ایسا اقدام تھا جس سے مانچسٹر اور لورپول کے سوتی پارچہ بافی کے کارخانے

---

[1] رسالہ میثاق لاہور ماہ فروری ۸۵ء مضمون خلافت تحریک اور اس کے اثرات

مولانا منظور احمد نعمانی

بند ہوگئے۔ انگریزی کپڑوں کو جمع کر کے برملا آگ جلائی گئی۔ یہ لیڈر کھدر پوش تھا[1] اور سودیشی مال استعمال کرنے کی تلقین کر رہا تھا۔ انگریز تاجر قوم ہے۔ یہ ضرب اس پر بہت کاری لگی۔ اس زمانہ سے انگریزی اشیاء سے نفرت کا جذبہ پیدا ہو چلا تھا۔

تحریک ترک موالات بڑے زور شور سے چل رہی تھی۔ ملک میں ہیجان برپا تھا۔ لوگ جیلوں میں جا رہے تھے۔ اس زمانہ میں ایک واقعہ پیش آیا۔ ۵ فروری ۱۹۲۱ء کو چورا چوری (بہار) کے پولیس تھانہ پر مشتعل دیہاتیوں نے حملہ کر دیا۔ یہ بات گاندھی جی کے فلسفہ عدم تشدد کے خلاف تھی۔ اس کو بہانہ بنا کر گاندھی جی نے اپنا اسے ۱۲ فروری کو تحریک ختم کرنے کا اعلان کر دیا۔ تحریک عین شباب پر بتاشے کی طرح بیٹھ گئی۔ یہ ایک معمولی سا واقعہ تھا۔ مگر گاندھی جی نے اس پر بہت بڑا اقدام کر ڈالا۔ اس سے مسلمانوں میں بڑا غصہ پھیلا۔ گاندھی جی کے اس اقدام پر آج تک مختلف حلقوں میں تنقید ہوتی رہتی ہے۔

## قائدین کی گرفتاری

تحریک ہجرت اور تحریک ترک موالات کی ناکامی کے بعد حکومت بھی شیر ہو گئی۔ اس نے گرفتاری کا سلسلہ شروع کیا۔ ۸ جولائی ۱۹۲۱ء کو کراچی میں خلافت کانفرنس کا اجلاس ہوا۔ اجلاس میں مولانا محمد علی جوہر نے بہت بے باکانہ تقریر کی۔ انہوں نے فرمایا۔

"اگر برطانوی حکومت معاہدہ سیورے پر عمل درآمد کرنے کے لیے یونان کی عملی حمایت کرے تو کانگریس کے آئندہ اجلاس احمد آباد میں ملک کی آزادی کا اعلان کر دیا جائے گا۔ انھوں نے پانچ سو علماء کا فتویٰ پڑھ کر سنایا کہ آج سے برطانوی فوج میں نوکری کرنا یا انگریزوں کی بھرتی میں امداد کرنا دونوں حرام ہیں۔"

اس تقریر پر مولانا محمد علی کو اور دوسرے زعماء کو حکومت نے گرفتار کر لیا ان پر کراچی میں بغاوت کا مقدمہ چلایا گیا (ستمبر ۱۹۲۱ء) مولانا محمد علی نے مقدمہ میں اپنی صفائی خود پیش کی۔ ان کی تقریر دو روز تک

---

[1] ملک نصر اللہ خان عزیز مدیر ایشیا کی اسی زمانہ میں شادی ہوئی تھی۔ شب زفاف میں دولہا اور دولہن دونوں کھدر میں ملبوس تھے۔

جاری رہی۔ فصاحت و بلاغت، روانی و برجستگی اور دلائل و براہین میں یہ [illegible] تقریر ہے۔ بہرکیف ان سب کو دو دو سال قید با مشقت کی سزا دی گئی اور بیجاپور کے قلعہ میں بھیج دیا گیا مولانا محمد علی نے اس موقع پر یہ شعر پڑھا تھا۔

مستحق دار کو حکم نظر بندی ملا
کیا کہوں کیسے رہائی ہوتے ہوتے رہ گئی

یہ فیصلہ جج نے جیوری کی متفقہ رائے کے علی الرغم سنایا تھا۔ (۱۲ نومبر ۱۹۲۱ء) علماء کی گرفتاری کے بعد ملک میں ہر طرف گرفتاریوں کا سلسلہ چل پڑا۔ ہزاروں آدمی جیلوں میں چلے گئے۔ ۵ نومبر ۱۹۲۱ء کو خلافت کمیٹی دہلی نے رضاکاروں کو سول نافرمانی کا حکم دیا۔ اس پر ۳۰ ہزار رضاکاروں نے ممنوع جلوس نکالا اور سب جیلوں میں چلے گئے۔

## خلافت کا خاتمہ

ترکی میں خلافت کا خاتمہ بڑے ڈرامائی انداز میں ہوا۔ مصطفیٰ کمال پاشا نے گرانڈ نیشنل اسمبلی [illegible] ہفتہ کے دن خلافت کے خاتمے، خلیفہ کی جلاوطنی اور خاندان کی ضبطی کی [illegible] [illegible] کے دن ۳ مارچ ۱۹۲۴ء - ۲۹ رجب ۱۳۴۲ھ) اسمبلی کی بھاری اکثریت نے قرارداد منظور کر لی۔ ساری کارروائی نہایت عجلت میں طے پا گئی۔ منگل کے دن دو بجے شب سے خلیفہ کو آگاہ کیا گیا اور اسی وقت پولیس نے جہاز میں بٹھا کر جلاوطنی پر روانہ کر دیا۔ [illegible] نہائی نوکر کو بھی اس طرح [illegible] نکالتے ہیں جس طرح خلیفہ کو نکالا گیا۔

چاک کر دی ترک ناداں نے خلافت کی قبا
سادگی مسلم کی دیکھ اوروں کی عیاری بھی دیکھ — اقبال

جب ترکی میں خلافت کا خاتمہ ہو گیا تو

وہ شاخ ہی نہیں رہی جس پر آشیانہ تھا

تو اس کا اثر ہندوستان میں خلافت تحریک پر پڑا۔ ساری سرگرمیاں ٹھنڈی پڑتی چلی گئیں۔

## علامہ شبیر احمد عثمانی کا تبصرہ

"پہلی جنگ عظیم کے ختم ہونے پر مسلمانوں کے سامنے خلافت اسلامیہ کے زوال نے ایک نئی اور زوردار تحریک کھڑی کر دی۔ تحریک خلافت کا سیلاب اس زور شور سے اٹھا جس کی نظیر اس سے پہلے کسی تاریخ میں نہیں ملتی۔ ملک کا گوشہ گوشہ خلافت اور ترک موالات کے نعروں سے گونج اٹھا۔ یوں کہیے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد سے اس قدر ہمہ گیر، شجاعانہ، گرم جوش اور بے پناہ مظاہرہ یہاں کی زمین و آسمان نے نہ دیکھا تھا۔

نام نہاد انڈین نیشنل کانگریس نے موقعہ کو غنیمت دیکھ کر اس نیم مذہبی اور نیم سیاسی تحریک کو اپنا لیا۔ کوئی ہوش مند، باخبر اور ذی انصاف آدمی انکار نہیں کر سکتا کہ سمندر کی طوفانی موجوں کی طرح اٹھتے ہوئے مسلمانی جوش و ایثار نے اس وقت کانگریس کے قلب میں روح حیات پھونکی۔ اور برطانوی قہرمانیت کا خوف دہراس عام پبلک کے دلوں سے نکالا۔ اب لوگوں کو جیل بلکہ پھانسیوں کا ڈر بھی خوف زدہ نہ کرتا تھا۔ یہ بہت بڑا فائدہ تھا جو اس تحریک سے پبلک کو پہنچا مسلمانوں کی سیاست بغیر کسی تمیز اور تمحیص کے کچھ عرصہ تک یوں ہی چلتی رہی۔" [1]

## مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کا تبصرہ

"یہ دور متضاد اور بے جوڑ عناصر کا ایک عجیب مجموعہ تھا۔ جس کے مختلف اجزاء کے درمیان کوئی منطقی ربط نہ تھا۔ اور اس لیے آخر تک ان کی ترکیب سے کوئی متحد

---

[1] خطبات عثمانی۔ ص ۲۰ - ۱۹۔

المزاج نظامِ فکر و عمل نہ بن سکا۔ ایک طرف تو اس دَور میں وہ اسلامی شعور جو دورِ اوّل میں موت کے قریب پہنچ چکا تھا۔ از سرِ نو پیدا ہُوا۔ اور لوگ اسلام کو اصلی صورت میں دیکھنے لگے۔ مگر دوسری طرف وہ "مُسلم قومیت" جو دورِ اوّل میں پیدا ہُوئی تھی ترقی کر کے "مُسلم قوم پرستی" میں تبدیل ہوگئی۔ اور اس دَور کے بِنا آخر تک اسلام اور مسلمان قوم پرستی کے اصولی فرق کو نہ سمجھ سکے۔ ایک طرف اسلام کا نظریہ اجتماع اور تصورِ حکومت واضح صورت میں لوگوں کے سامنے آیا۔ اور دوسری طرف اس بے معنی خلافت کی حمایت بھی کی گئی جس پر اسلامی اصطلاح خلافت کا اطلاق کسی طرح نہ ہوسکتا تھا۔"[1]

## مسلمانانِ ہند کی بیداری

**مُسلمان قوم۔** اپنی سرشت اور مزاج میں ایک خاص قوم ہے۔

اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی — اقبالؔ

اس قوم کو اسلام کے نام پر منتفق اور متحد کیا جاسکتا ہے اور کسی نام پر نہیں کیا جاسکتا۔ اسلام کے نام پر اس کو متحرک کیا جاسکتا ہے۔ مال و دولت کے نام پر متحرک نہیں کیا جاسکتا۔ جب یہ متحرک ہو جاتی ہے تو پھر جان اور مال ہر قسم کی قربانی دینے کے لیے تیار ہو جاتی ہے۔ اسلام کے نام پر یہ قوم کامل ایک صدی تک (۱۷۶۰ء – ۱۸۶۸) انگریزی حکومت کے خلاف جہاد کرتی رہی۔ اسلام کے نام پر اُس نے تحریکِ خلافت کے دَور میں (۱۹۲۰ء) ترکِ موالات۔ قید و بند اور ہجرت کی عظیم قربانیاں دیں۔ اسلام کے نام پر تحریکِ پاکستان کے لیے (۱۹۴۷ء)

---

[1] ادبیاتِ مودودی۔ ص۔ ۲۸۹–۲۹۰

اس نے قتل و غارت گری برداشت کی، گھر بار چھوڑا۔ اسلام کے نام پر قادیانیوں کے خلاف (۱۹۷۴ء) میں یہ قوم متحرک ہوگئی۔ اسلام کے نام پر تحریک نظام مصطفےٰ (۱۹۷۷ء) میں یہ قوم سینہ تان کر فوج کی بندوقوں کے سامنے کھڑی ہوگئی محرک عمل ان کے لیے اسلام ہے۔ نقطہ ماسکہ ان کے لیے اسلام ہے۔

## خلافت تحریک کے اثرات

دست قدرت کی کارفرمائیاں عجیب و غریب ہوتی ہیں۔ خلافت تحریک مادی اسباب و علل سے ماورائی ایسی تحریک تھی جو غیر متوقع انداز میں پیدا ہوئی۔ غیر معمولی انداز میں پروان چڑھی۔ اور غیر معمولی اثرات و ثمرات چھوڑ گئی۔ اس لحاظ سے اس کو اگر ایک لطیفہ غیبی تصور کیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

انگریزی حکومت کے مدبروں اور شاطروں نے مسلمانوں کو دین سے اور تاریخ سے بیگانہ بنا دیا تھا۔ ان کو پراگندہ ذہن اور پراگندہ فکر بنا دیا تھا بقول اقبال ؎

سبق شاہین بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا

نئی نسلوں کی انتہائی معراج خیال چند ملازمتوں کا حصول رہ گیا تھا۔ حکمران کی ساحری نے اس قوم کو پوری طرح سلا دیا تھا۔ ان حالات میں کتنا ہی زیرک انسان ہو، یہ پیشین گوئی ہرگز نہیں کر سکتا تھا۔ کہ جلدی ہی یہ قوم بیدار ہونے والی ہے اور عظیم الشان قومی جہاد کا ہراول دستہ بننے والی ہے۔ خلافت تحریک نے اعجوبہ کارنامے انجام دیے۔ اس کے نتائج ہمہ گیر اور دور رس نکلے۔

۱۔ خلافت تحریک نے ۷۰ سالہ سابقہ دور قیادت کا جمود اور تعطل توڑ پھینکا۔ خوشامد یا اور مصلحتوں کا دور ختم ہوگیا جرأت و شہامت، معارضہ اور مقابلہ کا دور شروع ہوگیا۔ خود فراموشی ختم ہوئی خود شعوری پیدا ہوئی۔ مسلمانوں نے اب دوسروں کی طرف دیکھنا ترک کر دیا۔ اب اپنے دست و بازو پر اعتماد کرنا شروع کر دیا۔

۱- اس نے سیاسی اور غیر سیاسی، دین اور دُنیا کی تفریق ختم کر دی۔ اور ہر معاملہ میں اسلامی اصولوں کو اوّلیت دی۔

۲- اس نے مُسلمان قوم کو بیدار کر دیا۔ اور سیاست کے منجدھار میں لا کر کھڑا کر دیا۔

۴- اس تحریک نے علماء اور دینی طبقہ کو مدرسوں اور خانقاہوں سے باہر نکالا۔

۵- اس تحریک نے جیلوں اور پھانسیوں کا خوف عملاً دُور کر دیا۔ جیل جانا قابلِ فخر بن گیا۔

۶- اس تحریک نے انگریزی معاشرت، انگریزی اشیاء سے نفرت پیدا کی۔ انگریز کی نقالی کو روکا۔ دیسی سامان اور اپنی تہذیب کی عظمت سکھائی۔

۷- اس تحریک نے انگریزی اسکولوں اور کالجوں کا پہلی مرتبہ بائیکاٹ سکھایا۔

۸- سیاسی سرگرمی، قربانی و ایثار کے اعتبارات سے اُس نے مسلمان قوم کو صفِ اوّل کی قوم بنا دیا۔ اقوامِ عالم کے درمیان مُسلمانوں کا وقار بڑھا دیا۔

۹- اس تحریک نے ہندوستانی مسلمانوں کو اقوامِ عالم سے مربوط کر دیا۔ مُسلمانوں کا وزن بین الاقوامی مجالس میں محسوس کیا جانے لگا۔

۱۰- اس تحریک نے پُوری مسلمان قوم کو غسلِ صحت دے دیا۔ پوری مسلمان قوم کی دینی تربیت ہُوئی۔ تحریکِ جہاد کی ناکامی کا ایک سبب یہ تھا۔ کہ برصغیر کے عام مُسلمانوں کی اسلامی تعلیم و تربیت حد درجہ ناقص تھی۔ انگریزی دَور میں تو یہ نقص کئی گنا بڑھ گیا تھا۔ خلافت تحریک پہلی عوامی تحریک تھی۔ اس نے عوام کی تربیت اسلامی انداز پر کی۔ ان کے اندر دین سے رغبت پیدا کی۔

۱۱- تحریکِ پاکستان کا بیج تحریکِ خلافت کے دَور میں ہی بویا گیا تھا۔ اس دور میں اسلامی خلافت کا نعرہ لگایا گیا تھا۔

۱۲- اس تحریک نے برِصغیر کو اس کثرت سے زعماء اور قائدین، خطباء اور مقررین عطا کیے

کہ کبھی میسر نہ آسکے تھے۔ اس تحریک کا ایک قائد مولانا محمد علی تھا۔ جس کے انتقال پر مشہور انگریز اہلِ قلم ایچ جی ویلز نے لکھا تھا۔

"وہ اپنے سینہ میں نپولین کا دل، اپنے منہ میں برک کی زبان اور اپنے ہاتھ میں میکالے کا قلم رکھتا تھا۔"

اس تحریک کا ایک دوسرا قائد مولانا ظفر علی خاں تھا جس کے متعلق پنجاب کے گورنر سر گلینسی نے کہا تھا۔

"کسی ماں نے ظفر علی خاں سے بڑھ کر انگریزی سلطنت کا دشمن نہیں جنا۔"

۱۳۔ تحریک خلافت نے گاندھی جی کو ملک میں مقبول بنایا۔ کانگریس کو مقبول بنایا ڈاکٹر سید کاردی لکھتے ہیں۔

*******

# گیارھواں باب

# نامرادی اور پراگندہ ذہنی

## (۱۹۲۴ء ——— ۱۹۳۹ء)

### ہندو جارحیّت کا فروغ

مغربی تعلیم کے ساتھ ہی ہندوؤں میں احیائے مذہب اور قومیت کے فروغ کی کوششیں جاری ہو گئی تھیں۔ مگر ایک خاص واقعہ نے اس میں تندی اور غیر معمولی سرگرمی پیدا کر دی۔ لارڈ کرزن (د۔ ۱۹۰۵ء) وائسرائے ہندوستان نے سیاسی نستعلیق زبان سے انحراف کر کے ہندوؤں کے متعلق ذرا سخت الفاظ استعمال کیے۔ اس نے انھیں چالاک بزدل اور ڈرپوک کہا۔ ۱۹۰۵ء کا ہندو ۱۸۵۷ء کا ہندو نہیں تھا۔ بنگالی بابو انگریزی تعلیم یافتہ تھا۔ بلکہ برطانوی نوکر شاہی کا دست بازو تھا۔ وہ کرزن کے الفاظ پر سخت ناراض ہوئے اور اس کو جواب دینا چاہتے تھے۔ اب وہ چاہتے تھے کہ اپنے انفرادی اور اجتماعی معاملات میں بہادری اور مردانگی کا برملا اظہار کریں۔ یہاں سے ہندو قوم پرستی نے ایک نیا رجحان اور نیا رخ اختیار کر لیا۔ اربندو گھوش بنگالی، ہردیال سنگھ دہلوی، دامودر ویر ساورکر اس نئے دور کے رہنما تھے۔ انھوں نے جارحیت پسند قوم پرستی کی تلقین کی۔ اور اس جوش اور جذبہ سے کی کہ شاید ہی کوئی تعلیم یافتہ شخص ان کی تلقین کے اثرات سے بے خبر رہا ہو۔ قوم پرستوں کے مختلف درجات اور مختلف رنگ تھے۔ باغیوں اور دہشت پسندوں سے لے کر دستور پسندوں اور ملازمت پیشہ افراد تک سب کسی نہ کسی درجے میں قوم پرستی کی تحریک سے متاثر تھے۔ اس کے بعد سے معاشیات، سیاسیات، تجارت، تعلیمات، ذرائع

ہر میدان میں ہندو قوم پرستی کی چھاپ نظر آتی ہے۔

## ہندو مہاسبھا

اب تک کچھ لوگوں کی سرگرمیاں زیر زمین ہوتی تھیں۔ اور عموماً یہ لوگ غیر منظم ہوتے تھے لیکن اب قوم پرستوں نے ضرورت محسوس کی کہ موجودہ سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ ان کا ایک علانیہ سیاسی ادارہ ہونا چاہیے۔ کانگریس کو وہ لوگ قوم پرستی کے معیار سے فروتر سمجھتے تھے۔ اس لیے ۱۹۱۵ء میں ہندو مہاسبھا کے نام سے ایک انجمن قائم کی۔ ویر ساورکر اس کے صدر منتخب ہوئے۔ ڈاکٹر مونجے، مرہٹہ اور لالہ لاجپت رائے لاہوری وغیرہ اس کے سرکردہ لیڈر تھے۔ ان لوگوں کے پیش نظر متحدہ ہندوستان میں خالص ہندو حکومت قائم کرنا، اور ہندو تہذیب کو فروغ دینا تھا۔ مذہبی اقلیتوں کے متعلق ان کا نقطہ نظر یہ تھا کہ وہ ہندو مذہب ورنہ ہندو تہذیب ضرور اختیار کریں۔ ہر سیاسی اور معاشرتی معاملہ میں وہ اپنا انتہا پسندانہ نقطہ نظر پیش کرتے رہتے تھے۔ ۱۹۲۶ء میں اعتدال پسند ہندوؤں کو شکست دے کر مہاسبھا کے ہم خیال لوگوں نے نیشنل کانگریس پر بھی قبضہ کر لیا تھا۔ اس کے بعد سے کانگریس بھی انتہا پسندوں کی راہ پر چل پڑی۔ سیاسی، معاشی، معاشرتی، تجارتی غرض کہ ہر میدان میں اب مہاسبھائیوں کا کم از کم فکری غلبہ ہو گیا تھا۔

بلا شبہ ہندو جارح قوم پرستی کا آغاز تو انگریزی حکومت کے جواب میں ہوا تھا۔ مگر جلد ہی اس جارحیت کا ہدف اور رُخ مُسلمانوں کی طرف ہو گیا۔ مسلمانوں کا مذہب، ان کی تہذیب، ان کی سیاست حتیٰ کہ ان کا انفرادی وجود بھی ان قوم پرستوں کی نظر میں خار بن کر کھٹکنے لگا۔ وہ مسلمانوں کی ہر شے کی مخالفت کرتے تھے۔

---

ـلہ ساورکر کے متعلق مولانا ظفر علی خاں کا یہ شعر مشہور ہے ؎

بھارت میں بلائیں دو ہی تو ہیں اک ساورکر اک گاندھی ہے
اک جھوٹ کا چلتا چکر ہے اک مکر کی اٹھتی آندھی ہے

# قوم پرستوں کے عزائم

مسلمانوں کے متعلق ان رہنماؤں کے کیا ارادے اور کیا عزائم تھے وہ ان کے اپنے اقوال سے ظاہر ہے۔ کہ مسلمان اپنے مذہب، اپنی تہذیب اپنی زبان سے عاری ہو جائیں تب ہندوستان میں رہ سکتے ہیں۔

- "وہ تمام مسلمان جو ہندوستان میں پیدا ہوتے ہیں ہمارے ہیں۔ اسی طرح جس طرح انگریز ہیں۔ ہر ایک ہمارا دشمن ہے۔ اس لیے دونوں کو تباہ کرنا چاہیے۔" (تلک ۱۸۰۰ء)

- "ہندوستان کو نظریہ اور عمل کے لحاظ سے ایک ہندو ریاست ہونا چاہیے جس کا کلچر ہندو ہو جس کا مذہب ہندو ہو جس کی حکومت ہندوؤں کے ہاتھ میں ہو۔"
- "مسلمان اپنے آپ کو مسلمان ہندو کہیں۔"

ڈاکٹر راجہ مار (ہر دیال) کرنی - ۱۹۰۵ء صدر ہندو مہا سبھا۔

- "مسلمان ہندو رسوم و رواج کا احترام کریں۔" (ہر دیال)
- "میں چھ سات کروڑ بھائیوں کو واپس ویدک دھرم میں لاؤں گا" (سوامی شردھانند)
- "اردو ملیچھوں (گندوں) کی زبان ہے۔" (بھائی پرمانند)
- "مسلمان ہندوستان میں ایسے ہیں جیسے جرمنی میں یہودی۔ ان کے ساتھ بھی ویسا ہی سلوک ہونا چاہیے[1]۔" (ویر ساورکر۔ پاکستان ناگزیر تھا۔ ص ۲۸۴)

---

[1] سید محمد طفیل حسن لکھنوی نے راقم سے فرمایا (۱۹۴۱ء) کہ صوبوں میں قومی حکومتیں قائم ہو جانے کے بعد لکھنؤ یونیورسٹی کے ہندو اساتذہ اسپین کی تاریخ کا مطالعہ کرتے تھے۔ اور ندوۃ العلماء لکھنؤ کے کتب خانہ
(باقی اگلے صفحہ پر دیکھیے)

● ——— "مسلمان یہاں رہنا چاہتے ہیں تو ان کو ہندو بن کر رہنا ہوگا۔" (ڈاکٹر مونجے)

● ——— "جہاں تک کا مسلم علاقہ کاٹ کر علیحدہ کر دینا چاہیے۔" (لاجپت رائے)

● ——— "ہندوستان ہندوؤں کا ہے۔ اس میں عام قومیں شہریوں کی طرح تو رہ سکتی ہیں لیکن راج ہندوؤں کا ہی ہوگا۔ کیونکہ وہ اس ملک کے مالک ہیں۔" (ہندو مہاسبھا کے صدر ڈاکٹر...)

## ہندو مسلمان فسادات

گزشتہ ایک عشرہ سے ملک میں ہندو مسلمان اتحاد اور اتفاق کی فضا چھائی ہوئی تھی۔ اتحاد کی اس فضا سے سب سے زیادہ انگریزی حکومت اور ہندو قوم پرست ناراض تھے۔ ان دونوں عناصر نے سازش کر کے اس فضا کو ختم کرنے کی کوشش کی۔

انگریزی حکومت نے سوامی شردھانند کو جیل سے رہا کیا۔ مولیوں (جنوبی ہندوستان) نے خلافت تحریک کے زیر اثر انگریزی حکومت کے خلاف تحریک چلائی تھی۔ ان قوم پرستوں نے اس کو ہندوؤں کے خلاف قرار دیا۔ اور پھر ہندو مسلم فسادات کا آغاز ہو گیا۔ پہلا فساد ۱۹۲۲ء میں ملتان میں ہوا۔ پھر قتلوں اور فسادوں کی ایک فصل تیار ہو گئی۔ دلی، الٰہ آباد، لکھنؤ، ناگپور، جبل پور، گلبرگہ، شاہجہان پور، کوہاٹ وغیرہ میں فسادات پھوٹ پڑے۔ کوئی صوبہ ان فسادوں سے محفوظ نہ رہ سکا۔ جیسے پہلے سے کسی نے تیاری کی ہو جیسی تو ایک دم فسادات پھوٹ پڑے۔ لارڈ اروِن وائسرائے ہندوستان نے قانون ساز اسمبلی میں بیان دیتے ہوئے کہا کہ ان فسادوں میں ۲۵۰ افراد قتل ہوئے۔ ۲۵۰۰ افراد زخمی ہوئے ہیں (۲۹ راگست ۱۹۲۷ء) ڈاکٹر امبیدکر نے ۱۹۲۰ء سے ۱۹۴۰ء کے درمیان ہونے والے فسادات کا جائزہ لے کر کہا ہے۔

"ان کو ہندو مسلمان خانہ جنگی سے تعبیر کرنا چاہیے۔"

---

(بقیہ۔ شیعہ) سے بعض کتابیں نکلوا کر پڑھتے تھے۔ وہ دیکھنا چاہتے تھے کہ کس طرح اسپین والوں نے مسلمانوں کا خاتمہ کر دیا۔ آزادی کے بعد مینن نے ۲ سال اسپین میں اسی مقصد کے لیے گزارے۔ اور حکومت کو رپورٹ پیش کی۔

بعض اوقات مساجد کے سامنے نماز کے اوقات میں باجا بجانے پر اور اذان دینے کو روکنے پر مجرم قانون منع کرنے پر [illegible] مسلمانوں پر [illegible] مقدمے وغیرہ معاملات پر ہوتے تھے اور بے گناہ انسانوں کا خون بہتا تھا۔ ہندو قوم پرست پڑھے لکھے [illegible] جانتے تھے کہ قوم پرستی کی تحریک تعداد نفرت اور تشدد و غارت گری کی غذا پر [illegible] کرتے تھے۔

## شدھی

[illegible] میں تقسیم کے نقصان اور نااتفاقی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہندو قوم پرستوں نے ایسا اور جارحانہ اقدام کیا [illegible] لئے مسلمانوں کو ہندو بنانا شروع کردیا۔ ہندوستان کے بعض حصوں میں [illegible] مسلمان [illegible] مذہب اسلام سے [illegible] ان کی واقفیت بہت ہی کم تھی۔ جیسے [illegible] (راجپوت) شیخ (ملکانہ) وغیرہ ان لوگوں [illegible] چلی آتی تھی [illegible] تو دیانند سرسوتی نے ۱۹۲۰ء [illegible] نے ان [illegible] قبول کرنے [illegible] اور شدھی کے نام سے ایک تحریک جاری کردی۔

یہ مسلمانوں کی ذات پر براہ راست حملہ [illegible] مسلمان دفاع کے لیے تیار ہوئے انھوں نے اس کے جواب میں تبلیغ [illegible] اسلام قائم کی۔ مولانا غلام [illegible] نیرنگ انبالوی اس کے صدر تھے۔ اسی دور [illegible] (۱۹۲۰ء) مولانا الیاس علیہ الرحمہ نے میوات

---

لہ راقم ۱۹۴۶ء کے انتخابات کے موقعہ پر راجہ خورشید علی خان کے حلقہ (رہتک) میں کام کرنے کے لئے علی گڑھ سے گیا تھا۔ وہ [illegible] اور جاٹوں کا علاقہ تھا۔ ایک گاؤں (کلانا ج پور) میں ہم گئے۔ وہاں لوہاروں کی آبادی تھی۔ انہوں نے ایک چھپر کے اندر ایک مسجد بنا رکھی تھی جو باہر سے نظر نہ آتا تھا۔ وہ وہاں [illegible] تھے [illegible] نماز ادا کرتے تھے

نے مسلمانوں میں دینی تعلیم پھیلانے کے لیے تبلیغی جماعت قائم کی۔ آج یہ ایک مشہور جماعت ہے۔

## سنگھٹن

یہ تحریک بھی ڈاکٹر مونجے نے ۱۹۲۲ء میں شروع کی تھی۔ اس کے ذریعہ وہ ہندوؤں کو متحد و متفق بنانا چاہتا تھا۔ دوسرا مقصد یہ تھا کہ وہ ہندوؤں کو توانا طاقتور اور مسلح ہتھیار بند بنانا چاہتا تھا۔ اس مقصد کے لیے شہروں میں اکھاڑے قائم کیے جاتے تھے جہاں ہندو نوجوان ورزش کرتے تھے، لاٹھی، چاقو، خنجر کا استعمال سیکھتے تھے۔ آتشیں اسلحہ کا استعمال سکھاتے تھے۔ خون ریزی کرنا سکھاتے تھے۔

اس غرض کے لیے ڈاکٹر ہیڈگیوار نے ۱۹۰۵ء میں راشٹریہ سیوک سنگھ قائم کی تھی۔ یہ بھی اسلحہ کا استعمال سیکھتے تھے۔ ہندو مذہب کے احیاء اور ہندو غلبہ کے لیے کوشاں رہتے تھے۔ ۱۹۴۷ء کے فسادات میں ان جماعتوں نے مسلمان بستیوں پر ہلّہ بول کر قتل و غارت گری کا بازار گرم کیا۔

---

۱؎ عبدالرحمان خان حیدرآبادی دکنی نے (علامہ حبیب بنک) راقم کو سنایا (۲۰ فروری ۱۹۷۷ء سکارلپور) کہ وہ فروری ۱۹۴۷ء میں کراچی آئے تھے۔ جہاں آج پاکستان حکومت کے دفاتر ہیں وہاں میدان تھا۔ وہاں اکھاڑے تھے۔ ایک دن میرا ہندو دوست رات گیارہ بجے مجھے وہاں لے کر گیا۔ نوجوان مختلف ورزش کر رہے تھے۔ ایک طرف چیلوں اور کوؤں کو پنجروں سے نکالتے اور پھر ان کو اپنے پیروں سے روندتے تھے۔ ٹانگیں پکڑ کر چیرتے تھے۔ پرندے چیخ چلاتے تھے۔ میں نے پوچھا یہ بے رحمی کیوں ہے؟ میرے دوست نے جواب دیا اس طرح ہم اپنے نوجوانوں کے دل مضبوط کرنا چاہتے ہیں۔

## اہانتِ رسولؐ

انتہا پسند آریہ سماجیوں کی جرأتیں بڑھتی رہیں۔ مسلمانوں کی دل آزاری میں اب وہ اس درجہ بڑھ گئے کہ انھوں نے اہانت رسولؐ کرنا شروع کر دی۔ مسلمانوں کے دل میں جاگزیں ایمان بالرسولؐ کے انتہائی حساس حصّہ پر ضرب لگانا شروع کر دی۔ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارکہ پر انتہائی رکیک حملے کیے۔ انتہائی گندی زبان استعمال کی۔ یہ اقدامات بھی ایک منصوبہ کے تحت اُٹھائے گئے۔ بیک وقت کئی شہروں میں ایسے دریدہ دہن لوگ پیدا ہو گئے۔ مسلمانوں نے ان مذموم اور اشتعال انگیز حرکات کے خلاف دادرسی کے لیے برطانوی عدالتوں کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ مگر یہ عدالتیں ارتکاب جرم کا تدارک کرنے سے قاصر رہیں۔ پھر مسلمانوں نے اس حرکت قبیحہ کا خود سدّباب کیا۔ اور جان کی قربانی دے کر مفسدوں کا منہ بند کر دیا۔

(۱) دہلی میں مشہور آریہ سماجی لیڈر شردھانند نے حضور اکرمؐ کی شان میں گستاخی کی۔ اس کو قاضی عبدالرشید نے پستول کی گولی سے ۲۳ دسمبر ۱۹۲۶ء کو قتل کر ڈالا۔ پھر اقبال جرم کر لیا اور شہادت پائی۔ گاندھی جیسے قومی لیڈر نے بھی توہینِ رسولؐ کو اہمیت نہیں دی اور شردھانند کے قتل پر واویلا مچایا۔ اور کہا۔ اسلام خون ریزی کرتا ہے۔ پہلے بھی کی ہے اور اب بھی کرتا ہے۔ اس کا جواب دینے کے لیے مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی نے "الجہاد فی الاسلام" کتاب لکھی۔ (۱۹۲۷ء)

۲۔ لاہور میں مہاشہ کرشن نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیخلاف ایک توہین آمیز گستاخانہ کتاب "رنگیلا رسول" لکھی۔ راجپال آریہ سماجی نے اسکو شائع کیا مسلمانوں نے راجپال کیخلاف توہین رسولؐ کا دعویٰ دائر کر دیا (۲۴ مئی ۱۹۲۴ء) عدالت نے اسکو مجرم قرار دیکر ڈیڑھ سال قید بامشقت اور ایک ہزار روپیہ جرمانہ کی سزا دی (۱۸ جنوری ۱۹۲۷ء) مگر سیشن کورٹ کے جج کرنل الیسی نکوس نے صرف ۶ ماہ کی سزا کر دی (۸ فروری ۱۹۲۷ء) ہائی کورٹ کے کرنل دلیپ سنگھ مسیح نے مجرم کو باعزت طور پر بری کر دیا (۴ مئی ۱۹۲۷ء) مسلمان ان عدالتی کاروائیوں سے بے حد برافروختہ ہوئے۔ لاہور کے واحد مسلمان اخبار "مسلم آؤٹ لک" نے ان فیصلوں کیخلاف لکھا تو مالک اخبار نورالحق اور مدیر سید دلاور شاہ کو دو دو

ماہ کی قید اور ایک ایک ہزار روپیہ جرمانہ کی سزا دی۔ اس سزا نے مسلمانوں کے اندر ہیجان برپا کر دیا۔ ہر جگہ احتجاجی جلسے ہوئے اور تقریریں ہوئیں اس زمانہ میں ایک نوجوان علم الدین نے راجپال کے خنجر گھونپ دیا (۶ اپریل ۱۹۲۹ء) اور خود کو پولیس میں پیش کر دیا۔ یہ مقدمہ جب ہائیکورٹ میں گیا تو محمد علی جناح نے پیروی کی مگر عدالت نے پھانسی کی سزا کو برقرار رکھا۔ غازی علم الدین شہید کو میانوالی جیل میں ۳۱ اکتوبر ۱۹۲۹ء کو پھانسی دے دی گئی۔

۳۔ حیدرآباد سندھ میں نتھورام آریہ سماجی نے دریدہ دہنی کی اسکو ایک آنکھ والے عبدالقیوم ہزاروی نے کراچی کی عدالت میں قتل کیا (ستمبر ۱۹۳۴ء)۔

۴۔ کلکتہ میں بھولاناتھ نے اہانت رسول کی۔ عبداللہ اور امیر احمد نے اس پر قاتلانہ حملہ کیا۔ وہ تو بچ گیا مگر اسکا نوکر مارا گیا۔

۵۔ ویر بھان نے ملتان میں شانِ رسالت میں گستاخی کی۔ اسکو غازی محمد بخش نے قتل کر دیا۔

۶۔ پلول ضلع گوڑگانوہ میں شفاخانہ حیوانات کے ڈاکٹر رام گوپال نے دریدہ دہنی کا تحفظ کے خیال سے مستقل اسکا تبادلہ خالص ہندو علاقہ نارنوند میں کر دیا۔ غازی مرید حسین جہلمی نے وہاں جا کر ۶ اگست ۱۹۳۶ء کو قتل کر دیا۔ عدالت نے ۲۴ ستمبر ۱۹۳۶ء کو انہیں پھانسی دے دی۔

۷۔ جیسے ناموس رسولؐ پر قربان ہونیوالے یکے بعد دیگرے پیدا ہوتے رہے تو ان دریدہ دہنوں کی زبانیں بند ہو گئیں۔

## ہندو جارحیت کا پس منظر

یہاں بعض لوگوں کے دلوں میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ دونوں قومیں صدیوں سے یکجا رہتی چلی آتی ہیں۔ پُرامن ہمسایہ بن کر رہتے رہے ہیں۔ اب یک لخت یہ نفرت اور حقارت کا لاوا کہاں سے پھوٹ نکلا۔ ابھی چار پانچ سال قبل کی بات ہے خلافت تحریک کے دور میں دونوں میں اتفاق اتحاد کی غیر معمولی فضا قائم تھی۔ اب اچانک فسادات اور خون ریزی نے فضا کو مکدر کر دیا۔ بات یہ ہے کہ برطانوی حکومت خلافتی دور کے اتحاد سے حد درجہ خائف ہو گئی تھی۔ وہ کسی نہ کسی طریقہ سے اس اتحاد کی فضا کو افتراق اور عداوت کی فضا میں تبدیل کرنا چاہتی تھی۔ اس غرض کے لیے اس نے بعض انتہا پسند آریہ سماجی لیڈروں سے ساز باز کی۔ یہ آریہ سماجی خود بھی اس اتحاد

لی انما سے نفرت کرتے تھے ۔ ان کا مطمحِ نظر ہندوستان میں ہندو حاکمیت اور سامراج قائم کرنا تھا۔ ہندو تہذیب اور ہندو رسوم و رواجات کا غلبہ تھا۔ مزید براں خلافتی دور میں مسلمان زعماء اور عوام نے جس جوش وخروش اور جن قربانیوں کا مظاہرہ کیا جس بے خوفی سے جیلیں بھریں اور ہجرت اختیار کی۔ اس سے ہندو رہنماؤں کے دل میں خوف پیدا ہوگیا ۔ مسلمانوں کا سیاسی قد کاٹھ بلند ہوگیا۔ اقوام عالم کی نگاہ میں مسلمانوں کا مقام بہت برتر ہوگیا۔ ہندوؤں کے خیال کے مطابق اگر مسلمان سیاست میں اسی نہج پر ترقی کرتے رہے تو وہ ایک دن سب سے آگے نکل جائیں گے اس لیے انگریز اور ہندو دونوں ان کو سیاست میں پیچھے دھکیلنا چاہتے تھے ۔ بعض لوگوں کے خیال کے مطابق خود گاندھی جی نے اسی اندیشہ کے پیشِ نظر یک طرفہ ترک موالات تحریک کے خاتمہ کا اعلان کردیا تھا۔ بہرکیف ہندو خاص طور پر آریہ سماجی انتہا پسند مسلمانوں کے وجود کو قومی مقاصد کے راستہ میں ایک رکاوٹ سمجھتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے اگر مسلمان اسی رفتار سے چلتے رہے تو پھر ہندو انتہا پسندوں کا خواب کبھی بھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکے گا۔

اس لیے انھوں نے مسلمانوں کو بدراہ کرنے اور ذہنی طور پر مرعوب کرنے کے لیے فسادات شروع کرائے ۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد مسلمانوں کی پیش قدمی رُک گئی۔ انھوں نے دفاعی پوزیشن اختیار کر لی ۔ اور وہ ذہنی انتشار میں مبتلا ہو گئے۔

اس صورت حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا محمد علی لکھتے ہیں ۔ کوکناڈا جیل سے رہائی کے بعد۔

”ہمارے قید ہوتے ہی ہندو مہا سبھائی مہاراشٹریہ نے مہاتما گاندھی اور عدم تعاون کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا۔ خود مہاتما گاندھی نے حکومت کو الٹی میٹم دے چکنے کے بعد بردولی میں وہ روش اختیار کی جسے ملک نے ہتھیار ڈالنے کے مترادف سمجھا۔ اور پھر وہ ہماری طرح قید کر دیے گئے۔ ان کے قید ہوتے ہی پنڈت موتی لال نہرو اور دیش بندھو آزاد ہوئے۔ اور بجائے سول نافرمانی

کے انھوں نے گیا[1] میں سوراج کے نام سے وہ علم بغاوت بلند کیا جس نے عدم تعاون کی تحریک کا خاتمہ کر دیا۔ پھر لطف یہ کہ ہندو مہا سبھائیوں نے شدھی اور سنگھٹن کی تحریکیں شروع کیں۔ جنھوں نے مذہبی تعصبات کی اس آگ کو بھڑکا دیا جسے ہم ٹھنڈا کر چکے تھے۔ اس طرح ہمارا کیا کرایا کام اکارت گیا۔"[2]

## قتل عام بازار قصہ خوانی

خلافت تحریک کے زمانہ کا جوش وخروش ایک مدت کے بعد ۲۳ راپریل ۱۹۳۰ء کو پشاور میں دیکھنے میں آیا۔ خلافت تحریک کے کارکن سید لعل بادشاہ بخاری کی سرکردگی میں وہاں سرگرم عمل تھے۔ وہ غفار خان کی تحریک "خدائی خدمت گار" میں کام کرتے تھے اس لیے کہ خود غفار خاں اس دور میں خلافت سے متفق تھا۔

ان لوگوں نے ۲۳ راپریل ۱۹۳۰ء کو شراب خانوں کے سامنے پکٹنگ کرنے کا پروگرام بنایا۔ حکومت نے ان کے چند لیڈروں کو گرفتار کر لیا۔ پولیس کے سپاہی لیڈروں کو کابلی دروازے لے جا رہے تھے جو قصہ خوانی بازار کے سرے پر واقع ہے۔ عوام کا بھی ہجوم لیڈروں کے ہمراہ تھا۔ ہجوم بے قابو ہو گیا حکومت نے گولی چلانے کا حکم دے دیا۔ مگر گڑھوال رجمنٹ کے نوجوانوں نے گولی چلانے سے انکار کر دیا جس پر گورا فوج نے نہایت بے رحمی سے گولی چلا دی سینکڑوں افراد شہید ہو گئے اور سینکڑوں زخمی ہو گئے۔ آزادی قبائل کے مشہور رہنما مفکر سرحد حاجی عبدالرحیم پوپلزئی بھی شہید ہونے والوں میں تھے۔ آزادی کے بعد ۱۹۸۳ء میں اس مقام پر ایک یادگار تعمیر کر دی گئی ہے۔

---

1. گیا بہار کے ایک شہر کا نام ہے جہاں بدھ کو گیان حاصل ہوا تھا۔
2. سیرت محمد علی۔ از رئیس احمد جعفری۔ جلد دوئم۔ ص ۲۳۵ بحوالہ پاکستان ناگزیر تھا ص ۱۵۸۔

کانپور کے قتل عام سے خلافت تحریک کا آغاز ہوا تھا اور قصہ خوانی بازار کے قتل عام پر اس کا اختتام ہوا۔

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

جلیانوالہ باغ کے قتل عام کو تو ہندو پریس نے خوب اچھالا۔ قصہ خوانی بازار کے قتل عام کا وہ سرے سے ذکر ہی نہیں کرتا۔

## جداگانہ انتخاب کی مخالفت

انتہا پسند ہندو غلبہ حاصل کر چکے تھے۔ کانگریس بھی ان کی ہمنوائی کر رہی تھی۔ وہ اتفاق و اتحاد کی بنیاد کو ہی ختم کر دینا چاہتے تھے۔ جداگانہ انتخاب کا طریقہ ان کی نگاہوں میں خار بن کر کھٹکتا تھا۔ مفاہمت کی راہ میں آگے بڑھنے کے بجائے کانگریس اب سابق میں طے شدہ مفاہمت کو بھی ختم کرنے پر تل گئی۔ ۱۹۲۷ء میں ایک ہندو ممبر نے قومی اسمبلی میں جداگانہ انتخاب کے خلاف ایک بل پیش کیا۔ کانگریس نے اپنے معاہدہ ــــ معاہدہ لکھنؤ ــــ کو پس پشت ڈالتے ہوئے اس بل کی ہمنوائی کی۔ مسلمان ممبر سخت پریشانی میں مبتلا ہو گئے۔ موتی لال نہرو نے مسٹر محمد علی جناح سے کہا کہ اگر مسلمان مخلوط انتخاب کا طریقہ کار قبول کریں تو ہم مسلمانوں کے دوسرے تمام مطالبات قبول کرنے کو تیار ہیں۔

مسلمانوں کے دوسرے مطالبات یہ تھے۔

۱۔ صوبہ سندھ کی احاطہ بمبئی سے علیحدگی۔

۲۔ سرحد اور بلوچستان کو صوبہ کے مساوی درجہ دینا۔

۳۔ پنجاب اور بنگال میں آبادی کے تناسب سے نمائندگی دینا۔

۴۔ مسلمانوں کو مرکز میں ضرور ۱/۳ نشستیں حاصل ہونا چاہئیں۔

جناح نے ملک بھر سے ۳۰ سرکردہ مسلمانوں کو بلایا۔ اور ان کے سامنے یہ مسئلہ پیش کیا۔

ہاں اُنھوں نے اپنے مطالبات چودہ نکات کی صورت میں پیش کیے۔ مفاہمتی گفتگو کے مطابق مسلمانوں نے یہ چودہ نکات ہندوؤں کے سامنے پیش کیے۔ آل پارٹیز میٹنگ منعقدہ کلکتہ دسمبر ۱۹۲۸ء میں جناح کے چودہ نکات زیر بحث آئے۔ اور ہندوؤں نے ان کو رد کر دیا۔

اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے جناح نے کہا "کوئی بھی ملک سوا اپنی اقلیتوں کو تحفظ کی ضمانت دیے بغیر، وہ نمائندہ ادارے قائم نہیں کر سکتا" جناح نے بڑی سلجھی ہوئی تقریر کی تھی۔ مگر مسٹر جیکر نے اپنی شتعال انگیزی سے ساری فضا کو خراب کر دیا۔ اس وقت محمد علی جناح نے کہا تھا "اس سیاسی جنون کی تمام تر ذمہ داری صرف مسٹر گاندھی پر عائد ہوتی ہے۔ وہ ذہنی اعتبار سے مسائل کو سمجھنے کے نا اہل ہیں[1]۔ اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے بعد میں ڈاکٹر امبیدکار نے لکھا "کہ ہندوؤں نے اپنی جنونی سیاست میں اس زرین موقع کو کھو دیا جو اتفاق کی نہایت مستحکم بنیاد بن سکتا تھا۔ اس جلسہ سے جناح کو مایوسی ہوئی۔

## سائمن کمیشن

اختیارات کی مزید قسط دینے کے لیے برطانوی حکومت نے سیاسی حالات کا جائزہ لینے کے لیے ایک کمیشن مقرر کیا۔ (نومبر ۱۹۲۷ء) جس کو سائمن کمیشن کہتے ہیں۔ اس کمیشن کے تمام ارکان انگریز تھے۔ یہ بات ہندوستانیوں کو ناگوار گزری۔ بڑی بڑی تمام سیاسی جماعتوں نے اس کی مخالفت کی۔ اور اس کا بائیکاٹ کیا اس لیے کمیشن اپنا کام پورا نہ کر سکا۔ آخر میں کمیشن کے ایک ممبر نے ہندوستانیوں کو چیلنج کے طور پر کہا۔

"بجائے اس کے کہ وہ حکومت کے خلاف ہمیشہ تخریبی نکتہ چینیاں کرتے ہیں وہ اپنی طرف سے دستور کی کوئی متفقہ اسکیم پیش کریں۔"

---

[1] تقریر ۱۳ جنوری ۱۹۳۰ء

ہندوستانیوں کی غیرت کو یہ زبردست چیلنج تھا۔ انھوں نے اس کا جواب دینے کی کوشش کی۔

## نہرو رپورٹ

اس چیلنج کا جواب دینے کے لیے آل پارٹیز کانفرنس بلائی گئی وہ کانفرنس دستور بنانے میں ناکام رہی۔ پھر دستور کے بنیادی اصول مرتب کرنے کے لیے ایک مختصر سی کمیٹی تشکیل دی گئی پنڈت موتی لال نہرو اس کے صدر تھے۔ اس کی رپورٹ نہرو رپورٹ کہلاتی ہے۔ اس کی اہم تجاویز یہ تھیں۔

۱۔ اس میں آزادی کا مقصد نوآبادیاتی آزادی کو قرار دیا۔

۲۔ اس میں جداگانہ انتخاب کا حق مسلمانوں سے واپس لے لیا گیا تھا۔

۳۔ اس میں مرکزی حکومت کو خوب مضبوط بنایا گیا تھا۔

اس میں مسلمانوں کے مطالبات۔ سندھ و بلوچستان کی علیحدگی اور مرکز میں ⅓ ممبروں کی موجودگی۔ کا اس رپورٹ میں کوئی ذکر نہیں تھا۔ مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے یہ رپورٹ انتہائی خراب تھی۔ مسلمانوں کے عظیم رہنما مولانا محمد علی اور محمد علی جناح دونوں اس زمانہ میں ہندوستان میں نہیں تھے۔ ان کی عدم موجودگی میں مسلمانوں کی وکالت کرنے والا زوردار آدمی کوئی نہیں تھا۔ کانگریس نے نہرو رپورٹ کو منظور کر لیا۔ اس رپورٹ میں مہا سبھائی اثرات صاف نظر آتے ہیں کانگریس کی اس روش سے یہ بات سب پر عیاں ہوگئی کہ اب اس نے اپنی روش تبدیل کر لی۔ اب اس نے طے کر لیا کہ

- ـــــــ مسلمانوں کو نظر انداز کر کے تن تنہا دستوری جنگ لڑے گی۔
- ـ اقلیت (مسلمان) کو وہ اکثریت (ہندو) کے سامنے جھکا دینا چاہتی ہے۔

کانگریس نے حکومت کو یہ دھمکی بھی دی کہ اگر ۳۱۔ دسمبر ۱۹۲۹ء تک۔ ان تجاویز کو قبول نہیں کیا گیا تو کانگریس سول نافرمانی کی تحریک شروع کر دے گی۔ اور ۳۰۔ مارچ ۱۹۳۰ء کو کانگریس نے عملاً نافرمانی کی تحریک جاری کر دی۔ یہ تحریک بقول مولانا محمد علی مسلمانوں کے خلاف تھی

ان کو بے وزن اور بے وقار کرنے کے لیے تھی۔

## گول میز کانفرنس

سیاسی مسائل پر رو در رو گفتگو کرنے کے لیے مسٹر جناح نے برطانیہ میں گول میز کانفرنس بلانے کی تجویز پیش کی جس میں ملک کی تمام سیاسی پارٹیاں شرکت کریں۔ برطانیہ نے ۱۲ر نومبر ۱۹۳۰ء کو لندن میں یہ کانفرنس بلائی۔ آغاز میں کانگریس نے مخالفت کی لیکن پھر شرکت کے لیے آمادہ ہو گئی۔ پہلی کانفرنس ۱۲ر نومبر ۱۹۳۰ء تا ۱۹ر جنوری ۱۹۳۱ء اور دوسری کانفرنس ۲۸ ستمبر ۱۹۳۱ء میں ہوئی۔

مولانا محمد علی شدید بیمار تھے۔ بیماری کی حالت میں وہ لندن جا کر کانفرنس میں شریک ہوئے۔ دوراجلاس کے دوران لندن ہی میں ۴ جنوری کو ان کا انتقال ہو گیا۔ انتقال سے چند روز قبل انھوں نے وزیر اعظم انگلستان کو ایک یادداشت بھجوائی۔ اس میں لکھا تھا۔

"کسی بھی دوسرے ہندوستانی سے زیادہ میں اس بات کا خواہش مند ہوں کہ غیر ملکی اقتدار ختم ہو ............................

لیکن میں ہرگز نہیں چاہتا کہ غیر ملکی دوکانداروں کی بجائے اپنے ملک کے دوکانداروں کے ایک فرقہ کو اپنی قسمتوں کا مالک بنا دیا جائے۔"

کانفرنس میں طویل مباحثات اور مناقشات ہوئے۔ مہا سبھائی ممبروں کے غیر مصالحانہ رویہ کے باعث نقاط نظر پر اتفاق رائے نہ ہو سکا آخر کار ۱۶ر اپریل ۱۹۳۲ء کو ریمزے میکڈانلڈ وزیر اعظم انگلستان نے اقلیتوں کے لیے جداگانہ حق رائے دہی کا اعلان کر دیا۔ مسلمانوں کے ساتھ پست اقوام (اچھوت) اور دوسری اقوام (سکھ) کو بھی یہ حق حکومت برطانیہ نے دے دیا۔ اس طرح مسلمانوں کا حق برقرار رہا۔ سکھوں نے یہ حق واپس کر دیا۔ آج وہ اس پہ نادم ہیں۔

## اچھوت قیادت کی ناعاقبت اندیشی

مسلمانوں کی جدوجہد سے ہندوستان کی اچھوت اقوام کو فائدہ پہنچ گیا۔ برطانوی حکومت

نے اچھوتوں کو حق جداگانہ انتخاب دے دیا۔ اس طریقہ سے اچھوت فرقہ اپنی انفرادیت اور تشخص کو برقرار رکھ سکتا تھا۔ اور مادی اور سیاسی ترقی میں پیش قدمی کر سکتا تھا۔

تنگ دل ہندو مسلمانوں کو یہ حق دینا نہیں چاہتے تھے۔ وہ ہندو آبادی کے کثیر حصہ یعنی اچھوتوں کو یہ حق ـــ جداگانہ انتخاب ـــ کیسے دے سکتے تھے۔ انھوں نے اس کے خلاف واویلا مچا دیا۔ ہندو لیڈروں میں ایک ہلچل مچ گئی۔ آخر میں مہاتما گاندھی نے "مرن برت" رکھا کہ اچھوت ہندو قوم کے جزو بن کر رہیں۔ جداگانہ انتخاب قبول نہ کریں بدستور مخلوط انتخاب قبول کریں (۲۰ ستمبر ۱۹۳۲ء) گاندھی کے برت رکھنے سے ساری ہندو قوم نے اچھوت لیڈر ڈاکٹر امبیدکار پر مختلف نوع کے دباؤ ڈالنے شروع کر دیے۔ وہ اس دباؤ کے سامنے نہ ٹھہر سکے۔ ہندو مطالبہ کے سامنے جھک گئے۔ گاندھی اور امبیدکار کے درمیان معاہدہ ہوا ـــ پونا پیکٹ ـــ جس میں انھوں نے اچھوت قوم کے لیے مخلوط طریقہ انتخاب کو ہی برقرار رکھا۔ اس طرح ایک زریں موقع اپنی قوم کی ترقی کا ہاتھ سے کھو دیا۔ جس کی سزا وہ آج بھگت رہے ہیں۔

## مسلمانوں میں انتشار

خلافت تحریک کی عظیم الشان عمارت منہدم ہو گئی تو اس کے ملبے سے ہر شخص نے ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنالی۔ قوم مختلف گروہوں اور ٹولیوں میں بٹ گئی۔ قوم پرست مسلمان، کانگریسی مسلمان، جمعیت العلماء، مجلس احرار، خاکسار، خدائی خدمت گار (سرحد)، یونینسٹ (پنجاب) اس انتشار اور افتراق سے مسلمانوں کو سخت نقصان پہنچا۔ ان کی کوئی متحدہ آواز نہ رہی۔

قومی قیادت میں بھی خلا پیدا ہو گیا۔ مولانا محمد علی کا انتقال ہو گیا۔ (۴ جنوری ۱۹۳۱ء) مسٹر محمد علی جناح نے بھی انگلستان میں سکونت اختیار کر لی۔ لارڈ ولنگڈن ہندوستان کا وائسرائے مقرر ہو گئے پہلے وہ بمبئی کے گورنر رہ چکے تھے۔ اس زمانہ میں مسٹر محمد علی جناح کی ان سے چپقلش ہو چکی تھی۔ اس لیے وہ انگلستان جا کر پریکٹس کرنے لگے۔ ملک میں قومی پیمانہ کا کوئی بلند قامت لیڈر نہیں رہا۔ اس

طرح ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۵ء تک قومی قیادت کا محاذ خالی پڑا رہا۔ چودھری خلیق الزماں نے متفقہ قیادت بنانے کی کوشش کی۔ انھوں نے مسلم کانفرنس جمعیت العلما، مسلم نیشنلسٹ پارٹیوں کو ساتھ ملانے کی کوشش کی مگر مختلف الخیال جماعتوں اور گروہوں کو جمع کرنا اور متفق بنانا ان کے لیے سخت دشوار کام ثابت ہوا۔

## ۱۹۳۵ء کا دستور

ملک میں بے چینی کو دور کرنے کے لیے حکومت برطانیہ نے ہندوستان کو سیاسی اختیارات کی آہنی قسط عطا کی۔ انھوں نے صوبائی خود مختاری عطا کی۔ اور ۱۹۳۵ء کا دستور ملک میں نافذ کیا۔ اس کے تحت صوبوں میں وزیرِ اعظم تمام معاملات میں خود مختار ہوتا تھا۔ البتہ گورنر کو مداخلت کرنے کا حق حاصل تھا۔ اقلیتوں کو چند تحفظات دیے گئے تھے جن کے لیے گورنر اور دفاع میں گورنر جنرل مداخلت کر سکتا تھا مگر واقعہ یہ ہے کہ یہ دفعات بہت کمزور تھیں۔ اس دستور کے تحت مسلمانوں کو نہایت تلخ تجربات سے گزرنا پڑا۔

## انتخابات اور مسلم لیگ

جدید حالات میں قومی قیادت کی کمی بری طرح محسوس کی جانے لگی۔ علامہ اقبال نے محمد علی جناح کو لندن سے بلانے کے لیے خطوط لکھے۔ بالآخر لیاقت علی خاں ان کو لینے کے لیے لندن گئے۔ تب وہ یہاں آئے اور انھوں نے مسلم لیگ کی قیادت سنبھالی۔

مسلمانوں کی سیاسی صورتِ حال انتہائی ناگفتہ بہ تھی، بنگال میں فضل الحق کی سرامک پارٹی تھی۔ پنجاب میں سر فضل حسین کی یونینسٹ پارٹی تھی۔ سرحد میں عبدالغفار کی خدائی خدمت گار پارٹی تھی۔ البتہ یو پی میں مسلم پارلیمنٹری بورڈ مسلم لیگ کے ساتھ تھا۔ اس لیے سب سے اوّل کام مسلمانوں میں اتحاد پیدا کرنا تھا۔ جناح نے لندن سے آتے ہی ملک کے دورے کرنے شروع کر دیے۔ نئے دستور

کے تحت انتخابات سر پر کھڑے تھے۔ اسی حال میں مسلم لیگ نے انتخابات میں حصہ لیا۔ اگرچہ مسلم لیگ کو زیادہ کامیابی نہیں ہوئی مسلمانوں میں کامیابی کانگریس کو بھی زیادہ نہیں ہوئی۔ مسلمانوں میں جس قدر مقبولیت کی وہ دعوے دار تھی وہ نتائج سے ثابت نہ ہو سکا۔

کانگریس نے مسلم لیگ کو نظر انداز کر دیا۔ مخلوط وزارت بنانے سے انکار کر دیا۔ کامیابی کے نشہ سے سرشار ہو کر پنڈت جواہر لال نہرو نے مدراس میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ "ہندوستان میں صرف دو پارٹیاں ہیں ایک کانگریس دوسری حکومت" اس کے جواب میں محمد علی جناح نے کہا۔ نہیں تیسری پارٹی بھی ہے۔ اور وہ مسلمان ہیں مسلم لیگ ہے۔ اس زمانہ میں یوپی کی پانچ نشستوں پر ضمنی انتخابات ہونے والے تھے۔ قائداعظم نے کانگریس کو چیلنج دیا کہ اگر وہ دعویدار ہے کہ مسلمان اس کے ساتھ ہیں تو وہ ان انتخابات میں کوئی سیٹ لے کر بتا دے۔ پانچوں سیٹیں مسلم لیگ نے جیت لیں۔ اس سے ملک میں مسلم لیگ کا وقار بلند ہوگا۔۔۔

## صوبوں میں کانگریسی حکومتیں

۱۹۳۷ء کے انتخابات میں آل انڈیا کانگریس نے ہندوستان کے مختلف صوبوں میں نتائج کامیابی حاصل کی تھی۔ ہندوستان کے سات بڑے بڑے صوبوں میں کانگریس نے اپنی وزارتیں قائم کیں۔ انھوں نے کسی دوسری جماعت کی شرکت گوارہ نہیں کی۔ بعض مسلمان ممبروں سے کہا گیا کہ وہ پہلے کانگریس میں شریک ہو جائیں پھر ان کو وزیر بنا لیا جائے گا۔ بہرکیف مسلم لیگ نے حزب مخالف کی نشستوں پر بیٹھنا پسند کیا۔

## متحدہ قومیت

کانگریس پارٹی نے ایوان حکومت میں داخل ہونے کے بعد چند خاص مقاصد کو اپنے پیش نظر رکھا۔ وہ ہندوستان میں ایک متحدہ قوم کو پروان چڑھانا اور فروغ دینا چاہتی تھی۔

ان کے خیال کے مطابق سارے ہندوستانی ایک قوم ہیں۔ مذہب ایک غیر متعلق شے ہے حکومت کے وسائل سے انھوں نے متحدہ قومیت کا بڑے زور شور سے پروپاگنڈا کیا۔ حیرت افزا بات یہ ہے کہ ہندوؤں کی اس مہم میں وہ دینی علماء پیش پیش تھے جن کا رات دن کا مشغلہ "تشبہ بالکفار" کے خلاف وعظ فرمانا ہے۔ اور جو انگریزی جوتا اور انگریزی لباس پہننے کو ناجائز قرار دیتے ہیں۔ ایک عالم دین نے تو یہاں تک فرمایا کہ "قومیں اوطان سے بنتی ہیں" جس کا علامہ اقبال نے سخت رد لکھا۔ کانگریس کی اس مہم کے متعلق مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی لکھتے ہیں۔

"ان کا منتہائے مقصود یہ ہے کہ ہندوستان میں مختلف قومی امتیازات جو مذہب اور تہذیب کی تفریق پر قائم ہیں مٹ جائیں۔ اور سارا ملک ایک قوم بن جائے۔ پھر اس قوم کی زندگی کا جو نقشہ ان کے سامنے ہے وہ اشتراکیت اور ہندومت سے مرکب ہے۔ اور اس میں مسلمانوں کے اصول حیات کی رعایت تو درکنار اس کے لیے کوئی ہمدردانہ نقطۂ نظر بھی ان کے پاس نہیں ہے۔"[1]

جن لوگوں نے متحدہ قومیت کا لبادہ اوڑھ لیا۔ ان کا کیا حال ہے۔ اس کے متعلق مولانا مودودی لکھتے ہیں۔

"ہماری قوم کے ان لوگوں کو قوم پرست کہا جاتا ہے جو ہاتھ جوڑ کر نمستے کرتے ہیں۔ بندے ماترم کے نعرے لگاتے ہیں، مندروں میں جا کر عبادت تک میں حصہ لیتے ہیں۔ اپنی صورتوں اور لباس میں پورے ہندویت کا رنگ اختیار کرتے ہیں۔ اور مسلمان قوم کے مفاد کا نام تک سنتے ہوئے انھیں ڈر لگتا ہے کہ مبادا ان پر قوم پرستی کا الزام نہ آ جائے۔"[2]

---

[1] تحریک آزادی ہند۔ از مولانا مودودی۔ ص ۷۶۔ [2] ص ۷۷

[3] کانگریس اور لیگ کے متعلق شرعی فیصلہ۔ ص ۱۳

# واردھا اسکیم

گاندھی جی کی رہنمائی میں جدید نسلوں کی تعلیم کے لیے ایک اسکیم تیار کی گئی جس کو وارد ھا اسکیم کہتے ہیں۔ اس کے معمار ڈاکٹر ذاکر حسین پرنسپل جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی تھے۔ اس نظامِ تعلیم میں ہدف متحدہ قومیت پیدا کرنا تھا۔ اس کے علاوہ سارا زور مادی تصور حیات اور مادی اقدار حیات پر تھا۔ مذہبی تعلیم کا بھی ایک جزو اس میں شامل تھا۔ اور وہ اس قدر تھا کہ چند مذہبی شخصیتوں کا تذکرہ نصاب میں شامل تھا۔ یہ مذہبی شخصیتیں حسبِ ذیل تھیں۔ بابا نانک، کبیر، داراشکوہ، گاندھی۔ اسی صف میں آقائے نامدار حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم بھی شامل تھے۔ ان کے پیش نظر تمام مذاہب کو تحلیل کر کے ایک نیا مرکب مذہب تیار کرنا تھا۔ گویا ایک قسم کا دینِ الٰہی یا برہمو سماج پیدا کرنا تھا۔

اس اسکیم کے معمار ڈاکٹر ذاکر حسین کا بیان سنیے "اس اسکیم کا آخری مقصد تعلیم یافتہ لوگوں کی ایک جماعت پیدا کرنا ہے جس کا کلچر جس کا عقیدہ اور جس کے اعمال ایک ہی طرح کے ہوں۔ جو تمام مذاہب کے متعلق یہ عقیدہ رکھے کہ وہ سب سچے ہیں اور ان کے درمیان کوئی فرق نہیں۔ نیز اہنسا (عدم تشدد) کی صداقت پر ایمان ہو اور اسی پر عمل بھی ہو"۔

اس قسم کے ایک مدرسہ کا حال مولوی عبدالحق (انجمن ترقی اُردو) اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں۔

> "میری انجمن کا نمائندہ قصبہ پانڈھرن (سی پی) کے مدرسہ میں پہنچا تو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ جب اس نے دیکھا کہ اسکول کے شروع ہونے سے پیشتر ہندو اور مُسلمان لڑکے سرسوتی مورتی کے سامنے ہاتھ جوڑ کر پرارتھنا (دعا) کر رہے ہیں مُسلمان لڑکے ان مدرسوں میں پڑھ کر سلام کی جگہ نمستے اور جے رام جی کہتے ہیں۔ کیا مذہب اور تہذیب کی حفاظت کے یہی معنی ہیں۔؟"

ان اسکولوں میں گاندھی جی کی پوجا کی جاتی تھی۔ اس سلسلہ میں جینید وا اٹوکل بورڈ ڈسٹرکٹ امراؤتی کی جانب سے اردو اسکولوں کے تمام ہیڈ ماسٹروں کو ایک مراسلہ جاری کیا گیا تھا۔

"صداقت اور عدم تشدد (ستیہ اور اہمسا) کا تمام عالم کو پیغام دینے والی عظیم المرتبت ہستی مہاتما گاندھی کی تصویر کی پوجا اور ان کے بلند نظریوں کے متعلق حاضرین کو نیک ہدایت دی جائے۔" (اصلی الفاظ)

مسلمان اپنی نسلوں کو اس قسم کی تعلیم دلانے کے لیے ہرگز تیار نہیں تھے۔ انھوں نے ان اسکولوں کی کھل کر مخالفت کی۔ سی پی میں جہاں اس اسکیم کو نافذ کیا گیا تھا نواب صدیق علی خاں نے اس کے خلاف سول نافرمانی کی تحریک جاری کی جس سے گھبرا کر کانگریسی حکومت کو مسلمانوں کے مطالبات تسلیم کرنا پڑے۔

## ودیا مندر اسکیم

اسی نوعیت کی ایک اسکیم پنڈت شکلا وزیر اعظم سی پی صوبہ نے جاری کی تھی۔ اس نے انتہا کر دی اسکولوں کو مندر کا نام دیا۔ اس میں ہندوانہ لباس[1]، مورتی پوجا، ہندو تہواروں میں مسلمان طلبہ کی شرکت لازمی تھی۔ ہاتھ جوڑ کر سلام کرنا، بتوں کے سامنے کھڑے ہونا، بندے ماترم مشرکانہ گیت گانا ضروری تھا۔ کانگریس کا ترنگا جھنڈا لہرایا جاتا تھا۔ ہندی زبان لازمی تھی۔ کانگریس نے اقتدار تو متحدہ ہندوستان کے نام پر حاصل کیا تھا۔ لیکن اقتدار پر قابض ہو جانے کے بعد اب وہ حکومت کی طاقت سے ہندو تصورات، اور ہندو تہذیب کو تمام افراد پر مسلط کر رہی تھی۔

---

[1] راقم کی ابتدائی تعلیم ایک ہندو ریاست الور کے شہر تجارہ میں ہوئی تھی۔ وہاں بھی طالب علم کو ہندی پڑھنا لازمی تھا۔ سر پر ہندوانہ طرز کی پگڑی باندھنا ضروری تھا۔ اردو ممنوع تھی۔

## کمال یار جنگ تعلیمی رپورٹ

ان تعلیمی اسکیموں کا بنیادی مقصد ہندوستان میں ایک متحدہ قومیت کو پروان چڑھانا تھا۔ مسلمانوں کی انفرادیت ختم کر کے ان کو ہندوؤں میں ضم کرنا تھا۔ اس لیے خاص طور پر اقلیتی صوبوں کے مسلمان اس سے بہت مضطرب تھے۔ حالات کا جائزہ لینے کے لیے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ نے ایک کمیٹی نواب کمال یار جنگ کی سربراہی میں مقرر کی (دسمبر ۱۹۳۸ء) کمیٹی نے سوالنامہ کے جوابات سے اور خود بھی دورہ کر کے معلومات جمع کیں اور ایک رپورٹ تیار کی جس میں مسلمانوں کے ساتھ کی گئی زیادتیوں کو مدلل طور پر پیش کیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ مسلمانوں کی تعلیم کا اتنے بڑے پیمانہ پر جائزہ لیا گیا۔ یہ رپورٹ کانفرنس نے ۲۰ اپریل ۱۹۴۲ء کو منظور کی۔ اس کے بعد حالات نے اس بات کی اجازت نہیں دی کہ کمیٹی کی سفارشات پر عمل درآمد کیا جاتا۔

## شعبہ اسلامیات

کانگریس کی نظر عنایت مسلمانوں کے حال پر ذرا زیادہ ہی تھی۔ ان پر خاص مہربانی فرمائی تھی۔ کانگریس کے مرکزی دفتر میں ایک شعبہ اسلامیات کے نام سے قائم کیا گیا۔ اس کا سربراہ کانگریس کے ہم سفر قوم پرست یا جمعیتہ العلماء میں سے کسی فرد کو مقرر نہیں کیا گیا۔ بلکہ مشہور کمیونسٹ لیڈر کنور محمد اشرف الوری کو مقرر کیا گیا۔ اس شعبہ کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو ذہنی طور پر ہموار کیا جائے تاکہ وہ متحدہ قومیت کا فلسفہ قبول کر لیں۔ اس دور میں نیاز فتح پوری نے (رسالہ نگار) اسلام کے خلاف مضامین کا سلسلہ جاری کیا۔ اس مہم کے متعلق مولانا مودودی لکھتے ہیں۔

"یہ تحریک قطعی طور پر "شدھی" کی تحریک ہے۔ اس میں اور شردھانند والی شدھی میں حقیقت اور نتیجہ کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہے"۔[1]

---

[1] تحریک آزادی ہند اور مسلمان۔ از مولانا مودودی۔ ص ۲۵۱۔

## تحریک رابطہ عوام

۱۹۳۷ء میں پنڈت نہرو نے مسلمانوں کے لیے رابطہ عوام کی تحریک جاری کی ان کا خیال تھا کہ مسلمانوں پر سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کا اثر ہے۔ ورنہ مسلمان عوام تو ہندوؤں کے ساتھ ہیں۔ مسلمان افلاس زدہ ہیں۔ اس لیے مسلم لیگ کے سرمایہ داروں اور جاگیرداروں سے وابستہ ہیں۔ اس لیے براہِ راست رابطہ قائم کر کے ان کو جاگیرداروں سے کاٹ دیا جاتے تب وہ بھی ایسے ہی بن جائیں گے جیسے ہندو ہیں۔

اس اسکیم کو یوپی صوبہ میں بڑے زور شور سے نافذ کیا گیا۔ اس غرض کے لیے مسلمان مقرروں کی ایک جماعت کو ملازم رکھا گیا۔ وہ شہروں کے دورے کرتے تھے۔ اور مسلمانوں کو یقین دلاتے تھے کہ کانگرس کا ساتھ دینے میں ان کو طرح طرح کے فوائد حاصل ہوں گے۔ رابطہ عوام کی تحریک پر تبصرہ کرتے ہوئے قائدِ اعظم نے فرمایا تھا۔

"یہ مسلمانوں میں اختلافات پیدا کرنے، ان کو کمزور کرنے، اپنے قابل قدر قائدین سے بدظن کرنے کی ایک خطرناک مہم ہے۔"[۱]

کانگرس رہنماؤں کو بھی اس مہم کی نقصان رسانی کا احساس تھا مینن اس کے متعلق لکھتا ہے۔

"۱۹۳۷ء کے انتخابات کے بعد کانگریس نے مسلمانوں سے رابطہ عوام Muslim mass contact کا ایک پروگرام شروع کیا۔ لیکن اس میں اس کو کامیابی نہیں ہوئی۔ البتہ کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان اختلافات کی خلیج اور زیادہ وسیع ہو گئی۔"[۲]

---

[۱] خطبہ صدارت مسلم لیگ اجلاس لکھنؤ

[۲] Transfer of power in India — V.P. Menon, p-56

بحوالہ پاکستان ناگزیر تھا۔ ص ۲۰۷۔

## مسلمانوں کی بے وقعتی

کانگریس کی حکومت میں مسلمانوں کے دین، تہذیب اور معاشرت پر پے در پے حملوں سے مسلمان پست حوصلہ ہو گیا۔ پروپاگنڈے نے ان کے خلاف فضا کو اتنا مخالف بنا دیا تھا۔ وہ اگر اپنی صفائی میں لب کشائی کرتا تو اس کو غلط معنی پہنائے جاتے تھے اس جو کھی لڑائی ہے وہ اپنے آپ کو بے کسی اور بے بسی کے عالم میں محسوس کرتا تھا۔ مولانا مودودی لکھتے ہیں۔

"مسلمان اگر کانگریس کے پروگرام کی مخالفت کرتے ہیں، تو انھیں انگریز پرست، ٹوڈی اور سامراجی کہا جاتا ہے۔ مسلمان اگر اشتراکی پروگرام کی مخالفت کرتے ہیں تو انھیں سرمایہ داروں کا ایجنٹ کہا جاتا ہے۔ کوئی بھی مسلمان کی اصل پوزیشن کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا۔ یا پھر دانستہ غلط نعروں میں گمراہ کرنا چاہتا ہے۔"

علامہ اقبال نے بھی اس دور کے مسلمانوں کی بے کسی اور بے بسی کو محسوس کیا اور اپنے مخصوص انداز میں اس کا ذکر کیا ہے۔

غدارِ وطن اس کو بتاتے ہیں برہمن!
انگریز سمجھتا ہے مسلمان کو گداگر
پنجاب کے اربابِ نبوت کی شریعت
کہتی ہے کہ یہ مومن پارینہ ہے کافر
آوازۂ حق اٹھتا ہے کب اور کدھر سے
مسکیں دلکم ماندہ دریں کشمکش اندر

## کانگریسی حکومتوں کی لادینیت

لادینیت کی اصطلاح کا جدید دور میں بہت چرچا ہے۔ جو اصطلاح جتنی زیادہ مشہور

ہوتی ہے ، اتنا ہی اس میں اغلاق اور ابہام پیدا ہو جاتا ہے لادینیت کا ایک مفہوم تو یہ ہے کہ لادینی حکومت ہر قسم کے دین کی مخالف ہوتی ہے ۔ وہ کسی دین کو برداشت نہیں کرتی ۔ یا تو دین کو جبراً فوراً ختم کر دیتی ہے یا مخفی زہر خورانی سے بتدریج ختم کر دیتی ہے ۔ جیسا کہ اشتراکی حکومتوں کا حال ہے ۔ لادینیت کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ حکومت کا کوئی دین نہیں ۔ البتہ دوسرے ادیان پر عمل پیرا ہونے کی مکمل آزادی ہے ۔

ہندوستان کی کانگریسی حکومت دعویٰ تو یہ کرتی تھی کہ وہ خود لادینی ہے [۱] البتہ دوسرے ادیان کو پھلنے کے پورے مواقع حاصل ہیں ۔ مگر عمل اس کا یہ تھا کہ حکومت کے تمام ادارے ہندو رسوم و رواج اور ہندو تہذیب و ثقافت کو فروغ دیتے تھے ۔ اور دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کو مجبور کیا جاتا تھا کہ وہ بھی ان رسوم و رواج کا احترام کریں اور ان میں شرکت کریں ۔

ان تمام اقدامات کی براہِ راست زد مذہب اسلام پر، اسلامی تہذیب پر اور مسلمانوں پر پڑتی تھی ۔ اس لیے مسلمانوں کے اندر اضطراب کا پیدا ہونا اور حکومت کے ان اقدامات کی مخالفت کرنا ایک فطری اور منطقی عمل تھا ۔

## پیر پور رپورٹ

ایک طرف دینی اور ثقافتی لحاظ سے مسلمانوں پر حملے ہو رہے تھے ۔ دوسری جانب فسادات اور جھگڑے بھی برابر جاری تھے ۔ اور اسلامی شعائر کی بے حرمتی عام تھی انگریزی دور میں حکومت

---

[۱] کانگریس کا سب سے بڑا رہنما گاندھی تھا جو خود کو پکا سناتن دھرمی بتاتا تھا ۔ جس کے یہاں سیاست اور مذہب گڈمڈ تھا ۔ سیاسی بیان پرارتھنا (دعا) کے بعد دیتا تھا ۔ اور کانگریس پھر بھی لادینی تھی ۔

کی مشینری غیرجانب دار رہنے کی کوشش کرتی تھی۔ کانگریسی دور میں وہ مسلمانوں کے خلاف رویہ اختیار کرتی ہے۔ جب اس قسم کی بہت ساری شکایتیں قائدِ اعظم کے پاس پہنچنے لگیں تو انھوں نے ان کی تحقیقات کے لیے ایک کمیٹی مقرر کی۔ ۵۔ نومبر ۱۹۳۸ء۔ اس کے صدر راجہ صاحب پیر پور تھے۔ اس لیے اس کو پیر پور رپورٹ کہتے ہیں۔

کمیٹی کے ممبروں نے کانگریسی وزارتوں کے دور میں مسلمانوں کی شکایات کا جائزہ لیا۔ کمیٹی نے چند صوبوں کا دورہ کیا۔ یوپی، بہار، اڑیسہ، سی پی، مدراس اور بمبئی۔ وہاں جاکر ہندو اور مسلمانوں دونوں افراد سے ملاقاتیں کیں۔ تفصیل سے حالات سنے۔ اور اپنی رپورٹ مرتب کی۔ کمیٹی نے یہ رپورٹ قائدِ اعظم کو پیش کی۔ اور انھوں نے اس کو وائسرائے کی خدمت میں پیش کیا۔ کہ ان الزامات کی تحقیقات بہتر یہ ہو کہ پریوی کونسل کے جج سے کرائی جائے۔ مگر وائسرائے نے ایسا کرنے سے معذوری کا اظہار کر دیا۔

بہرکیف اسی رپورٹ نے کانگریسی وزارتوں کے مظالم کو عوام کے سامنے رکھ دیا۔ اس سے کانگریسی وزارتوں کی خوب رسوائی ہوئی۔ ان حالات سے متأثر ہو کر قائدِ اعظم نے اخبار گارجین کے نمائندہ کو بیان دیا تھا۔

> "جمہوریت کے معنی یہ ہوں گے کہ پورے ہندوستان پر ہندو راج قائم ہو جائے۔ یہ وہ حالت ہے جسے مسلمان ہرگز قبول نہیں کریں گے۔ اس لیے نہایت احتیاط کے ساتھ غور و خوض کرنے کے بعد مسلم لیگ اب اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ ہندوستان کے مستقبل کے آئین کے پورے مسئلے پر از سرِ نو غور کیا جائے۔"[1]

کانگریسی دورِ حکومت میں مسلمانوں کی جو پوزیشن بن گئی تھی اس کو مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی ایک تمثیل کے ذریعہ بیان کرتے ہیں۔

---

[1] پاکستان ناگزیر تھا۔ ص ۲۲۵۔ [2] برق انداز یعنی سپاہی۔

"یہ ساری روئداد آپ کے سامنے ہے۔ اسے آنکھیں کھول کر پڑھیے۔ اور اندازہ کیجیے کہ اس جنگ آزادی کی حقیقی نوعیت کیا ہے۔ اس کی نوعیت یہ نہیں ہے کہ میرا قیدخانہ کا رفیق مجھ سے کہتا ہے کہ آؤ میں اور تم دونوں مل کر لڑیں۔ اور ہم دونوں اپنی بیڑیاں اور ہتھکڑیاں کاٹ پھینکیں۔ اگر معاملہ یہی ہوتا تو مجھ سے بڑھ کر کون احمق ہوتا کہ اس کارِ خیر میں اس کا ہاتھ بٹانے سے انکار کرتا۔

لیکن یہاں صورت معاملہ کچھ اور ہی ہے۔ میرا رفیق زنداں اس تدبیر میں ہے کہ جیلر کو ہٹا کر خود اس کی جگہ لے لے۔ اور اپنے ہاتھ پاؤں کی ہتھکڑیاں اور بیڑیاں بھی میرے ہاتھ پاؤں میں ڈال کر مجھے اپنا قیدی بنا لے۔ اور مجھ سے تو کہتا ہے کہ آؤ اس قید و بند سے آزادی حاصل کرنے کے لیے جیلر سے لڑیں۔ مگر جیلر کے ساتھ یہ معاملہ طے کرتا ہے کہ حضور مجھے برق انداز بنا دیں جیل کا انتظام حضور کے حسب منشا ہوگا۔ اور قیدیوں کو قابو میں رکھوں گا۔ مزید غضب یہ ہے کہ جیلر صاحب تو نرے جیلر تھے مگر ہمارے رفیق صاحب جو ابھی برق انداز بنتے ہیں ان کو مردم خوری کا چسکا بھی ہے۔ وہ مجھے فقط اپنا قیدی ہی نہیں بنانا چاہتے ہیں بلکہ میرے گوشت کو اور خون کو آہستہ آہستہ اپنا جزو بدن بنانے کی فکر میں ہیں۔

اب میری عقل ماری گئی ہے تو میں ضرور اس کے ساتھ تعاون کروں گا۔ تاکہ یہ میری مدد سے جیلر پر دباؤ ڈال کر اور زیادہ اختیارات حاصل کریں اور زیادہ آسانی سے مجھے نوش جان بنا سکیں۔" [1]

## یوم نجات

---

[1] تحریک آزادی ہند اور مسلمان۔ ص ۲۴۴

۳ ستمبر ۱۹۳۹ء کو برطانیہ جرمنی کے خلاف جنگ میں شامل ہو گیا۔ برطانیہ کی یہ فطری خواہش تھی کہ ہندوستان اس جنگ میں برطانیہ کا ساتھ دے۔ وائسرائے نے اس سلسلہ میں ہندوستان کی تمام سیاسی پارٹیوں سے گفت وشنید کی۔ کانگریس نے اس کو استعمار کی جنگ قرار دیا۔ اس نے اس طرح جنگ مسلط کرنے کی مخالفت کی۔ اس دباؤ کے پیشِ نظر کانگریسی حکومتوں نے اکتوبر اور نومبر ۱۹۳۹ء میں استعفٰے دے دیا۔ مسلم لیگ نے اس موقع پر وائسرائے سے نرم گفتگو کی۔ اور شرکت کے لیے چند شرطیں پیش کیں۔ مسلم لیگ کی وزارتوں نے استعفٰے ابھی نہیں دیا۔

کانگریس کی وزارتیں ختم ہو گئیں تو قائدِ اعظم محمد علی جناح نے ۲۲ دسمبر ۱۹۳۹ء بروز جمعہ کو سارے ہندوستان میں یومِ نجات Day of Deliverance منانے کی اپیل کی۔ اس طرح کانگریسی وزارتیں ذلیل اور خوار ہو گئیں۔ اور مسلم لیگ کی مقبولیت میں اضافہ ہو گیا۔ تمام شہروں اور دیہات میں مسلمانوں نے یہ دن منایا۔ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ دوسری اقلیتوں پارسی اور پست اقوام اور جسٹس پارٹی اور بعض ہندوؤں نے بھی مسلمانوں کے ساتھ یہ دن منایا۔ اس اقدام سے کانگریس جھنجلا اٹھی۔ اور بقول ایک صحافی "وہ زخمی جنگلی سؤر کی طرح مضطربانہ حرکتیں کرنے لگی"۔ [1]

دو سالہ کانگریسی راج نے ان تمام اندیشوں اور خطرات کو درست ثابت کر دیا جو مسلمان ہندوؤں کی حکومت کے متعلق رکھتے تھے۔ مسلمانوں کے مذہب میں مداخلت کی گئی۔ مشرکانہ تہذیب ان پر مسلط کی گئی۔ لادینی تعلیم ان کو دی گئی ہندو رسوم ورواجات کے احترام کے لیے ان کو مجبور کیا گیا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کو جان اور مال کا تحفظ بھی حاصل نہیں رہا۔ کانگریسی حکومت

---

Arthur Moore, Ex Editor Statesman

[1] پاکستان ناگزیر تھا۔ ص ۲۳۱۔

نے تمام مسلمانوں کی آنکھیں کھول دیں۔ اس کے بعد وہ سب مسلم لیگ کے پرچم کے نیچے جمع ہو گئے۔ اس نے دوسری اقلیتوں کی آنکھیں بھی کھول دیں۔ اس نے انگریزی حکومت پر واضح کر دیا کہ مسلمانوں کے اندیشے بے بنیاد نہیں ہیں۔ کانگریسی راج پر تبصرہ کرتے ہوئے قائد اعظم نے کہا تھا۔

"ہندو قوم نے اپنا نقطہ نظر واضح کر دیا ہے۔ کہ ہندوستان ہندوؤں کے لیے ہے۔ کانگریس اس کام کو قومیت کے حسین لفظ میں لپیٹ کر کرتی ہے۔ اور مہاسبھا الفاظ کے چکر میں نہیں پڑتی وہ صاف صاف بات کرتی ہے۔"

## مصالحت کی آخری کوشش

۲۰ مئی ۱۹۳۸ء کو قائد اعظم نے چند شرائط پر کانگریسی حکومت کے ساتھ تعاون کی پیش کش کی۔ وہ شرائط یہ تھیں۔

(۱) صوبوں میں مشترکہ وزارتیں بنائی جائیں۔

(۲) اگر کسی قانون سے مسلمان ممبروں کی دو تہائی اکثریت اختلاف کرے تو وہ ملکی قانون نہیں بن سکتا۔

(۳) سرکاری عمارتوں پر کانگریسی جھنڈا نہ لہرایا جائے۔

(۴) بندے ماترم کے گیت گانے سے قبل مسلمانوں کے ساتھ تصفیہ ہونا چاہیے۔

(۵) کانگریس مسلم لیگ کو تباہ کرنے کی کوششوں سے باز آ جائے۔ ان تجاویز کا گاندھی جی نے یہ جواب دیا کہ "ان مشترکہ وزارتوں سے کچھ حاصل نہیں ہو گا"

یہ مصالحت کی آخری کوشش تھی۔

## اس دَور پر تبصرہ

علامہ شبیر احمد عثمانی اس دَور کی سیاست پر تبصرہ کرتے ہُوئے لکھتے ہیں۔

"شاطران بساط حکومت اس سے کب غافل ہو سکتے تھے۔ وہ بھی اس کو توڑنے کے لیے نئے نئے جال پھیلاتے رہے۔ بہادر مسلمانوں کی سادہ دلی اور عیار ہندوؤں کی تنگ نظری اور بنیا ذہنیت کو وہ خوب سمجھتے تھے۔ آخر کبھی شدھی کبھی سنگھٹن اور کبھی نہرو رپورٹ جیسی افتراق انگیز اور اشتعال آمیز تحریکات اور تجاویز سے یہاں کے مُسلمانوں کو دوچار ہونا پڑا۔ دریلئے سیاست کے یہ مدوجزر برابر تھوڑے تھوڑے وقفے سے جاری رہے۔ تاآنکہ ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے تحت، انتخابات ۱۹۳۷ء کے بعد ہندوستان میں وزارتیں بن گئیں۔ گویا اب ہندو کو موقع ہاتھ آگیا کہ وہ اپنے صوبوں میں خود غرضی، تنگ نظری، اور اپنی ان ناپاک خواہشات اور عزائم کا زور اور قوت سے مظاہرہ کرے جو ابھی تک ذرا مستور تھے۔ اور کبھی کبھی مکروکید سے بروئے کار آتے تھے۔"[1]

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اس دَور کی سیاست پر تبصرہ کرتے ہیں۔

"(اس دور میں) اس ہندوستانی سوراج کے اندر اپنی (مُسلمانوں کی) جگہ بھی تلاش کی جاتی رہی جس کا بنیادی نظریہ اسلام کے نظریہ سیاسی سے کوئی دُور کی بھی نسبت نہیں رکھتا تھا۔ اس غلط جمہوریت کو بھی تسلیم کر لیا گیا جو اسلام کے تصورِ جمہوریت سے کلیتہً واصولاً مختلف تھی۔ پھر ایک طرف تو اس دَور میں خالص اسلامی نقطۂ نظر کی جھلک نظر آتی ہے۔ اور دوسری طرف، ماحول کو ساز گار بنانے کے بجائے خود

---

[1] خطبات عثمانی۔ ص ۲۱۔

ماحول سے سازگار بننے کی کمزوری بھی پائی جاتی ہے۔ اور تمام دماغی اور عملی قوتیں وقتی اور ہنگامی حالت کے لحاظ سے پالیسیاں بنانے اور بدلنے میں صرف کر دی جاتی ہیں۔ غرض یہ ایسی پراگندہ خیالی اور خلط مبحث کا دور تھا جس کی الجھنوں سے آخر وقت تک مسلمان اصولی حیثیت سے یہ طے نہ کر سکے کہ ہم فی الواقع ہیں کیا۔ اور ہمیں اس سرزمین میں اپنی کس حیثیت کو قائم کرنے کے لیے مجاہدہ کرنا چاہیے۔ یہ دور اپنے دو لیڈروں کی وفات اور تیسرے کی شخصیت کے انقلاب تام سے اختتام کو پہنچ چکا ہے۔"[1]

*******

[1] ادبیات مودودی۔ ص ۲۹۱۔ اسلامک پبلی کیشنز۔ لاہور۔ ۱۹۷۶ء

## بارھواں باب

# منزلِ مراد

سیاسی سطح پر مسلمانوں نے جو جدوجہد کی اور اس راہ میں جو مشکلات اور دشواریاں ان کو پیش آئیں ان کا تذکرہ آپ نے پڑھ لیا۔ ذہنی اور فکری سطح پر جو عوامل کارفرما تھے اور وہاں جو تبدیلیاں رُونما ہُوئیں ان کا تذکرہ کرنا ابھی باقی ہے۔ اس لیے کہ انسانی معاشرہ میں اصلاح اور تغیرات کے حقیقی عوامل ذہنی اور فکری ہوتے ہیں۔ یہ عوامل تین قسم کے ہیں۔ فکری عوامل، فوری عوامل، خارجی عوامل۔

## مُسلمانوں میں دینی انحطاط

مسلمانوں کی اجتماعی اور انفرادی زندگی میں اسلامی احکام و اوامر سے انحراف اور اختلال بتدریج آیا ہے۔ بہت سست رفتاری کے ساتھ آیا ہے۔ ملوکیت کے زیر سایہ یہ انحطاط اور زوال صدیوں تک بتدریج بڑھتا رہا۔ سارا زور تعبدی زندگی پر رہا۔ اجتماعی زندگی کے بعض گوشے بھی کسی طور جاری و ساری رہے۔ لہٰذا بظاہر دینی زندگی میں کوئی بڑا حادثہ یا انقطاع واقع نہیں ہُوا اس لیے عوام اور خواص سب ہی خوش فہمی میں مبتلا رہے۔ انحراف اور انحطاط کا شعور اور ادراک بہت کم لوگوں کو ہُوا۔

شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو کہ گزشتہ ادوار میں مُسلمانوں کی زندگی میں تصوف کو بے حد غلبہ رہا ہے۔ مشرق اور مغرب سب جگہ یکساں حال تھا۔ تصوف کا سارا زور انفرادی زندگی اور انفرادی تزکیہ نفس پر ہے اجتماعی زندگی سے وہاں بہت کم اعتنا کیا جاتا ہے۔ اس وجہ سے اجتماعی زندگی میں انحراف اور اختلال بڑھتا رہا۔ اور کسی نے اس طرف توجہ نہیں کی۔

ملک کی یہ صورت حالات تھی جب سات سمندر پار کی قوم انگریز نے مغل سلطنت کا خاتمہ کر کے ہندوستان پر قبضہ کر لیا۔ صدیوں سے قائم شدہ مسلمانوں کے نظامِ حیات کی بساط الٹ دی۔ مسلمانوں کی زندگی ایک حادثہ فاجعہ سے دوچار ہو گئی۔ دینی زندگی میں انقطاع واقع ہو گیا۔

## جہاد کی ناکامی

کامل ایک صدی تک (۱۷۶۰ء۔ ۱۸۶۴ء) مسلمان اس انقطاع کو جوڑنے کی کوششوں میں لگے رہے۔ اسلامی حکومت کا تسلسل برقرار رکھنے کی کوشش کرتے رہے۔ مجاہدانہ سرگرمیوں میں کامل ایک صدی گزار دی۔ انیسویں صدی میں ہندوستان کے مسلمانوں کا مرکزی خیال اسلامی حکومت دوبارہ قائم کرنا تھا۔ اس کے لیے عظیم الشان تحریکیں برپا کیں۔ ہزاروں افراد نے جان و مال کی قربانی کی۔ راہِ حق میں شہادت سے مشرف ہوئے اور ہجرت اختیار کی۔ ناکامیوں پر ناکامیاں ہوتی رہیں۔ مگر ان کا جذبہ قربانی سرد نہیں پڑتا تھا۔ یکے بعد دیگرے مختلف مردانِ حق میدانِ جہاد میں آتے رہے اور جامِ شہادت نوش کرتے رہے۔ بظاہر تو یہ مجاہدانہ سرگرمیاں مطلوب اور مقصود حاصل کرنے میں ناکام رہیں مگر انھوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کو بھولا ہوا سبق یاد دلادیا۔ فرائضی تحریک میں باقاعدہ یہ نعرہ لگایا جاتا تھا۔

- اَلملكُ للهِ والارضُ للهِ -

صدیوں سے یہ نعرہ فراموش ہو چکا تھا۔ مجاہدانہ سرگرمیوں کی یہ بازیافت بڑی قابلِ قدر ہے۔

## جدید نسلوں کی تربیت

فرنگی حکومت زیادہ طاقتور نکلی۔ وہ بالآخر سب پر غالب آگئی۔ سیاسی زوال ہمہ گیر زوال ثابت

ہُوا۔ اس کے پہلو میں معاشی زوال اور اخلاقی زوال بھی آیا۔ انگریزی دَورِ حکومت میں ناکامی و نامرادی افلاس و ناداری، بےکس مپرسی اور ہیچ میرزی نے مُسلمان قوم کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔

ان حالات میں انگریزی حکومت نے سرکاری تعلیم اور جدید ذرائع ابلاغ کی قوت سے مسلمانوں کی نوخیز نسلوں کو اپنے طور پر تعلیم دلا کر تیار کیا۔ بلاشبہ یہ نونہال مغربی زبان اور مغربی علوم سے کسی قدر واقف ہو گئے مگر اپنی قدیم زبانوں سے اور اپنے شاندار ماضی سے کٹ گئے۔ بلاشبہ حصولِ تعلیم کے بعد ان نونہالوں پر روزگار کے بند دروازے کھول دیے گئے مگر مغربی تہذیب و تمدّن کی چمک نے ان کی آنکھیں خیرہ کر دیں۔ مغرب کی نقالی کو یہ لوگ اپنی معراجِ خیال تصور کرنے لگے۔ مشرق میں رہ کر مغرب کے حسین خواب دیکھنے لگے۔ دین و دنیا کی تفریق کے مغربی تصور پر یہ لوگ ایمان لے آئے۔ معیشت و معاشرت، سیاست و حکومت ہر دائرہ میں انھوں نے مغربی تصورات کو بےچون و چرا قبول کر لیا۔ سیاست ان کے یہاں شجرِ ممنوعہ تھی۔ علی گڑھ والوں کی قیادت کے ۷۰ سالہ دَور میں مُسلمان قوم کے یہی حالات تھے۔

## خلافت تحریک کا دَورِ بیداری

ہندو پاکستان کے مسلمان مغربی شاطروں کے بنائے ہُوئے نقشہ کے مطابق زندگی گزار رہے تھے۔ کہ پردۂ غیب سے خلافتِ عثمانیہ ترکیہ کا قضیہ اٹھ کھڑا ہُوا۔ برِصغیر کے مسلمانوں کو خلافتِ تحریک نے اس انداز سے جھنجھوڑا۔ بیدار کیا۔ اور سرگرمِ عمل بنا دیا جیسے کسی نے بجلی کا بٹن دبا دیا ہو۔ بقول حالی

وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوتِ ہادی
عرب کی زمیں جس نے ساری ہلا دی

اسلام جو گزشتہ دَور میں ایک جنس کاسد بن گیا تھا۔ اب اس کی اہمیت سب سے زیادہ بڑھ گئی۔ بےعملی کا خمار اور غبار ہوا ہو گیا۔ غفلت کی گرد ایک جنبش میں جھڑ گئی۔ ہر مسجد کے منبر سے اور

بہ ...لوی کی زبان سے اسلام کی اور خلافت کی تشریح ہونے لگی۔ خلافت تحریک نے اسلام کا بھولا ہوا سبق یاد دلا دیا۔ خلافت تحریک نے اسلام کے اجتماعی نظام کے تقاضے اور اہمیت کو ذہنوں میں اجاگر کر دیا۔ ہر منبر اور ہر خانقاہ میں، ہر گلی اور کوچہ میں تلقین عوام اور تعلیم بالغاں کا دینی مدرسہ کھل گیا۔ جہاں لاکھوں انسانوں کی تعلیم و تربیت ہو رہی تھی۔ مسجد کانپور اور خدام کعبہ سے لے کر ترک موالات اور ہجرت افغانستان تک ایک عشرہ میں مسلمان قوم ـــــ مرد اور عورت، بچے اور بوڑھے۔ سب اس اسلامی درس گاہ میں تعلیم لے رہے تھے۔ سب اسلامی جذبہ سے سرشار نظر آتے تھے۔

خلافت تحریک نے مسلمانوں کے تمام فرقوں کو ایک مرکز پر لا کھڑا کیا۔ سب کو متحد کر دیا۔ حتیٰ کہ شیعہ فرقے کے لوگ بھی ہمنوا اور ہمسفر بن گئے۔ خلافت تحریک نے انگریزی حکومت کا رعب داب اور خوف ختم کر دیا۔ خلافت تحریک نے انگریزی تمدن سے نفرت پیدا کر دی۔ سودیشی تحریک نے انگریزی اشیاء اور انگریزی لباس کا چلن بند کر دیا۔ خلافت تحریک نے سرفروشی کا جذبہ پیدا کر دیا۔ ہزاروں مسلمانوں نے اسلام کے نام پر ہجرت اختیار کی۔ ترک وطن کیا۔ سرکاری ملازمتوں سے استعفےٰ دے دیئے۔ قید خانوں کو بھر دیا۔ پھانسی کے تختہ کو چوم لیا۔

خلافت تحریک نے صدیوں کے بعد برصغیر کی فضاؤں میں اللہ کی حاکمیت کا نعرہ بلند کیا۔ مولانا محمد علی نے عدالت میں بیان دیا۔

"میں صرف اللہ تعالیٰ کو بادشاہ مانتا ہوں۔ اور کسی کو بادشاہ نہیں مانتا۔ (مقدمہ کراچی)

مدتوں بعد تک اس نعرہ حق کی صدائے بازگشت سنائی دیتی رہی۔ خلافت تحریک ختم ہو جانے کے بعد بھی مدتوں فضا بدستور" الحکم للہ" کے نعروں سے گونجتی رہی کوئی "حکومت الٰہیہ" کا مطالبہ کر رہا تھا۔ (مجلس احرار) کوئی "خلافت ربانی" کا نعرہ کر رہا تھا۔ (مولانا راغب احسن بنگال) کوئی علی گڑھ میں ہر طالب علم سے کہلواتا تھا نحن خلیفۃ اللہ (مولانا آزاد سبحانی) کوئی اسلامی حکومت قائم کرنے کے لیے قوم کو عسکری تربیت دے رہا تھا (علامہ مشرقی) کوئی کہہ رہا تھا "پرنگی (فرنگی) نے ہمارے قرآن کو قید کر رکھا ہے میں اس کو آزاد کراؤں گا (خان عبدالغفار خان)

اسلامی نظام حیات اور اسلامی حکومت کی بازیافت اور عام مسلمان کو اس کا احساس خلافت تحریک کا سب سے بڑا عطیہ اور انعام ہے۔ بتدریج مسلمان اسلامی نظام حکومت کی جانب بڑھتے چلے گئے۔

## اسلامی نظام حیات

خلافت تحریک کے بعد سے مسلمان رہبران قوم مسلمانوں کی سیاسی جدوجہد کا مقصود و مطلوب اسلامی حکومت کا قیام اور اسلامی طرز زندگی کو قرار دیتے رہے۔ سارے رہنما ایک بات کہہ رہے تھے۔ ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کا قیام بھی مذہب اور تہذیب کی حفاظت کیلئے تھا

## نواب وقار الملک (۱۹۰۶ء)

"اگر کسی وقت برٹش حکومت ہندوستان میں قائم نہ رہے تو اس وقت وہی قوم ملک پر حکمران ہو گی جو تعداد میں ہم سے چار حصہ زیادہ ہے۔ اور اب صاحبو! ہر ایک شخص کو چاہیے کہ اپنے دل میں اس بات پر غور کرے کہ اس وقت ہماری حالت یہ ہو گی کہ ہمارا مال، ہماری آبرو، ہمارا مذہب سب خطرے میں ہو گا۔"[1]

## علامہ اقبال (۱۹۳۰ء)

"آپ نے آل انڈیا مسلم لیگ کی صدارت کے لیے ایک ایسے شخص کو منتخب کیا ہے جو اس امر سے مایوس نہیں ہو گیا ہے کہ اسلام اب بھی ایک زندہ قوت ہے۔ جو ذہن انسانی کو نسل و وطن کی قیود سے آزاد کر سکتی ہے۔ جس کا عقیدہ یہ ہے کہ مذہب کو فرد اور ریاست دونوں کی زندگی میں غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ اور جسے یقین ہے کہ اسلام کی تقدیر خود اس کے اپنے ہاتھ میں ہے۔"

---

[1] خطبہ تاسیسی مسلم لیگ۔ ڈھاکہ۔ ۳۰ دسمبر ۱۹۰۶ء۔

"یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ بحیثیت ایک اخلاقی نصب العین اور نظام سیاست کے اسلام ہی وہ سب سے بڑا جزو ترکیبی تھا جس سے مسلمانان ہند کی تاریخ حیات متاثر ہوتی ہے۔ اسلام ہی کی بدولت انکے سینے ان جذبات اور عواطف سے معمور ہوئے جن پر جماعتوں کی زندگی کا دارومدار ہے۔ جن سے متفرق اور منتشر اجزا بتدریج متحد ہو کر ایک متمیز و معین قوم کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔"

"مسلمانوں کے اندر استحاد اور ان کی نمایاں یکسانیت ان قوانین اور روایات کی شرمندہ احسان ہے جو تہذیب اسلامی سے وابستہ ہیں۔"

"اسلام کا مذہبی نصب العین اس کے معاشرتی نظام سے جو خود اس کا پیدا کردہ ہے، الگ نہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ اگر آپ نے ایک کو ترک کر دیا تو بالآخر دوسرے کو بھی ترک کرنا لازم آئے گا۔ میں نہیں سمجھتا کہ کوئی مسلمان ایک لمحے کے لیے بھی کسی ایسے نظام سیاست پر غور کرنے کے لیے آمادہ ہو گا جو کسی ایسے وطنی یا قومی اصول پر مبنی ہو جو اسلام کے اصولِ اتحاد کے منافی ہو۔ یہ مسئلہ ہے جو آج ہندوستان کے مسلمانوں کے سامنے ہے۔"

"اگر ہم چاہتے ہیں کہ اس ملک میں اسلام بحیثیت ایک تمدنی قوت کے زندہ رہے۔ تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایک مخصوص علاقے میں اپنی مرکزیت قائم کرے۔"

"پھر اسلام کو اس امر کا موقع ملے گا کہ وہ ان اثرات سے آزاد ہو کر جو عربی شاہنشاہیت کی وجہ سے اب تک اس پر قائم ہیں۔ اس جمود کو توڑ ڈالے گا جو اس کی تہذیب و تمدن، شریعت و تعلیم پر صدیوں سے جاری ہے۔ اس سے نہ صرف اس کے صحیح معانی کی تجدید ہو سکے

کی، بلکہ وہ زمانہ حال کی رُوح سے بھی قریب ہو جائے گا"۔[1]

---

[1] خطبہ صدارت۔ علامہ اقبال۔ آل انڈیا مسلم لیگ اجلاس۔ الہ آباد۔ ۳۰۔ ۳۱ دسمبر ۱۹۳۰ء

[1] اسلام کے متعلق یہ تنہا فلسفی اقبال کی رائے نہیں ہے بلکہ دوسرے مفکرین اور دانشور بھی
(۱) اسی انداز پر سوچتے تھے۔ انگلستان کے مشہور ادیب فلسفی برنارڈ شا (۱۹۵۳ – ۱۸۵۶ء) لکھتا ہے۔

"میرا تو یہ اعتقاد ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جیسی شخصیت کو اگر آج کے عالم جدید کی عنان حکومت دے دی جائے تو دنیا اپنی مشکلات کے حل تلاش کرنے میں کامیاب و بامراد ہو جائے گی اور اس کے اندر امن و سلامتی کی لہر دوڑ جائے گی۔ کاش دنیا اس جیسے مصلح کی ضرورت محسوس کرتی۔ میں تو نپولین کی طرح اسلام کو دوسرے ادیان کے مقابلہ میں فضیلت دیتا ہوں۔ اور میرا اعتقاد ہے کہ برطانوی شاہنشاہیت اس صدی کے آخر میں حلقہ بگوش اسلام ہو جائے گی"۔

G. B. Shaw — The genuine Islam — Singapore Vol. I No 8, 1936

(رسالہ نقوش۔ رسول نمبر۔ لاہور۔ ج ۴۔ ص ۵۵۳)

(۲) ہندوستان کے فلسفی شاعر رابندر ناتھ ٹیگور (۱۹۴۱ – ۱۸۶۱ء) کہتے ہیں۔

وہ وقت دُور نہیں جب کہ اسلام اپنی ناقابلِ انکار صداقت اور روحانیت کے ذریعہ سب کو اپنے اندر جذب کرلے گا۔ وہ زمانہ عنقریب آنے والا ہے جب کہ اسلام ہندو مذہب پر غالب آجائے گا۔ اور ہندوستان میں ایک ہی مذہب ہو گا۔

مدینۃ العلوم ص ۱۷۔ از مجید حسن مالک اخبار مدینہ بجنور۔ یوپی۔ غالباً ۱۹۳۴ء

(رسالہ نقوش۔ رسول نمبر۔ لاہور۔ ج ۴۔ ص ۴۷۶)

(۳) گاندھی جی (۱۹۴۸ – ۱۸۶۹ء) نے کانگریسی وزارتوں کے پہلی دفعہ قائم ہونے کے وقت ایک مکتوب مفتوح تمام کانگریسی وزراء کے نام لکھا تھا۔ جس کا مضمون یہ تھا (۱۹۳۷ء)

"ہمارا مقصد حکومت کی عنان ہاتھ میں لینے سے حصول دولت یا اقتدار نہیں

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھیے)

## چودھری رحمت علی خالق لفظ پاکستان (۱۹۳۳ء)

"جس بات نے ان کے جوش کردار کو ابھارا وہ ایک صحیح اسلامی معاشرہ کی نشاۃ ثانیہ کی خواہش تھی۔ جس میں عدل ہو جمہوری مساوات ہو، استبداد سے آزادی ہو، اور سماجی بہبود سے دل کی لگن کی وہ خوبیاں از سر نو فروغ پائیں جو قرون اولیٰ میں مسلم معاشرہ کی منفرد خصوصیات تھیں۔ یہ اس نمونہ کامل کی کوشش تھی جس نے مسلم لیگ کو جو اب تک صرف اونچے طبقات کی نمائندہ تھی، ایک عوامی جماعت بنا دیا۔ اس اساس کے بغیر یہ بات سمجھ میں

---

(بقیہ حاشیہ) بلکہ رام راجیہ (خدا کی بادشاہت) کا حصول ہے۔ رام راجیہ کے قیام کے لیے ہمیں اشوکا یا وکرما جیت کی طرف نہیں دیکھنا چاہیے۔ بلکہ ہمیں ابوبکر اور عمر کی پیروی کرنا چاہیے۔ کیونکہ دنیا کی تاریخ میں میرے نزدیک ان کے عہد خلافت سے بہتر نمونہ رام راجیہ کا نہیں مل سکتا۔" (اخبار ہریجن گاندھی، جولائی یا اگست ۱۹۴۷ء)

(۷) پرنس کاتتانی اطالوی لکھتا ہے

"پیغمبر اسلام نے جس اسلام کی تعلیم دی تھی۔ وہ کروڑوں انسانوں کے لیے ایک روحانی ضرورت ہے بعض اقوام عالم مثلاً ہندوستان کے ہندو کے لیے تو اسلام، ایک نامعقول مذہب وطرز معاشرت سے نجات حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ اگر تمام ہندوستان دائرہ اسلام میں داخل ہو جائے تو وہ دنیا کی طاقتور ترین اور بااثر اقوام میں شامل ہو جائے گا۔ اس لیے مجھے وہاں بہت سے نصرانی تبلیغی اداروں کی مساعی کو دیکھ کر افسوس ہوتا ہے۔ کیونکہ عیسائیت ہندوستانیوں کے لیے موزوں مذہب نہیں ہے۔ ہندوستانیوں کو اپنی سربلندی کے لیے قابل فخر اور باوقار مذہب اسلام اختیار کرنا چاہیے۔"

پرنس کاتتانی اطالوی کا خط بنام ڈاکٹر محمود بریلوی مورخہ ۲۲ جون ۱۹۳۴ء از کنیڈا۔

محفوظ لائبریری معارف اسلامیہ منصورہ۔ لاہور۔ جسارت ۸ فروری ۱۹۸۵ء۔

نہیں آسکتی کہ اقلیتی صوبوں کے مسلمان تحریک پاکستان کا دل وجان کے ساتھ دینے پر کیوں آمادہ ہو گئے :" ؎

## قائداعظم محمد علی جناح ؒ (۱۹۳۹ء)

" آپ نے غور کیا کہ پاکستان کے مطالبہ کا جذبہ محرکہ کیا تھا ؟ مسلمانوں کے لیے ایک جداگانہ مملکت کی وجہ جواز کیا تھی ؟ اس کی وجہ نہ ہندوؤں کی تنگ نظری ہے نہ انگریزوں کی چال۔ یہ اسلام کا بنیادی مطالبہ ہے ۔"

" قرآن نے انسان کو خدا کا خلیفہ اور نائب کہا ہے ۔ اور انسان کی اس تعریف کو اگر کوئی امتیازی حیثیت حاصل ہے تو پھر وہ ہم پر قرآن کے اتباع کا فرض عائد کرتی ہے ۔ اور دوسرے انسانوں کے ساتھ اس طرح پیش آنے کا تقاضا کرتی ہے جیسے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے ساتھ پیش آتا ہے ۔" ؎

" مسلمانو! ہمارا پروگرام قرآن پاک میں موجود ہے ۔ ہم مسلمانوں کو لازم ہے کہ قرآن پاک کو غور سے پڑھیں ۔ اور قرآنی پروگرام کے ہوتے ہوئے مسلم لیگ مسلمانوں کے سامنے کوئی دوسرا پروگرام پیش نہیں کر سکتی ۔"

---

(نوٹ) اس صدی کے اوائل میں ڈیون پورٹ Devenport نے انگریزی قوم کو اسلام کے خطرہ سے آگاہ کرتے ہوئے لکھا تھا ۔

" اسلام کی حقیقی بنیادی اقدار انسانیت کی وسیع تر بہبود پر مبنی ہونے کے باعث اس قدر پرکشش اور دل فریب ہیں کہ عالم اسلام میں کہیں بھی اس کا سوتا پھوٹ سکتا ہے ۔ اور اپنے انسان دوست اصولوں کی بنا پر جلد ہی سیلاب کی شکل اختیار کرلے گا ۔ یورپ کے لیے اس پر بند باندھنا مشکل ہو جائے گا ۔ اس لیے ہوشیار، خبردار ــــ"

؎ ظہور پاکستان ۔ از چودھری محمد علی ۔ ص ۵۹ ۔ ۵۸ ۔

؎ ۱۳ نومبر ۱۹۳۹ء کو آل انڈیا ریڈیو بمبئی سے عیدالفطر کے موقعہ پر مسلمانوں کے نام پیغام ۔

Our Freedom Fighter - G. Allana

"ہم چاہتے ہیں کہ ہماری قوم اپنے تصورات اور مزاج کے مطابق اور جس طرح ہمارے خیال میں بہتر ہو روحانی، ثقافتی، اقتصادی اور سیاسی زندگی میں ترقی کرے۔" ؎

"ان لوگوں کو چھوڑ کر جو بالکل ہی ناواقف ہیں۔ ہر شخص جانتا ہے کہ قرآن مسلمانوں کا ہمہ گیر ضابطہ حیات ہے۔ مذہبی، معاشرتی، دیوانی، معاشی، عدالتی غرضکہ ہماری مذہبی رسومات سے لے کر روزمرہ کی زندگی کے معاملات تک۔ روح کی نجات سے لے کر جسم کی صحت تک، اجتماعی حقوق سے لے کر انفرادی حقوق تک، اخلاقیات سے لے کر جرائم تک۔ دنیاوی سزاؤں سے لے کر آنے والی زندگی کی جزا و سزا تک کے تمام معاملات پر اس کی عملداری ہے۔ اور ہمارے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ہمیں ہدایت کی ہے کہ ہر شخص اپنے پاس قرآن رکھے۔ اور خود رہنمائی حاصل کرے۔ اس لیے اسلام صرف روحانی احکام اور تعلیمات اور رسم اسم تک ہی محدود نہیں ہے۔ یہ ایک کامل ضابطہ ہے جو مسلم معاشرہ کو مرتب کرتا ہے۔"

۱۴۔ اپریل ۱۹۴۸ء کو قائداعظم نے اسلامیہ کالج پشاور میں فرمایا:

۱۔ ہم نے پاکستان کا مطالبہ زمین کا ایک ٹکڑا حاصل کرنے کے لیے نہیں کیا ہے بلکہ ہم ایک ایسی تجربہ گاہ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ جہاں ہم اسلام کے اصولوں کو آزما سکیں۔

پاکستان کو وہ عالمِ اسلام کے لیے باعثِ خیر و برکت سمجھتے تھے۔ انہوں نے قاہرہ (۲۶ دسمبر ۱۹۴۶ء) میں تقریر کرتے ہوئے عرب دنیا کو آگاہ کیا۔

"اگر ہندوستان میں ہندو شہنشاہیت قائم ہو گئی تو اگرچہ سابقہ دور کی برطانوی

---

؎ پاکستان ناگزیر تھا ص ۲۵۳۔

ملوکیت سے بڑی تو نہیں ہوگی مگر مستقبل میں قائم ہونے والی ہندوستانی سامراج اس جیسی ہی بڑی لعنت ثابت ہوگی اور پورا مشرقِ وسطیٰ گرہ ھائی سے نکل کر آگ میں جا گرے گا۔

ہمارے لئے پاکستان زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔ اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ آپ اپنے گھروں میں آزاد رہیں تو آپ کو ہمارے ساتھ اشتراک عمل کرنا چاہیئے۔ اس وقت کوئی بھی ایسی مسلم حکومت نہیں ہے جو صحیح معنوں میں آزاد ہو۔ ایران جو کئی صدیوں سے آزاد تھا غلام ہو گیا۔ اس وقت تک عرب حکومتیں حقیقی معنوں میں آزاد نہ ہوں گی جب تک پاکستان قائم نہ ہوگا۔ اس لئے کہ جو ہندوستان پہ اقتدار رکھتا ہے، وہی مشرق وسطیٰ پر بھی اقتدار رکھتا ہے۔ اگر ہندوستان میں ہندو شاہنشاہیت قائم ہوگئی تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ہندوستان سے اسلام ختم ہو گیا، بلکہ ہندوستان سے ہی نہیں، دوسرے اسلامی ممالک سے بھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مذہبی اور روحانی رشتے ہمیں اور مصریوں کو ایک رشتے میں باندھے ہوئے ہیں۔ اگر ہم ڈوبے تو سب ڈوب جائیں گے"۔

حال ہی میں بعض سیاسی حلقوں کی طرف سے یہ بات کہی جا رہی ہے کہ قیام پاکستان کا اصلی محرک ہندوستان میں مسلمانوں کے معاشی مسائل تھے۔ ان کے خیال کے مطابق قائدِ اعظم محمد علی جناح پاکستان میں ایک لادینی ریاست قائم کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے لیے وہ قائدِ اعظم کی تقریر (۱۱ اگست ۱۹۴۷ء) کا ایک اقتباس پیش کرتے ہیں۔

"وقت آئے گا جب ہندو ہندو نہیں رہیں گے اور مسلمان مسلمان نہیں رہیں گے"۔

ایک جملہ کو سیاق و سباق سے کاٹ کر مختلف مفہوم نکالا جا سکتا ہے ورنہ اگر پوری تقریر پیش نظر ہو تو یہ مفہوم درست نہیں ہے۔ تقریر یہ ہے۔

"ہم اپنی اسٹیٹ کا کام اس اصل کی بنا پر شروع کر رہے ہیں کہ اس میں ایک قوم، ایک عقیدہ یا ایک برادری کو دوسری قوم دوسرے عقیدہ اور دوسری برادری پر کوئی امتیاز و اختصاص حاصل نہیں ہوگا۔ ہم اس بنیاد و اساس پر کام کا آغاز کر رہے ہیں کہ ہم سب شہری ہیں۔ ایک اسٹیٹ میں مساوی درجے کے شہری ہیں۔ آپ کو چاہیے کہ اس اصل کو نصب العین کے طور پر سامنے رکھیں۔ وقت آئے گا جب ہندو ہندو نہیں رہیں گے مسلمان مسلمان نہیں رہیں گے۔ مذہبی حیثیت سے نہیں اس لیے کہ مذہب ہر فرد کے اعتقاد پر مبنی ہے۔ بلکہ سیاسی حیثیت سے۔ ایک قوم کے شہریوں کی حیثیت سے۔"

اس تقریر کو پڑھ کر ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے کہ یہاں قائد اعظم ہر ساحت میں شہریوں کے حقوق مساوی ہونے کا اعلان کر رہے ہیں۔ یہاں ریاست کی نوعیت کا بیان نہیں ہو رہا ہے۔ واضح رہے اس وقت ہندوستان میں مسلمانوں کا قتل اور غارت گری ہو رہی تھی۔ اس لئے شہریوں کے حقوق بیان کیے جا رہے ہیں۔ ہندوؤں کو تحفظ دینے کا ذکر ہو رہا ہے۔ اس لیے مذکورہ بالا استدلال بے بنیاد ہے۔

فروری ۱۹۴۸ء میں ایک اخبار کو انٹرویو دیتے ہوئے قائد اعظم نے فرمایا۔

"پاکستان کا دستور ابھی بننا ہے۔ اور یہ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی بنائے گی مجھے نہیں معلوم کہ اس دستور کی شکل اور ہیئت کیا ہوگی لیکن اتنا یقینی ہے کہہ سکتا ہوں کہ یہ دستور جمہوری نوعیت کا ہوگا اور اسلام کے بنیادی اصولوں پر مشتمل ہوگا۔ ان اصولوں کا اطلاق آج کی عملی زندگی پر بھی اسی طرح ہو سکتا ہے جس طرح تیرہ سو سال پہلے ہوا تھا۔ اسلام اور اس کے نظریات سے ہم نے جمہوریت کا سبق سیکھا ہے۔ اسلام نے ہمیں مساوات انصاف اور ہر ایک سے رواداری کا درس دیا ہے ہم ان عظیم الشان روایات کے وارث ہیں اور اپنی اور پاکستان کے

آئندہ دستور کے معمار اور بانی کی حیثیت سے ہم اپنی ذمہ داریوں اور فرائض سے بخوبی آگاہ ہیں۔ انٹرویو۔ فروری ۱۹۴۸ء

اگلے سال اسٹیٹ بینک آف پاکستان کی تقریب افتتاح کے موقع پر قائد اعظم نے فرمایا۔ اس وقت ان کی حیثیت گورنر جنرل پاکستان کی تھی۔ یکم جولائی ۱۹۴۸ء۔

"میں آپ کے ادارہ تحقیقات کے اس کام کا بڑی دلچسپی سے مطالعہ کروں گا جو وہ بینکنگ کے طریقہ کار کو اسلام کی معاشی اور معاشرتی زندگی کے مطابق وضع کرنے کے لیے انجام دے رہا ہے۔ مغرب کے نظام اقتصادی نے بنی نوع انسان کے لیے ایسے ناقابل حل مسائل پیدا کر دیے ہیں کہ ہم میں سے بہت سوں کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی معجزہ ہی اس کو تباہی سے بچا سکتا ہے جو اس وقت دنیا کو در پیش ہے۔ وہ انفرادی طور پر انسانوں کے درمیان انصاف کرنے میں ناکام ہے۔ اور اس سے زیادہ بین الاقوامی میدان میں ناکام رہا۔ اس کے برخلاف گزشتہ نصف صدی کے اندر اس کی وجہ سے دو عالمگیر جنگیں ہو چکی ہیں۔ اس کے باوجود کہ اس کو مشین سے کام کرنے کی اور فنی مہارت کی سہولت حاصل ہے۔ لیکن مغربی دنیا اس وقت ایسی دشواریوں میں مبتلا ہے کہ تاریخ میں کبھی نہیں ہوئیں۔

اس مقصد میں کہ ہم اپنی قوم کی تعمیر اس طرح کریں کہ وہ خوش حال اور مطمئن ہو، ہمیں اس سے بالکل مدد نہیں ملے گی کہ ہم مغرب کے نظام اقتصادی کو اصولاً اور عملاً اختیار کریں۔ ہمیں اپنے مستقبل کی تعمیر اپنے طریقے پر کرنی چاہیے۔ اور دنیا کے سامنے وہ نظام اقتصادی تحفتہً پیش کرنا چاہیے جو اسلام کے سچے تصور مساوات انسانی اور معاشرتی انصاف پر مبنی ہو۔ اس طرح ہم بحیثیت مسلمان اپنا مشن پورا کریں گے اور دنیا کو امن کا وہ پیغام دیں گے کہ صرف وہی انسانیت کو تباہی سے بچا سکے گا۔ اور بنی نوع انسان کی مسرت اور فلاح و بہبود کی ضمانت کا

باعث ہوگا۔[1]

## نواب بہادر یار جنگ (۱۹۴۴ء)

"میری منزل مسلمان کو منفرداً اور جماعت اسلامیہ کو مجتمعاً منہاج نبوت پر دیکھنا ہے۔ میں مسلم لیگ کے ساتھ اس لیے ہوں کہ غیر شعوری طور پر اس کا قائد اس منزل کی طرف چلا جا رہا ہے۔ اس مقصد کو مقصد حیات سمجھنے والوں کا ایک بڑا گروہ لیگ میں پیدا ہو گیا ہے۔ اور آپ حیران ہوں گے کہ یہ سب کے سب دیوانے ڈاڑھی منڈے اور مصطلحاً غیر عالم ہیں۔"[2]

"پاکستان حاصل کرنا اتنا مشکل نہیں ہے جتنا کہ پاکستان کو پاکستان بنانا اور قائم رکھنا مشکل ہے۔ ہم پاکستان صرف اس لیے نہیں چاہتے کہ مسلمانوں کے لیے ایک ایسی جگہ حاصل کریں جہاں شیطان کے آلہ کار بن کر انہی دسائیر کا فرانہ پر عمل کریں جن پر آج کی ساری دنیا کاربند ہے۔ اگر پاکستان کا یہی مقصد ہے تو کم از کم میں ایسے پاکستان کا حامی نہیں ہوں۔ یہ ایک انقلاب ہوگا۔ یہ ایک نشاۃ ثانیہ ہوگی۔ یہ ایک حیات نو ہوگی جس میں خوابیدہ تصورات اسلامی ایک مرتبہ پھر آزمائے جائیں گے اور حیات اسلامی ایک بار پھر کروٹ لے گی۔"

"ہمارے پنڈال سے وہ لوگ اٹھ جائیں جو خدا کے انکار پر اپنے معاشی نظام کی بنیاد رکھتے ہیں۔ قرآن کے واضح اور اٹل احکامات میں تحریف و اضافہ کر کے مسلمانوں کو گمراہ

---

[1] Quaid-e-Azam Mohammad Ali Jinnah — Speeches As Governor General Pakistan — 1947-48 Laboratory P. 153, 154

[2] پاکستان ناگزیر تھا۔ تقریر ۱۹۴۴ء

کرنا چاہتے ہیں۔ اور جو روئی کپڑے کے بدلے مسلمان کا ضمیر اور اس کا ایمان خریدنا چاہتے ہیں۔"

## علامہ شبیر احمد عثمانی شیخ الاسلام پاکستان ۱۹۴۵

"ہم ایک ایسی اسلامی مملکت تعمیر کرنا چاہتے ہیں جس کی بنیاد اسلام اور قرآن کے اصولوں پر رکھی جائے جس کی تعمیر میں تقویٰ اور دین شامل ہو۔ ہاں ایک ایسی اسلامی ریاست جو آگے چل کر خلافت راشدہ کے نمونہ کی مثال بن سکے۔"

"اکابر مسلم لیگ کے وہ اعلانات جو گزشتہ الیکشن کے دوران میں پاکستان میں اسلامی اور قرآنی نظام قائم کرنے کے متعلق کیے گئے تھے۔ میں اپنی خاص و عام مجالس میں اور تحریر و تقریر میں برابر دہراتا رہتا ہوں۔"

آل انڈیا جمعیت علماء اسلام کا تاسیسی اجلاس منعقدہ کلکتہ ۲۶، ۲۷، ۲۸، ۲۹ اکتوبر ۱۹۴۵ء علامہ شبیر احمد عثمانی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جس میں یہ قرارداد منظور ہوئی۔

"یہ اجلاس اعلان کرتا ہے کہ ملت اسلامیہ کا سیاسی اور دینی نصب العین عالمگیر خلافت اسلامی علیٰ منہاج نبوت محمدی کی تاسیس ہے۔ اور شریعت اسلامیہ کے نظام کا قیام ہے۔"

## نواب زادہ لیاقت علی خاں ۔ وزیر اعظم پاکستان

۱۵ جنوری ۱۹۴۸ء کو پشاور میں وزیر اعظم پاکستان لیاقت علی خان نے کہا تھا:

"میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ پاکستان صحیح معنوں میں ایک اسلامی مملکت ہوگا۔ اور اگر ایسا نہ ہوا تو حصول پاکستان بے کار ہو جائے گا۔ پاکستانیوں کے اتحاد کے بعد پاکستان میں آج سے ساڑھے تیرہ سو سال قبل کے اسلامی

نظام کی عمل داری ہوگی۔ پاکستانی علاقوں میں تمام نظام و انتظام حکومت قرآن پاک کے احکام اور اصولوں کے بموجب ہوگا۔"

۹ر فروری ۱۹۵۱ء کو موتمر عالم اسلامی کے اجلاس منعقدہ کراچی میں تقریر کرتے ہوئے لیاقت علی خاں، وزیر اعظم پاکستان نے فرمایا۔

"حصول پاکستان کی تحریک کا یہ مقصد کبھی نہیں رہا کہ دُنیا کے بے شمار ممالک میں اور ملک کا اضافہ کیا جائے یا دُنیا کے نقشے کے متعدد رنگوں میں ایک اور رنگ کا اضافہ کیا جائے۔ پاکستان کے حصول کی جدوجہد میں برّاعظم کے مسلمانوں کا مقصد یہ رہا کہ اپنے لیے ایک خطہ زمین حاصل کریں۔ چاہے وہ کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو۔ جہاں اسلامی تصورات اور اصول حیات پر عمل کیا جائے اور اس کے ثمرات کا دُنیا کے سامنے مظاہرہ کرسکیں:"

"ہم نے پاکستان اس لیے بنایا ہے کہ یہاں ہم اسلام کے نظام حیات کو عملاً برپا کریں گے۔ پاکستان اسلام کے لیے ایک دارالعمل یعنی Laboratory ہوگا (خطاب امریکی کانگریس مئی ۱۹۵۰ء)

ہمارا ایمان ہے کہ ریاست، حکومت اور دیگر شعبہ ہائے زندگی جب اس نظریہ (اسلامی نظریہ حیات) کی بنیاد پر استوار کیے جاتے ہیں تو انسانوں کی فلاح اور بہبود میں لازماً اضافہ ہوتا ہے ——

یہ مسلمان قوم کے مختلف اکابرین کے اقوال ہیں۔ جو ظاہر کر رہے ہیں کہ خلافت تحریک کے بعد مسلمانوں پر اور مسلمان زعماء پر خصوصاً اسلامی نظام کی بازیافت ہوگئی تھی جس کا وہ باربار

---

(شکاگو کونسل آف فارن ایسوسیشن میں لیاقت علی خان کی تقریر۔ ۱۱ مئی ۱۹۵۰ء جو ڈان ۱۳ مئی ۱۹۵۰ء میں شائع ہوئی تھی)۔

ذکر کرتے ہیں اور یہی تحقیق اور بازیافت دراصل قوت محرکہ ہے جس نے مسلمان قوم کو سرگرم عمل رکھا ہزار مشکلات اور دشواریوں کے منجدھار میں سرگرم عمل رکھا۔ جان و مال کی بڑی بڑی قربانیوں پر ابھارا۔ جس کے بعد بالآخر پاکستان معرض وجود میں آگیا۔

## قومی تشخص کی بازیافت

اسلام ایک نظام حیات ہے۔ ایک کل ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ غیر دین کی آمیزش سے اس کا قوام اور مزاج متغیر ہو جائے۔ اس لیے بدعت سے نئے اضافوں سے کی وہ شدت کے ساتھ مذمت کرتا ہے۔ تاکہ اسلام کا امتیازی تشخص برقرار رہے وہ مسلمانوں کا انفرادی تشخص بھی برقرار رکھنا چاہتا ہے۔ اس نے تشبہ بالکفار سے منع کیا ہے۔ رسولؐ کا فرمان ہے "یہود و نصاریٰ اور مجوس کی مخالفت کرو۔ داڑھی بڑھاؤ اور مونچھیں کٹاؤ" تاکہ مسلمانوں کی داڑھی دور سے ممتاز نظر آئے۔ اسلام جانتا ہے کہ ظاہری مشابہت اور تقلید فکری اضمحلال اور خصوصی امتیازات کو محو کرنے والی ہوتی ہے جس کے بعد دوسری قوم میں انضمام کا راستہ کھل جاتا ہے۔ ہندو مورخین اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ ہندو مذہب کا دامن اتنا وسیع ہے کہ تمام حملہ آور قومیں اس میں ضم ہو گئیں۔ صرف مسلمان اس سے محفوظ رہ گئے۔ یہ اس وجہ سے ہو سکا کہ اسلام اپنے پیروکاروں کا تشخص محفوظ رکھنے کا اہتمام کرتا ہے۔ ہندوستان میں ہندو اور مسلمان اول روز سے دو قومیں ہیں۔ عہد غزنوی کا مشہور مورخ البیرونی لکھتا ہے۔

> "ہندو ہم سے ہر اعتبار سے مختلف ہیں . . . . . . . . . . . .
>
> "قمیض اتارنے میں بھی اختلاف ہے۔ ہم گریبان سے قمیض اتارتے ہیں اور وہ پچھلے دامن کو پکڑ کر قمیض الٹے طریقے سے اتارتے ہیں۔ وہ ہر غیر ملکی کو ملیچھ (گندے) تصور کرتے ہیں"۔[1]

---

[1] کتاب الہند۔ از بیرونی۔ مرتب سخاؤ۔ جلد اول۔ ص ۱۱۔

گزشتہ صدی کے مشہور صوفی غوث علی شاہ قلندر پانی پتی (۱۸۰۴-۱۸۸۰ء) لکھتے ہیں۔

"تسبیح گھمانے میں بھی ہمارے اور ہندوؤں کے درمیان فرق ہے۔ ہم دانہ اندر کی طرف لیتے ہیں وہ باہر کی طرف پھینکتے ہیں۔" (تعلیمات اسلامی)

مولانا خلیل احمد دیوبندی لکھتے ہیں۔

"کرتے کا گریبان ہم داہنی طرف کھولتے ہیں اور ہندو بائیں طرف۔"[1]

غرض شکل صورت، لباس، وضع، اطوار ہر شے میں مسلمان ہندو سے مختلف ہیں۔

یہ سب مشہور اور معلوم حقیقتیں ہیں۔ مگر انگریز کے غلبہ کے دور میں ملی تشخص پر بھی گرد وغبار آگیا تھا۔ انگریزوں نے وطنی قومیت کا پروپاگنڈا تعلیم گاہوں اور دوسرے ذرائع سے اس زور شور سے پھیلایا کہ مسلمانوں کی نئی نسلیں اس سے متاثر ہوگئیں۔ اور وطنی قومیت پر ایمان لے آئیں خلافت تحریک سے قبل کے نصف صدی کے عرصہ میں تو دین و ملت سب ہی تصورات مضمحل ہوگئے تھے۔ قومیت کے تصورات بھی دھندلے پڑ گئے تھے۔ ہر شے دھندلی تھی۔

خلافت تحریک کا ایک پہلو یہ ہے کہ اس میں ہندو مسلمان دونوں قوموں نے مل کر انگریزوں کے خلاف جدوجہد کی تھی، اس دور میں "ہندو مسلمان بھائی بھائی" کے نعرے لگائے گئے۔ اس دور سے کے ساتھ رواداری کے عجیب وغریب منظر دیکھنے میں آتے۔ کانگریسی راج کے زمانہ میں سیاسی حکمت عملی کے طور پر متحدہ قومیت کو فروغ دینے کی بھرپور کوشش کی گئی۔ سرکاری طور پر رابطہ عوام مسلمین کی مہم جاری کی گئی۔ معتدد علماء ملازم رکھے گئے۔ جو اس کا صحیح ہونا قرآن وحدیث سے ثابت کرتے تھے۔ جب اتنے طویل عرصہ سے اور اتنے مختلف ذرائع سے وطنی قومیت یا متحدہ قومیت کو پھیلایا جارہا تھا تو مسلمان قوم کا اس سے متاثر ہوجانا غیر متوقع نہیں۔

---

[1] تذکرۃ الخلیل۔ عاشق الٰہی میرٹھی۔ کراچی ۱۹۷۱ء۔ ص ۳۹۔

[2] ہندو تصور قومیت ملاحظہ ہو "یقیناً میں اس خیال کے خلاف بغاوت کروں گا کہ کروڑوں ہندوستانی جو کل تک ہندو تھے اپنا مذہب تبدیل کرنے کی وجہ سے اپنی قومیت بھی بدل سکتے ہیں۔" گاندھی جی۔ (اخبار ہریجن ۶۔ اپریل ۱۹۴۰ء)

متحدہ قومیت کے طلسم کو توڑنے میں ہندوؤں کی شرانگیز حرکتوں کو بڑا دخل حاصل ہے۔
مسلمانوں کو سب سے بڑا صدمہ ہندوؤں کی مہم اہانت رسولؐ سے پہنچا۔

مسلمان عوام ان حرکتوں کی وجہ سے ہندوؤں سے متنفر اور بیزار ہو گئے فکری محاذ پر متحدہ محاذ کا توڑ علامہ اقبال نے کیا ہے۔

اپنی ملت کو قیاس اقوام مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قوم رسولؐ ہاشمی

اور پھر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے ترجمان القرآن میں ایک سلسلہ مضامین لکھ کر متحدہ قومیت کے تار و پود بکھیر دیے۔ (آزادی ہند اور مسلمان) خلافت تحریک کے بعد مزید پندرہ سال گزر گئے جب ملی تشخص کا شعور بیدار ہوا اور بڑی تاخیر سے جداگانہ قومیت کا تصور مسلمانوں میں اُبھرا۔

جداگانہ قومیت کا ادراک سب سے پہلے عوام الناس نے کیا۔ پھر مسلمان اوساط الناس نے کیا اور سب سے آخر میں مسلمان خواص اور زعماء نے کیا۔

## قائدِ اعظم محمد علی جناح

"تمام امور میں ہمارا انداز فکر ہندوؤں سے مختلف ہی نہیں بلکہ متضاد ہے۔ ہمارا وجود ہماری دنیا ہی مختلف ہے۔ آپ کو کوئی ایک چیز بھی ایسی نہیں ملے گی جو ہمیں ہندوؤں سے ہم آہنگ کرتی ہو۔ ہمارے نام، ہماری غذا، ہمارا لباس سب کچھ ہندوؤں سے مختلف ہے۔ ہماری اقتصادی زندگی، ہمارا تعلیمی نقطہ نگاہ، خواتین سے ہمارا رویہ، حیوانات کے ساتھ ہمارا طرز عمل غرضکہ ہر نقطۂ نظر اور ہر اعتبار سے ہم ایک دوسرے سے واضح

اختلاف رائے رکھتے ہیں۔ گائے کے دیرینہ اور دائمی اور مستقل قضیہ ہی کو لے لیجیے۔ ہم گائے کو ذبح کرتے ہیں اور کھاتے ہیں۔ لیکن ہندو اس کی پوجا کرتے ہیں"

قائداعظم نے ۱۷ ستمبر ۱۹۴۴ء کو گاندھی جی کو خط لکھا تھا۔ اس میں لکھا تھا۔

"ہمارا دعویٰ ہے کہ قومیت کی ہر تعریف اور ہر معیار کی رو سے مسلمان اور ہندو دو بڑی قومیں ہیں۔ ہماری قوم دس کروڑ انسانوں پر مشتمل ہے۔ اور مزید براں یہ کہ ہم ایک ایسی قوم ہیں جو اپنی خاص تہذیب و تمدن، زبان و ادب، فنون و تعمیرات رسوم و اصطلاحات، معیار اقدار و تناسب، تشریعی قوانین ضوابط اخلاق، رسم و رواج، نظام تقویم، تاریخ و روایات، اور رجحانات و عزائم رکھتی ہے۔ بغرض یہ کہ ہمارا ایک خاص نظریہ حیات ہے۔ اور زندگی کے متعلق ہم ایک ممتاز تصور رکھتے ہیں۔ بین الاقوامی قانون کے تمام اصولوں کے مطابق ہم ایک قوم ہیں"

## علامہ شبیر احمد عثمانی

"سب سے زیادہ اشتعال انگیز جھوٹ یہ ہے کہ دس کروڑ مسلمانان ہند کی مستقل قومیت کا انکار کر دیا جاتے"۔[1]

"ہندوستان میں دس کروڑ مسلمان ایک مستقل قوم ہیں جن کی وحدت اور شیرازہ بندی کے لیے ضرورت ہے کہ کوئی اس کا مستقل مرکز ہو۔ جہاں سے اس کے قومی محرکات اور عزائم فروغ پا سکیں۔ اور جہاں سے وہ مکمل آزادی اور مادی اقتدار کے ساتھ

---

[1] کل ہند جمعیۃ العلماء اسلام۔ کلکتہ۔ اکتوبر ۱۹۴۵ء

اپنے خدائی قانون کو بے روک ٹوک نافذ کر سکے۔ دُنیا کو وہ مشعل ہدایت دکھلا سکے جس کی آج ہمیشہ سے زیادہ دُنیا کو ضرورت ہے۔"

## ڈاکٹر عبدالستار خیری

۱۹۳۷ء میں جب پہلی بار ہندوستان میں قومی حکومتیں قائم ہوئیں تو جلاوطن محبانِ وطن کو واپس ہندوستان آنے کا موقع ملا۔ ان آنے والوں میں خیری برادران بھی تھے جو ۱۹۰۰ء سے ملک سے باہر زندگی گزار رہے تھے۔ بیشتر لوگ کانگریس کے ہمنوا تھے لیکن خیری برادران مُسلم لیگ کے ہمنوا تھے

یہاں ڈاکٹر عبدالستار خیری کو مُسلم لیگ کی مجلس عاملہ کا ممبر منتخب کر لیا گیا ڈاکٹر عبدالستار خیری نے سب سے پہلے کہا تھا۔

"ہم اقلیت نہیں ہیں۔ ہم ایک جداگانہ قوم ہیں۔ جب انگریز چار کروڑ فرانسیسی پانچ کروڑ اور جرمن چھ کروڑ جداگانہ قومیں ہیں تو ہندی مسلمان سات کروڑ کی تعداد کے ساتھ کیوں جداگانہ قوم نہیں ہیں"

"ہم ایک جداگانہ قوم ہیں۔ ہمیں جداوطن چاہیے"

آغا خان نے کہا ہے۔

"ان کو محض ایک اقلیت تصور کیا جاتا ہے۔ بلکہ یہ قوم کے اندر ایک قوم ہیں ان کی حیثیت کے مطابق ان کے حقوق اور روائتوں کی ضمانت دی جاتی ہے"

اس کے بعد سے مسلمانوں نے خود کو اقلیت کہنا چھوڑ دیا۔

خلافت تحریک میں حکومت الٰہیہ کی بازیافت ہوئی۔ جداگانہ قومیت کی بازیافت میں پندرہ سال لگ گئے۔ اگر وہی تشخص کے ساتھ ساتھ ہی ملی تشخص ــــــ جداگانہ قومیت ــــــ کی بازیافت بھی اس زمانہ میں ہو جاتی تو منزل مراد متعین ہونے میں مزید ربع صدی نہیں گزرتی اور شاید پاک...

۱۹۴۷ء سے پہلے ہی بن جاتا۔

علی گڑھ کالج میں جس قسم کی قومیت پروان چڑھ رہی تھی وہ مسلم قوم پرستی تھی مسلم لیگ نے اسی قوم پرستی کو اختیار کر لیا۔ اسلامی تصور قومیت تمام ان کا ذہن ترقی نہ کر سکا یہی وجہ ہے کہ پاکستان میں مسلم لیگ کے زعماء نے مسلمانوں کی ایک قومی ریاست تو قائم کر دی لیکن صحیح اسلامی ریاست قائم کرنے میں ابھی تک کامیابی حاصل نہیں ہوئی

# جغرافیائی محل وقوع

## علامہ شبیر احمد عثمانی

"یہ بھی اللہ کی عجیب قدرت و حکمت کی نشانی ہے کہ باوجود اس کے کہ مسلمان اس ملک میں مجموعی طور پر دوسری اقوام سے تعداد میں کم ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ نے ہماری اس کمی کو ملک کے تمام صوبوں میں مساوی طور پر تقسیم نہیں کیا۔ بلکہ بعض صوبوں میں جو جغرافیائی حیثیت سے اہم بھی ہیں۔ ہم کو دوسروں کے مقابلے میں اکثریت عطا فرمادی۔ یہ گویا قدرت کی طرف سے پاکستان قائم کر لینے کے امکان کی طرف ایک غیبی اشارہ ہے۔"

# تقسیم ملک کی باتیں

اسلامی نظام حکومت اور نظام حیات کی بازیافت اور اسلامی قومیت کی بازیافت کے بعد لازمی نتیجہ یہ نکلنا چاہیے تھا کہ جداگانہ ملک اور مملکت کا مطالبہ کیا جاتا۔ یہ منطقی تقاضا تھا۔ لیکن جب ہندوستان میں چاروں طرف فسادات پھوٹ پڑے تو اوساط الناس نے سوچنا شروع کر دیا کہ جب دونوں قومیں ساتھ نہیں رہ سکتی ہیں تو پھر علیحدہ علیحدہ وطن بنا کر رہیں۔ اس لیے ہندوستان کے وسیع و عریض ملک کو تقسیم کر دینا چاہیے۔ اس نوعیت کے بعض

مطالبوں کا ذیل میں تذکرہ کیا جاتا ہے۔

(۱) خیری برادران۔ ڈاکٹر عبدالجبار خیری اور ڈاکٹر عبدالستار خیری دہلوی — ۱۹۰۵ء سے ہندوستان سے باہر جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ ۱۹۱۷ء میں اسٹاک ہالم ڈنمارک میں اقلیتوں کے مسائل پر غوروخوض کرنے کے لیے ایک بین الاقوامی کانفرنس سوشلسٹ انٹرنیشنل کانفرنس ہوئی۔ خیری برادران نے مسلمانانِ ہند کی مرکزی کمیٹی کے نمائندوں کی حیثیت سے اس کانفرنس میں شرکت کی۔ وہاں انھوں نے ہندوستان کے مسائل کا سیاسی حل پیش کیا کہ مسلم ہندوستان اور ہندو ہندوستان میں ملک کو تقسیم کر دینا چاہیے۔

یہ پہلا موقع تھا کہ تقسیم ملک کی تجویز ایک بین الاقوامی پلیٹ فارم سے یورپ میں پیش کی گئی۔ اسی وقت لندن ٹائمز نے اس کا نوٹس لیا تھا۔ اور اس پر شذرہ لکھا تھا۔

(۲) ہفتہ وار اخبار ذوالقرنین بدایوں مارچ و اپریل ۱۹۲۰ء میں ایک کھلا خط بنام مہاتما گاندھی شائع ہوا تھا۔ جس میں صراحت کے ساتھ تقسیم ملک کی تجویز پیش کی گئی تھی۔ پروفیسر محمد ایوب قادری کی تحقیق یہ ہے کہ حقیقت میں تو یہ اسکیم عبدالعزیز بلگرامی کی تھی۔ مگر چونکہ وہ سرکاری ملازم تھے اس لیے انھوں نے اپنے بھائی عبدالقدیر بلگرامی کے نام سے شائع کرائی تھی۔ یہ ایک مفصل اسکیم تھی۔

(۳) سردار گل محمد خان صدر انجمن اسلامیہ ڈیرہ اسمٰعیل خان نے سرحد میں تحقیقاتی کمیشن کے سامنے بیان دیتے ہوئے ۱۹۲۳ء میں تقسیم ملک کی اسکیم پیش کی تھی۔ وہ پشاور سے لے کر آگرہ تک کا علاقہ مسلمانوں کو دینا چاہتے تھے۔

(۴) مشہور آریہ سماجی لیڈر لالہ لاجپت رائے لاہوری نے تقسیم ملک کی ایک تجویز پیش کی تھی۔ جس میں پشاور سے جہلم تک کا علاقہ مسلمانوں کو دینا چاہتے تھے۔

(۵) آل پارٹیز کنونشن منعقدہ کلکتہ ۱۹۲۸ء میں سر محمد آغا خان نے ہر صوبہ کے لیے کامل خود

مختاری کا مطالبہ کیا تھا۔ پھر لندن ٹائمز کی اشاعت ۱۲-۱۳ اکتوبر میں انھوں نے شمال مغربی علاقوں میں آزاد مسلمان ریاست قائم کرنے کی تجویز پیش کی تھی۔

(۶) ۱۹۲۸ء میں ایک مسلمان نے "انڈین مسلمز" کے نام سے ایک کتابچہ شائع کرایا تھا۔ جس میں دو قوموں کی بنیاد پر دو ملکوں کا مطالبہ کیا تھا۔

(۷) ۱۹۲۹ء میں نواب ذوالفقار علی خاں نے آل انڈیا خلافت کانفرنس لاہور کے صدارتی خطبہ میں مسلمانوں کے لیے جداگانہ وطن کا مطالبہ کیا تھا۔ یہ وطن سندھ، پنجاب اور بنگال پر مشتمل ہونا چاہیے۔

(۸) ۳۰ دسمبر ۱۹۳۰ء کو مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ الہ آباد میں علامہ اقبال نے اپنے خطبہ صدارت میں کہا تھا۔

"یہ دیکھنا چاہوں گا کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک ریاست بنا دیا جائے۔ حکومت خود اختیاری خواہ سلطنت برطانیہ کے اندر ہو یا باہر اسے حاصل ہو مجھے ایک شمالی مغربی ہندوستانی مسلم ریاست کی تشکیل مسلمانوں کا (کم از کم شمال مغرب کے مسلمانوں کا) آخری مقدر معلوم ہوتی ہے۔"

موقع ہے کہ مسلمانوں کی واحد ذمہ دار تنظیم مسلم لیگ کے ذمہ دار پلیٹ فارم سالانہ اجلاس کے صدارتی خطبہ سے ہندوستان کا سیاسی حل تقسیم ملک کو قرار دیا گیا اس لیے اس مطالبہ کی سب سے ...

(۹) ۱۹۳۳ء میں چودھری رحمت علی طالب علم کیمبرج یونیورسٹی انگلستان نے ایک پمفلٹ Now or Never لکھ کر شائع کیا۔ انھوں نے تقسیم کی اسکیم کو آگے بڑھایا ... کے اولین حروف کو ملا کر انھوں نے پاکستان کا لفظ تخلیق کیا۔ جو مجوزہ مملکت کا نام پایا۔ چودھری رحمت علی نے مزید چند پمفلٹ لکھے۔

(۱۰) ... میں فرانسیسی زبان میں Encyclopaedia of Schools شائع ہوا۔ اس کے ضمیمہ میں مشہور عرب سیاست دان علامہ شکیب ارسلان شامی نے پاکستان

پر مضمون لکھا۔

۱۱۔ سندھ صوبائی مسلم لیگ کی کانفرنس منعقدہ کراچی (۸ - ۹ - ۱۰) اکتوبر ۱۹۳۸ء بصدارت قائدِ اعظم محمد علی جناح نے درج ذیل قرارداد منظور کی۔

"صوبہ سندھ مسلم لیگ کانفرنس برصغیر میں قیامِ امن اور دونوں قوموں۔ ہندو اور مسلمان۔ کی بغیر مداخلت کے ثقافتی ترقی، معاشی اور معاشرتی بہتری اور ان کے حق خود ارادیت کے لیے ہندوستان کو دو وفاقوں۔ مسلم ریاستوں کا وفاق اور غیر مسلم ریاستوں کا وفاق۔ میں تقسیم کر دینے کا مطالبہ کرتی ہے۔

اور آل انڈیا مسلم لیگ سے سفارش کرتی ہے کہ وہ اس مکمل نظریہ پر نظرثانی کرے۔ اور دیکھے کہ باعزت طور پر انصاف پر مبنی ریاستوں کے حصول کے لیے ہندوستان کے دستور میں کیا کیا ہونا چاہیے"

اس قرارداد سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مسلم لیگ نے تقسیم کی اسکیم کو قبول کر لیا۔ اور اس کے حصول کے لیے کوشش شروع کر دی۔

۱۲۔ اس مرحلہ پر تقسیم ملک کی بات زعماء اور مفکرین تک جا پہنچی۔ ۱۹۳۹ء میں مختلف لوگوں نے مختلف اسکیمیں پیش کیں۔

۱۔ ڈاکٹر سید عبداللطیف حیدرآبادی نے تقسیم ملک کی اسکیم پیش کی۔

Cultural Problem of India - - 1938

۲۔ سر سکندر حیات خاں۔ پنجاب کی اسکیم۔

An outline of a scheme of Indian freedom 1938

۳۔ پروفیسر ڈاکٹر سید ظفر الحسن اور پروفیسر ڈاکٹر افضال قادری علی گڑھ کی اسکیم۔

Problems of Indian Muslims and its solution

۴۔ میاں کفایت علی پنجابی کی اسکیم

۵۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی اسکیم:۔

مولانا نے رسالہ ترجمان القرآن حیدر آباد دکن میں تقسیم ملک کی تین متبادل تجویزیں پیش کی تھیں۔[1]

ا۔ تہذیبی بنیادوں پر بین الاقوامی وفاق کا قیام

A state of Federated Nations.

ب۔ تہذیبی منطقوں کا تعین اور تبدیل۔ Cultural Autonomy

ج۔ تقسیم ملک۔

اس وقت تک یہ بات بالکل واضح ہو چکی تھی کہ تقسیم ملک کا مقدر بن چکا ہے۔

# فوری عوامل

## فاضل تر قیادت

افراد کی انفرادی زندگی ہو یا اقوام کی اجتماعی زندگی ہر حال میں تعین مقصد کی اہمیت اور ضرورت بالکل واضح ہے۔ یہ زبردست محرک عمل ہے۔ جب مقصد متعین ہو جاتا ہے تو پھر دل و دماغ کی تمام فکری قوتیں اور دست و بازو کی تمام عملی قوتیں حصول مقصد کے لیے سرگرم عمل ہو جاتی ہیں۔ مقصد کا تعین قوائے عمل کے لیے ایک مہمیز کا کام کرتا ہے۔

یہ ایک بات کہ آدم ہے صاحب مقصود
ہزار گونہ فروغ و ہزار گونہ فراغ

لیکن مقصد کی اہمیت خواہ کتنی ہی ہو وہ رہنما کی ضرورت سے بے نیاز نہیں کر سکتی۔ مقصد متعین

---

[1] (تحریک آزادی ہند اور مسلمان۔ ص ۲۸۲)

ہو جانے کے بعد بھی ضروری نہیں ہے کہ منزل مراد ہاتھ آجائے۔ راہ میں ہزار گھاٹیاں اور ہزار خارزار آتے ہیں۔ اس لیے یہاں ایک دانا و بینا، رہبر و رہنما کی شدید ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

سیاسی جدوجہد کے آغاز سے لے کر دورِ خلافت کے آغاز تک مُسلمانوں کی قیادت قوم کو "سلاطین کا پرستار" بنانے والی تھی۔ جب خلافت تحریک کا دور شروع ہوا تو وقت کے تقاضوں کے مطابق ہنگامہ خیز اور شعلہ بار قیادت مسلمانوں کو میسر آگئی۔ وہ اسلام کے جاں نثار اور شیدائی، جری اور بے باک، لائق اور فائق لوگ تھے جنھوں نے قوم کی کشتی کی طوفان خیز موجوں میں رہنمائی کی جنھوں نے پستی سے نکال کر مسلمانوں کو اوجِ ثریا پہ پہنچا دیا۔ کل تک مسلمانوں کی آواز کمزور و نحیف تھی اس کو زوردار اور گرجدار بنا دیا۔ جب یہ دور ختم ہوا تو قیادت کا بھی خاتمہ ہو گیا۔

مولانا محمد علی جوہر کا ۴؍جنوری ۱۹۳۱ء کو انتقال ہو گیا۔ ۲۰؍اپریل ۱۹۳۸ء کو علامہ اقبال بھی وفات پا گئے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے کیمپ ہی تبدیل کر ڈالا۔ جو لوگ باقی رہ گئے تھے وہ موجودہ حالات میں ملک گیر قیادت کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے اہل نہیں تھے۔ مسٹر محمد علی جناح کی سیاست اس دور میں مجلس واضعان قانون اور سیاسی پلیٹ فارموں تک محدود تھی۔ وہ عوام میں کم متعارف تھے۔ اس لیے بظاہر مایوسی تھی اور تاریکی تھی۔

خلافتی دور میں حدی خوانی اور نغمہ نوائی کی ضرورت تھی۔ مگر بعد میں ملکی حالات کا تقاضا کچھ اور تھا۔ ایک طرف انگریزی حکومت تھی جو مسلمانوں کے معاملہ میں کبھی بھی انصاف پسند تو کیا غیر جانبدار بھی نہیں رہی۔ وہی اس کی لڑاؤ بھڑاؤ کی پالیسی جاری تھی۔ دوسری طرف کانگریس اور ہندومہاسبھا تھی۔ جو اکثریت کے پردے میں ہندو راج قائم کرنے کے خواب دیکھ رہی تھی اور مسلمانوں کو مقہور اور مرعوب بنا کر رکھنا چاہتی تھی۔ اہلِ فرنگ کی دانائی بھی ظاہر ہے اور اہلِ ہند کی زیرکی بھی واضح ہے۔

ان مخالف اور معاند قوتوں سے معاملہ کرنے کے لیے وقت کا تقاضا یہ تھا کہ مسلمانوں

یہ قیادت ایسے شخص کے پاس ہو جو معاملہ فہم ہو، دور رس نگاہ کا حامل ہو، جو لالچ اور خوف دونوں سے بے نیاز ہو، جو جری اور حوصلہ مند ہو، جو کوہ وقار ہو، آہنی عزم کا مالک ہو۔ اور جو ہندوؤں اور انگریزوں سے بیک وقت لڑائی لڑ سکتا ہو۔ رحمت خداوندی کی مسلمانوں پر خاص نگاہ کرم تھی۔ ان کو مطلوبہ قیادت قائداعظم محمد علی جناح کی ذات میں مل گئی جس نے مسلمانوں کی سیاست کی کشتی کو منجدھار سے نکال کر ساحل مراد تک پہنچا دیا۔

قائداعظم محمد علی جناح (ولادت ۱۸۷۶ء) بمبئی کے چوٹی کے ایک وکیل تھے بالکل آغاز ہی میں سر چمن لال سیتلواد نے (۱۹۰۰ء) ان کی صلاحیتوں کا اندازہ لگا لیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

"جناح اپنی ابتدائی زندگی میں آزاد اور عزم اور حوصلہ کے مالک تھے۔ وہ کبھی کسی جج کو یا فریق مخالف کے وکیل کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔"

وہ جمہوری اقدار کے قدردان اور غیر جمہوری طریقوں کے سخت مخالف تھے۔ اہل بمبئی نے ان کی سیاسی خدمات کے اعتراف میں بمبئی میں ایک ہال ان کے نام کے ساتھ معنون کیا تھا۔

"جناح پیوپلز میموریل ہال"

مولانا سید سلیمان ندوی نے بہت پہلے مسٹر محمد علی جناح کی قائدانہ صلاحیتوں کا اندازہ لگا لیا تھا۔ مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ بمبئی ۱۹۱۵ء بصدارت بیرسٹر مظہر الحق میں انھوں نے بھی شرکت کی تھی۔ وہاں انھوں نے محمد علی جناح کی سیاسی بصیرت کو بھانپ لیا تھا اپنے تاثرات کا انھوں نے اشعار میں اظہار کیا تھا۔

علت دیریں سے گو اصلی قویٰ بے کار ہیں
گوش شنوا ہے نہ ہم میں دیدۂ بینا رہا
پر مریض قوم کے جینے کی ہے کچھ کچھ امید
ڈاکٹر اس کا اگر مسٹر علی جناح رہا

وہ ہندو مسلم اتحاد کے زبردست حامی اور انتھک داعی تھے۔ ان کی کوششوں سے پہلی اور آخری مرتبہ ہندو مسلم اتفاق ــــ میثاق لکھنؤ ۱۹۱۶ء ــــ ہوا تھا۔ ان کی انہی کوششوں کے پیش نظر بلبل ہند مسز سروجنی نائیڈو نے جناح کو پیامبر امن Ambassador of peace کا خطاب دیا تھا۔ اور ان پر ایک کتاب لکھی تھی۔

مولوی مظہر الدین مدیر الامان دہلی نے ان کو قائد اعظم کا خطاب دیا تھا (۱۹۳۸ء) اس کے تین ماہ بعد مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس پٹنہ میں فیروز الدین لاہوری نے پہلی مرتبہ "قائد اعظم زندہ باد" کا نعرہ لگایا تھا۔

وہ قیادت کی بہترین صفات کے حامل تھے۔ نواب بہادر یار جنگ نے ان کے متعلق کہا تھا۔

"مجھے قائد اعظم کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ اور میں اپنے قلب وضمیر کے کامل اطمینان کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ان میں ایک ایسے سپہ سالار کی صفات موجود ہیں جو عقل و تدبر کی اس جنگ میں عساکر اسلامیہ کو لڑا سکتے ہیں"

وہ اعلیٰ درجہ کے زیرک اور معاملہ فہم سیاستدان تھے۔ علامہ شبیر احمد عثمانی کہتے ہیں۔

"مسٹر محمد علی جناح سیاسیات حاضرہ کے داؤ پیچ سے مسلمانوں میں سب سے زیادہ واقف ہیں۔ پھر وہ نہ کسی قیمت خریدے جا سکتے ہیں نہ کسی دباؤ کے سامنے سر جھکا سکتے ہیں"

یہ ایک امر واقعہ ہے کہ ہندو سیاستدانوں خاص طور پر گاندھی جی کے مہاتمائی انداز سیاست کے فریب سے اگر کوئی شخص بچا ہے تو وہ صرف قائد اعظم محمد علی جناح ہے ورنہ اچھوتوں، سکھوں اور دوسرے لوگوں کو انھوں نے اپنے دام سے نکلنے نہیں دیا۔ [1]

---

[1] قائد اعظم کے حریف پنڈت نہرو نے اپنی سوانح عمری میں جناح کے متعلق لکھا ہے:
"جناح قابل ہے۔ فولاد کی طرح مضبوط ہے۔ اقتدار کی کشش سے آزاد ہے"

# قائداعظم محمد علی جناح

محمد علی جناح ۱۹۰۷ء میں دادا بھائی نوروجی کے اثر سے کانگریس میں شریک ہو گئے تھے۔ کانگریس میں وہ ایک قومی رہنما تھے اور ہندو مسلمان اتحاد کے زبردست داعی تھے۔ ۱۹۱۳ء میں وہ مسلم لیگ میں شامل ہو گئے تھے۔ مگر ان کی سرگرمیوں کا میدان پھر بھی ہندو مسلم اتحاد تھا۔ اس زمانہ میں ایک شخص دو دو جماعتوں کا رکن بن سکتا تھا۔ ۱۹۲۴ء تک وہ بدستور قوم پرست تھے اور ہندو مسلم اتحاد کے داعی تھے۔ مگر خلافت کے بعد جو فسادات ملک میں ہوئے خاص طور پر اہانت رسولؐ کی جو مہم چلائی گئی اس سے وہ دل برداشتہ ہو گئے۔ ۱۹۲۶ء میں وہ کہتے ہیں۔

"اس حقیقت سے بچنا ممکن نہیں کہ فرقہ واریت اس ملک میں موجود ہے۔ محض جذبات اور امتداد زمانہ سے یہ رفع نہیں ہو سکتی۔ صرف مخلوط انتخاب سے قومیت پیدا نہیں ہو سکتی۔"

نہرو رپورٹ ہندو مسلمان تعلقات کے خراب کرنے میں ایک موثر کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے بعد تلخی بڑھتی چلی گئی۔ آل پارٹیز کانفرنس کلکتہ۔ دسمبر ۱۹۲۸ء میں قائداعظم نے شرکت کی۔ رپورٹ کی اصلاح کے لیے قائداعظم نے اپنے چودہ نکات پیش کیے۔ جن کو انتہا پسند ہندوؤں نے رد کر دیا۔ مزید برآں قائداعظم پر طعن تشنیع سے حملے کیے گئے۔ یہ وہ موقع تھا جب ان کا دل ہندوؤں کی طرف سے بیزار ہو گیا۔ دوسرے دن جب وہ واپس ہوئے تو جمشید جی نوشیروان جی ان کو چھوڑنے کے لیے اسٹیشن پر آئے تھے۔ ان کا بیان ہے کہ قائداعظم نے میرا ہاتھ پکڑا اور کہا اب جدائی کا آغاز ہے۔ یہ کہہ کر ان کی آنکھیں پرنم ہو گئیں[1]۔ تیسری گول میز کانفرنس منعقدہ لندن (۷ رنومبر تا

---

[1] گورنمنٹ نیشنل کالج کراچی کے رسالے علم و آگہی کا خصوصی نمبر قائداعظم محمد علی جناح ص ۱۸۰۔

۲۴؍دسمبر ۱۹۳۲ء) میں جناح نے شرکت نہیں کی۔ اگرچہ وہ اس زمانہ میں لندن ہی میں مقیم تھے۔ انھوں نے فرمایا۔

"عین خطرے کے سامنے، ہندو جذبات، ہندو ذہن اور ہندو رویے نے مجھے اتحاد سے بالکل مایوس کر دیا ہے۔"

مایوسی میں جو کسر رہ گئی تھی وہ کانگریسی وزارتوں کے طرز عمل نے پوری کر دی۔ اس دور میں مسلم لیگ کا اجلاس لکھنؤ میں ۱۵ تا ۱۸؍اکتوبر ۱۹۳۷ء میں منعقد ہوا۔ جس میں قائد اعظم نے فرمایا۔

"کانگریس کی موجودہ قیادت نے اور بالخصوص گزشتہ دس سال کے اندر خالص ہندو پالیسی اختیار کر کے مسلمانوں کو دور سے دور تر کر دیا ہے۔ اور جس وقت سے اس نے ان چھ صوبوں میں جہاں ہندوؤں کی اکثریت ہے، حکومتیں قائم کیں ہیں۔ اپنے قول و فعل اور پروگرام سے یہ ظاہر کر دیا کہ مسلمان اس سے کسی انصاف اور خوش معاملگی کی توقع نہیں کر سکتے۔"

مولانا شوکت علی کی وفات (۱۹۳۸ء) پر انھوں نے کہا۔

"میں قائل ہو گیا ہوں اور میرا خیال ہے کہ آپ بھی قائل ہو گئے ہیں کہ کانگریس کی قیادت عالیہ اس کا تہیہ کیے ہوئے ہے۔ اور بالکل تہیہ کیے ہوتے ہے۔ کہ اس ملک کے تمام دوسرے فرقوں اور کلچروں کو مسل ڈالے۔ اور ہندو راج قائم کر دے۔ گفتگو سوراج کی کرتی ہے اور چاہتی ہے ہندو راج۔ وہ گفتگو کرتی ہے قومی گورنمنٹ کی اور چاہتی ہے ہندو گورنمنٹ۔"

## مسلم لیگ کی تنظیم نو

۱۹۲۹ء سے ۱۹۳۴ء کا عرصہ مسلمانان ہند کی سیاست کا تاریک دور ہے مولانا محمد علی

کا انتقال ہو چکا تھا۔ محمد علی جناح لندن جاکر مقیم ہو گئے تھے۔ ادھر کانگریس کے انداز جارحانہ ہو رہے تھے۔ ۱۹۳۰ء میں مُسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کی صدارت علّامہ اقبال نے کی تھی اور ۱۹۳۱ء میں سر ظفر اللہ خاں نے اور ۱۹۳۲ء میں عبدالعزیز ایڈووکیٹ پشاور نے کی تھی۔ موخر الذکر دونوں ملک گیر شہرت کے حامل نہیں تھے اس کے بعد لیگ میں پھوٹ پڑ گئی۔ لیگ دو دھڑوں میں تقسیم ہو گئی۔ ان حالات میں علّامہ اقبال نے محمد علی جناح کو ہندوستان آنے پر مجبور کیا۔ لیاقت علی خاں لندن گئے اور وہ ان کو لے کر واپس آئے۔ ۱۹۳۴ء میں۔

۴ مارچ ۱۹۳۴ء کو انھوں نے دہلی میں مُسلم لیگ کا اجلاس طلب کیا اور دونوں گروہوں کو متحد کیا۔ وہ مُسلم لیگ کے صدر بن گئے اور پھر مسلسل تیرہ سال تک وہی مسلم لیگ کے صدر منتخب ہوتے رہے۔ قائد اعظم کی رہنمائی میں مسلم لیگ نے ایک عوامی جماعت کی حیثیت اختیار کی۔ اب تک اس کی سیاست کاری ڈرائنگ روم تک محدود تھی۔

۱۹۰۸ء میں مسلم لیگ میں ممبری کی فیس یک صد پچاس روپیہ سالانہ تھی۔ ۱۹۳۱ء میں اس کا دروازہ عوام پر کھول دیا گیا۔ اور ممبری کی فیس یک صد روپیہ مقرر کی گئی۔ اس کے بعد یہ عوامی جماعت بن گئی۔ ۱۹۳۶ء میں پھر ترمیم کی گئی اور ممبری کی فیس دو آنے سالانہ مقرر کی گئی۔ اب صحیح معنوں میں یہ عوامی جماعت بنی۔ ۱۹۳۱ء میں مُسلم لیگ کے دستور میں بھی بنیادی تبدیلیاں کی گئیں۔ مُسلم لیگ کا مقصد یہ مقرر کیا گیا۔

"برِ صغیر کے لیے مکمل ذمہ دار حکومت
کا حصول پُر امن اور قانونی ذرائع کے ساتھ اور ساتھ میں مسلمانوں کے لیے مناسب
اور مؤثر تحفظات کی فراہمی"

دستور میں یہی دفعات موجود تھیں۔ اگرچہ مُسلم لیگ کی قیادت تحفظات کے مسئلہ پر مایوس ہو چکی تھی۔ ان تبدیلیوں نے مُسلم لیگ کو عوام کے قریب تر کر دیا تھا۔ مگر حق بات یہ ہے کہ کانگریسی وزارتوں کے دور میں مُسلمانوں کو جو مظالم سہنے پڑے انھوں نے مُسلمانوں کو خواہ عوام ہوں یا خواص سب کو

شدید احساس عدم تحفظ میں مبتلا کر دیا اس احساس نے قومی وحدت اور سیاسی تنظیم کی اہمیت کا شعور عوام میں بیدار کر دیا۔ بتدریج مسلمان عوام مسلم لیگ میں شامل ہوتے چلے گئے۔ اور قائد اعظم محمد علی جناح پر ان کا اعتماد بڑھتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ وہ قوم کے واحد محبوب اور معتمد علیہ رہنما بن گئے۔

## نظریہ پاکستان کے علمبردار

یہ بات سب کو معلوم ہے کہ قائدِ اعظم محمد علی جناح اپنی سیاسی زندگی میں طویل عرصہ تک ہندو مسلم اتحاد کے داعی رہے ہیں۔ ۱۹۲۸ء سے ان کے اندر مایوسی پیدا ہونی شروع ہوئی۔ کانگریسی وزارتوں کے طرزِ عمل سے ۱۹۳۸ء تک مایوسی پختہ ہوگئی اور مفاہمت کی کوئی اُمید باقی نہ رہی۔ پھر بھی وہ تقسیم ملک کے قائل نہیں تھے۔ ان کو پاکستان کا قائل اور داعی بنانے میں بعض لوگوں نے پس پردہ رہ کر سخت کوشش کی ہے۔ تب اُنھیں کامیابی حاصل ہوئی۔ قومی حکومت کے زمانہ میں جلاوطن رہنما ہندوستان آئے۔ ۳۲ سال کی جلاوطنی کے بعد خیری برادران بھی واپس دہلی آئے۔ جلاوطن رہنما جو یورپ میں رہتے تھے۔ ان میں خیری برادران پکے مسلم لیگی تھے انھوں نے ۱۹۱۷ء میں اُنھوں نے تقسیم ملک کا نظریہ پیش کیا تھا۔ انھوں نے دہلی سے ایک ہفت روزہ رسالہ Spirit of Islam جاری کیا۔ اس کے خاص موضوع اقلیتوں کے مسائل پاکستان کا قیام تھے وہ سوڈیٹن جرمنوں کی مثال دے کر قیام پاکستان کا جواز پیش کرتے تھے۔ ڈاکٹر عبدالجبار خیری اپنے ایک معتمد مرید کو یہ رسالہ دے کر قائد اعظم محمد علی جناح کی خدمت میں بمبئی بھیجتے تھے۔ وہ وہاں اس وقت تک قیام کرتا تھا کہ قائد اعظم رسالہ پڑھ لیں۔ واپس آکر وہ ڈاکٹر صاحب کو پڑھنے کی اطلاع دیتا تھا[1]۔ اس طرح بتدریج قائد اعظم نے

---

[1] راقم کالج کی تعلیم کے زمانہ (۱۹۴۰ء - ۱۹۴۴ء) میں ڈاکٹر عبدالجبار خیری کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا۔ یہ بیان میں نے ڈاکٹر صاحب سے سُنا ہے۔ میں نے اسپرٹ آف اسلام کے پرچے بھی دیکھے (۴)

انکار میں تبدیلی آئی۔ ڈاکٹر عبدالستار خیری مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی کے ممبر تھے۔ وہ قائداعظم سے بالمشافہ گفتگو کرتے رہتے تھے مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کا نعرہ سب سے پہلے ڈاکٹر عبدالستار خیری نے لگایا تھا۔ ان دونوں بھائیوں کی کوششوں سے بالآخر انھوں نے نظریہ پاکستان کو قبول کرلیا۔

## خارجی عوامل

### جنگ عظیم ثانی

بعض خارجی عوامل نے بھی حصول پاکستان میں امداد کی۔ ان میں سے ایک اہم عامل جنگ عظیم ثانی ہے (۱۹۳۹-۱۹۴۵ء) پاکستان کے راستہ میں انگریزوں کی ذہنی کیفیت حائل تھی۔ متحدہ ہندوستان درحقیقت انگریزوں کی تخلیق ہے۔ وہ اپنی تخلیق کی شکست وریخت برداشت نہیں کرسکتے تھے۔ لارڈ لنلتھگو وائسرائے ہندوستان کا قول تھا۔ ہندوستان کی وحدت بہرحال باقی رکھی جائے گی۔ لندن ٹائمز نے لکھا تھا: "ہندوستان ایک فطری وحدت ہے۔ آپ جغرافیہ کو تبدیل نہیں کرسکتے" (۱۹ فروری ۱۹۴۴ء) انگریزی قوم اور انگریزی حکومت کے رویہ کو ہموار کرنے میں جنگ نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ ہندوستان کی آزادی کے مسئلہ کو آگے بڑھانے میں جنگ عظیم ثانی کا بہت اہم کردار ہے۔

---

(ص)

تھے اس زمانہ میں وہ بند ہوچکا تھا۔ دیکھیے

(راقم کا مضمون خیری برادران۔ روزنامہ جسارت۔ ۲۴، ۲۵، ۲۶ اگست ۱۹۸۳ء)

سندھ صوبائی مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ کراچی (۸، ۹، ۱۰ اکتوبر ۱۹۳۸ء) میں قائداعظم نے اپنے صدارتی خطبہ میں سوڈیٹن Sudetan جرمنوں کی مثال دی ہے جو چیکوسلوواکیہ سے آزادی حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کررہے تھے۔ یہ خیری برادران کا اثر تھا۔

۱۔ ۳ ستمبر ۱۹۳۹ء کو جنگ عظیم شروع ہو گئی۔ ہندوستان کی شمولیت کا اعلان تنہا وائسرائے نے کر دیا۔ صوبوں میں قائم کانگریسی وزارتوں سے کوئی مشورہ نہیں کیا۔ اس پر ناراض ہو کر کانگریسی وزارتوں نے استعفیٰ دے دیا۔ اس کے بعد کانگریس اور مُسلم لیگ کے ساتھ وائسرائے نے جتنے مذاکرات کیے ان میں مسلم لیگ کو کانگریس کا برابر کا درجہ دیا۔ اس سے مُسلم لیگ کا وقار بلند ہو گیا۔

۲۔ کانگریس نے تو تعاون کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ مُسلم لیگ نے مشروط تعاون پیش کیا۔ مزید براں ہندوستان کی فوجوں کا غالب حصّہ مُسلمانوں پر مشتمل تھا۔ اس وجہ سے بھی حکومت کے یہاں مُسلم لیگ کی آواز میں وزن بڑھ گیا۔

۳۔ جب حکومت برطانیہ سخت مشکلات میں پھنسی ہوئی تھی۔ جاپانی فوجیں آسام تک پہنچ گئی تھیں (۱۹۴۲ء) اس وقت موقع سے فائدہ اُٹھانے کے لیے کانگریس نے یکطرفہ "ہندوستان چھوڑ دو" مہم شروع کر دی۔ یہ سول نافرمانی کی تحریک تھی بلکہ بغاوت کی سی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ ظاہر ہے ان حالات میں حکومت کے نزدیک کانگریس کا وہ سابقہ وقار نہیں رہا۔

۴۔ برطانیہ نے جنگ جیت تو لی۔ مگر جنگ نے اس کو کھوکھلا کر دیا۔ اب وہ اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ ہندوستان کے مالی اخراجات برداشت کرے۔ بلکہ ہندوستان تک پہنچنے کے راستہ کی حفاظت کر سکے۔ جبرالٹر سے عدن تک۔ اس لیے وہ اب اپنی ذمّہ داریاں کم کرنا چاہتا تھا۔ یہ اس صُورت میں ممکن تھا کہ ہندوستان کو آزادی دے دے۔

۵۔ جنگ کے اتحادی بھی ہندوستان کو آزاد کرنے کے لیے زور ڈال رہے تھے۔ برطانیہ کی پوزیشن اقوام عالم میں کمزور ہو رہی تھی۔

۶۔ ہندوستانی فوج میں بغاوت داخل ہو گئی تھی۔ حالانکہ انگریزی حکومت کا آخری سہارا فوج تھا۔ انڈین نیشنل آرمی نے جاپانی فوج کا ساتھ دیا۔ بحریہ کے جوانوں نے بھی بغاوت کر دی۔ اس

کے بعد انگریز کو کامل یقین ہوگیا کہ اب ہندوستان کو سنبھالے رکھنا ممکن نہیں رہا۔ اس لیے وہ اس کو آزاد کرنے پر تیار ہوگیا۔

۷۔ اس سارے عرصہ میں مسلم لیگ نے اور قائداعظم نے بے لچک موقف اختیار کیا۔ وہ پاکستان کے مطالبہ سے کم تر کسی چیز پر راضی ہونے کے لیے تیار نہیں تھے اس لیے برطانوی حکومت کو ان کے سامنے جھکنا پڑا۔

## حق خود ارادیت

اب تک کسی مملکت کا کوئی حصہ اگر جدا ہوتا تھا تو اس کو بغاوت سمجھا جاتا تھا۔ علیحدگی کا کوئی معروف راستہ موجود نہیں تھا۔ عہدنامہ ورسائی ۱۹۲۳ء نے پہلی مرتبہ یہ حق تسلیم کیا کہ ہر قوم کو جداگانہ وطن کا حق حاصل ہے۔

اقلیتوں کی دو قسمیں قرار دی گئی تھیں۔ ایک وہ جو مستقل قوم کی حیثیت رکھتی ہیں۔ دوسری وہ قوم کے اندر ایک جماعت کی حیثیت رکھتی ہے۔ اول الذکر کے لیے حق آزادی اور حق خود مختاری تسلیم کیا گیا اور مؤخر الذکر کو حق دیا گیا کہ اس کے مذہب زبان اور تہذیب کے تحفظ کی مکمل ضمانت دی جائے۔

ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سیکرٹری پورن چند جوشی نے بھی اس نظریہ کی تائید کی تھی۔

دوسری جنگ عظیم کے موقع پر چرچل اور روز ویلٹ نے عالمی آزادی برقرار رکھنے کے لیے اٹلانٹک چارٹر جاری کیا تھا۔ جس میں تمام اقوام عالم کے حق خود ارادیت کی بھرپور حمایت کی گئی تھی۔ نیز جن اقوام کا حق آزادی غصب کر لیا گیا تھا۔ ان کو آزادی واپس کرنے کی بھی حمایت کی گئی تھی۔

بین الاقوامی قانون کی یہ وہ بنیاد تھی جس کی بنا پر مسلمانان ہند کا مطالبہ جداگانہ وطن بالکل درست تھا۔ بین الاقوامی قانون مسلمانوں کی تائید کرتا ہے۔

## ہندو قوم کا رویّہ

ہندو قوم کا جارحانہ رویہ بھی ایک اہم عامل ہے جس نے پاکستان کی تحریک کو فروغ دینے میں کافی حصہ لیا ہے۔ ہندو قوم کی تنگ نظری سے تو مسلمانوں کو اوّل روز سے سابقہ رہا۔ مبنی اوّل روز سے مسلمانوں کو گندہ اور ملیچھ کہتے رہے۔ مسلمانوں نے اپنے دور اقتدار میں ان کی تنگ نظری کو نظر انداز کیا۔ کبھی ان سے انتقامی کارروائی نہیں کی۔ حکومت میں اور دفتروں میں انکو آگے بڑھایا۔ اعلیٰ مناصب پر پہنچایا۔

مگر جدید تعلیم پاکر انھوں نے جارحانہ انداز اختیار کر لیا۔ انھوں نے ہزار سال سے آباد مسلمانوں کو ہندوستان میں بدیسی قرار دیا۔ اور ان کے لیے دو ہی راستے بتائے۔ یا تو وہ واپس ہندو بن جائیں۔ یا پھر ملک سے نقل مکانی کر جائیں۔

سیاست میں داخل ہو کر ان کی تمام تر کوشش یہ رہی کہ عددی اکثریت کی بنیاد پر انگریز کو رخصت کرنے کے بعد ہندوستان پر ہندو حکومت قائم کی جائے۔ خالص ہندو راج قائم کیا جائے۔ مسلمان اقلیت ان کے سامنے دست نگر ہو مسلمانوں کا دین، تہذیب جان و مال سب ان کے رحم و کرم پر ہو۔

میثاق لکھنؤ۔ اتحاد کی بنیاد۔ کی انھوں نے دھجیاں بکھیر دیں۔ نہرو رپورٹ نے مسلمان قومیت کا انکار کر دیا۔ جداگانہ انتخابات اور تحفظات کا انکار کر دیا۔ تعلیم، ملازمت، سیاست حکومت سب میں مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ کر دیا۔ ہندوؤں کے اس رویئے نے مسلمانوں کو بیدار کیا سرگرم عمل بنایا۔ جب اس کے وجود پر حملہ ہو تو حیوان بھی دفاع کرتا ہے۔ اس لیے مسلمان بھی اپنے وجود مادی اور اپنے وجود معنوی کے تحفظ کے لیے کوشاں ہو گئے۔ انھوں نے پاکستان بنایا جہاں ان کا وجود مادی بھی محفوظ رہے اور ان کا وجود معنوی بھی محفوظ رہے وجود معنوی اسلامی نظریہ حیات اور اسلامی حکومت ہے۔ اسی لیے مسلمانوں نے نظریاتی ریاست پاکستان کا مطالبہ کیا۔

✱✱✱✱

## تیرھواں باب

# قیامِ پاکستان

(۱۹۳۷ء ـــــ ۱۹۴۰ء)

کانگریسی وزارتوں کے زمانہ میں مُسلمانوں کا دورِ ابتلا، مُسلمانوں کی سیاسی فکر کی تشکیل او… تعیین منزلِ مقصود کے اعتبار سے بہت اہم ہے۔

اس وقت تک مسلم لیگ کی توقعات ہندو کانگریس سے ختم نہیں ہوئی تھیں وہ ہندو… جیسے… کے اندر مُسلمانوں کے لیے مقام تلاش کر رہی تھی اور پھر ان کے گرد تحفظات کا حصار کھینچ دینا چاہتی تھی۔ مگر جمہوری ملک میں عددی اکثریت کے سامنے کوئی حصار نہیں ٹھہر سکتا۔ کانگریسی وزارتوں نے ان کی آنکھیں کھول دیں۔ اب مُسلمانوں نے خود اعتمادی کے … انگریز اور ہندو کے علی الرغم اپنا راستہ اور اپنی منزل خود متعین کی۔

سندھ صوبائی مُسلم لیگ کی کانفرنس ۷، ۸ اکتوبر ۱۹۳۸ء کو کراچی میں منعقد ہوئی۔ اس کی صدارت قائدِ اعظم نے کی۔ اس میں ایک قرارداد منظور کی گئی۔

"یہ کانفرنس آل انڈیا مُسلم لیگ سے سفارش کرتی ہے کہ دستور کی ایسی اسکیم مرتب کی جائے جس کے تحت مُسلمان مکمل آزادی حاصل کر سکیں۔"

یہ قرارداد جدید حالات میں نئے اندازِ فکر کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ ڈیڑھ سال مزید غور و فکر کرنے کے بعد آل انڈیا مسلم لیگ نے مسلمانانِ ہند کے لیے پاکستان کا نصب العین مقرر کیا۔

## قرارداد لاہور (قرارداد پاکستان)

۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور کے تاریخی شہر میں آل انڈیا مسلم لیگ کا ستائیسواں سالانہ اجلاس منعقد ہوا۔ وہاں وہ تاریخی قرارداد لاہور منظور ہوئی جس کو بعد میں قرارداد پاکستان کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس قرارداد میں مسلم لیگ نے مسلمانان ہندوستان کا سیاسی نصب العین آزاد خود مختار ریاست کا قیام قرار دیا۔ قرارداد کے الفاظ یہ تھے۔

"آل انڈیا مسلم لیگ کا یہ اجلاس تجویز کرتا ہے کہ جب تک دستوری منصوبے میں درج ذیل بنیادی اصول شامل نہ کیے جائیں اور اس پر ملک میں عمل درآمد نہیں کیا جائے، اس وقت تک وہ مسلمانوں کے لیے قابل قبول نہ ہوگا۔

جغرافیائی اعتبار سے متصل اور ملحق یونٹوں پر مشتمل علاقوں کی حد بندی کی جائے۔ اور ضروری علاقائی رد و بدل کیا جائے۔

یہ کہ ہندوستان کے شمال مغربی اور مشرقی علاقوں کی طرح جن علاقوں میں تعداد کے لحاظ سے مسلمان اکثریت میں ہیں، انھیں "خود مختار ریاستیں" قرار دیا جائے۔ جس میں ملحق یونٹ خود مختار اور آزاد ہوں گے۔ یہ کہ ان یونٹوں کی اقلیتوں کے مذہبی، ثقافتی، اقتصادی، سیاسی، انتظامی اور دیگر حقوق اور مفادات کے تحفظ کے لیے ان کے صلاح و مشورے سے دستور میں مناسب، مؤثر اور واضح انتظامات رکھے جائیں۔ اور ہندوستان کے جن علاقوں میں مسلمان اقلیت میں ہیں۔ وہاں ان کے اور دیگر اقلیتوں کے صلاح مشورے سے انکے مذہبی، ثقافتی، اقتصادی، سیاسی اور دیگر حقوق و مفادات کے تحفظ کی ضمانت دی جائے۔"

اس قرارداد کو فضل الحق وزیراعلیٰ بنگال نے پیش کیا تھا۔ اور تمام صوبوں کے رہنماؤں نے اس کی تائید کی تھی۔

قرارداد منظور ہونے کے بعد قائد اعظم نے اپنے سیکرٹری مطلوب الحسن سید سے کہا۔
آج اگر اقبال زندہ ہوتے تو وہ خوش ہوتے۔ ہم نے ان کی خواہش پوری کر دی۔

## قرارداد لاہور کی مخالفت

قرارداد لاہور پاس ہو جانے کے بعد سارے ہندوستان میں ایک سیاسی تہلکہ مچ گیا۔ ہر شخص اس کی مخالفت کرنے لگا اور اس کے خلاف بیان دینے لگا۔ ہندوؤں اور کانگریس کی مخالفت تو قابل فہم ہے۔ وہ تو مسلمانوں کو زیردست رکھنا چاہتے تھے۔ مگر افسوس تو مسلمان رہنماؤں اور مسلمان جماعتوں پر ہے جو اس کی مخالفت پر کمربستہ ہو گئیں۔ کانگریسی مسلمان جمعیت العلماء[1] ہند، مومن کانفرنس، خاکسار، خدائی خدمت[2] گار وغیرہ سب متفق ہو کر اس قرارداد کی مخالفت کرنے لگے۔

ہندوؤں نے اس قرارداد کے خلاف شدید ردعمل ظاہر کیا گاندھی جی نے تبصرہ کیا۔

"دو قومی نظریہ ایک جھوٹ ہے۔ چونکہ میں اہنسا پر یقین رکھتا ہوں۔ اس لیے تشدد کے بل پر میں مجوزہ تقسیم کو نہیں روک سکتا۔ لیکن میں اس چیر پھاڑ میں

---

[1] فارسل معنا بنی اسرائیل (اعراف: ۱۰۵) کے تحت مولانا عبدالماجد دریا بادی لکھتے ہیں۔ "بنو اسرائیل ایک موحد قوم تھی اور اس وقت ایک مشرک تاجدار کے ظلم و ستم کا تختہ مشق بنی ہوئی تھی۔ اس لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا پہلا مطالبہ قدرۃً یہی ہے کہ ان موحدوں کو اس مشرکانہ جاہل فضا سے دور اور الگ سے جا کر ایک خطہ میں آباد کر دوں۔

آج (۱۳۶۵ھ/۱۹۴۷ء) ہندوستان میں جو تحریک ایک مستقل اور جداگانہ اسلامی آبادکاری کی پاکستان کے نام سے چل ہوئی ہے، اس تحریک کو خلاف اسلام کہنے والے علماء براہِ کرم اس آیت پر خلوص ذہن کے ساتھ غور کریں۔ تفسیر ماجدی۔ ص ۳۴۹

[2] عبدالولی خان کے والد خان عبدالغفار خان نے یہ جماعت قائم کی تھی۔

فریق نہیں بنوں گا۔"[1]

راجہ گوپال اچاریہ نے کہا۔

"جناح کا یہ مطالبہ اس طرح کا ہے جیسے دو بھائیوں میں ایک گائے کی ملکیت پر جھگڑا ہو۔ اور وہ اپنی اس گائے کو دو ٹکڑے کر کے بانٹ لیں۔"

انگریز بھی اس سے خوش نہیں تھے اپنے پیدا کردہ ہندوستان کی جغرافیائی وحدت کو وہ ٹکڑے ٹکڑے ہوتے دیکھنا پسند نہیں کرتے تھے۔

## کانگریس کی پوزیشن مجروح

یہ بات بیان کی جا چکی ہے کہ کانگریس جنگ میں تعاون کرنے کے خلاف تھی۔ وائسرائے کے یک طرفہ اعلان پر کانگریسی وزارتوں نے استعفٰے دے دیے تھے۔

دستور کے تقاضوں کے مطابق صوبائی وزارتیں بن جانے کے بعد مرکزی حکومت (فیڈریشن) کی تشکیل باقی تھی۔ موجودہ حالات میں ۱۱ ستمبر ۱۹۳۹ء کو وائسرائے نے فیڈریشن کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ اس اعلان پر جو عناصر کانگریسی وزارتوں سے خوش نہیں تھے انھوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ تمام اقلیتیں اور والیان ریاست وغیرہ مسلم لیگ نے اس موقع پر حکومت سے مطالبہ کیا کہ فیڈریشن کا تصور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ترک کر دیا جائے۔ اور کوئی دوسرا دستوری ڈھانچہ اس وقت تک نافذ نہ کیا جائے جب تک مسلمانوں سے اس کی منظوری حاصل نہ کر لی جائے۔

ہندوستان کی اقلیتوں اور بعض عناصر نے کانگریس کا دعویٰ "واحد نمائندہ جماعت" ماننے سے انکار کر دیا۔ جن میں بعض اہم جماعتوں کے رہنما شامل تھے۔ ساورکر (مہاسبھا) ڈاکٹر امبیدکار (اچھوت) مسٹر کشن لال ستیل واد (لبرل پارٹی) کا وس جی جہانگیر (پارسی)۔ ان تمام رہنماؤں نے

---

[1] اخبار ہریجن۔ از گاندھی۔ ۱۶ اپریل ۱۹۴۰ء

ایک یاد داشت وائسرائے کو بھیجی کہ کانگریس ہماری نمائندہ جماعت نہیں ہے۔ اس کے بعد ۱۰ اپریل ۱۹۳۹ء کو انگریزی حکومت نے کانگریس کی وزارتوں کے خلاف قرطاس ابیض شائع کر دیا۔ اور تمام حقائق پبلک کے سامنے پیش کر دیے۔ اس طرح مسلم لیگ کی پیر پور رپورٹ کی حکومت نے تائید کر دی۔ کہاں تو وہ پوزیشن کہ کانگریس چھ صوبوں میں حکمران تھی کہاں یہ صورتِ حالات کہ ملک کے مختلف عناصر اس کو نمائندہ تسلیم کرنے سے انکار کر رہے ہیں۔

## انگریزی رویّہ میں لچک

۸ اگست ۱۹۴۰ء کو وائسرائے نے ایک اعلان کیا جس کے تحت

- ــــ وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل میں مزید توسیع کی گئی۔ اور ہندوستانیوں کو اس میں شامل کیا گیا۔
- ــــ یہ اعلان کہ اقلیتوں کو اکثریت کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑا جائے گا مگر اس کی عبارت بہت پرپیچ تھی مثلاً اقلیت کا لفظ استعمال کرنے کے بجائے ہندوستانی قومی زندگی کے طاقتور عناصر کے الفاظ استعمال کیے گئے تھے۔
- ــــ آئندہ دستوری ڈھانچہ خود ہندوستانی بنائیں گے۔

## سول نافرمانی کی تحریک

جب جاپانی فوجیں ہندوستان میں آسام تک گھس آئیں۔ تو کانگریس نے عدم تعاون سے بڑھ کر سول نافرمانی کی تحریک شروع کر دی۔ گاندھی جی نے اس کو "ہندوستان چھوڑ دو" کا نام دیا۔ یوپی اور بہار کے بعض اضلاع میں تو اس نے بغاوت کی شکل اختیار کر لی تھی۔ گاندھی جی نے پیغام بھیجا۔

"مخالفت کرو اور جان دے دو۔ اس

یہ بعد تشدد کے واقعات عام ہوگئے۔ ریلوے کی پٹریاں اکھاڑی گئیں۔ پوسٹ آفس جلائے گئے۔ پولیس پر حملہ کیا گیا۔[1]

کانگریس سمجھتی تھی کہ حکومت مرعوب ہو جائے گی۔ مگر اس نے ۹ر اگست ۱۹۴۲ء کو ساری ورکنگ کمیٹی کو اور گاندھی کو گرفتار کر لیا۔ چند ماہ کے بعد یہ تحریک خود بخود مر گئی۔ بقول مولانا ابوالکلام آزاد۔ اس سے حاصل کچھ نہیں ہوا۔

مسلم لیگ نے اپنے بیان میں کہا کہ کانگریس نے یہ تحریک اس لیے شروع کی ہے کہ حکومت پر دباؤ ڈالے تاکہ وہ یک طرفہ کانگریس کو اقتدار منتقل کر دے۔ اور مسلمانوں کو منتقل نہ کرے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ مسلمان اقلیت میں ہیں وہ ہم سے بات کریں نہ کہ حکومت سے۔ اس لیے درحقیقت یہ تحریک مسلمانوں کے خلاف تھی۔ قائد اعظم نے گاندھی کے نعرہ کے جواب میں نعرہ لگایا۔ [illegible] مسلمانوں نے اس کو ایک عوامی نعرہ کی شکل دے دی۔

بٹ کے رہے گا ہندوستان      بن کے رہے گا پاکستان

## کرپس کی تجاویز

یہ وہ زمانہ تھا جب برطانوی افواج یورپ میں اور بحر الکاہل میں دونوں جگہ شکستیں کھا رہی تھیں اس لیے برطانوی حکومت ہر قیمت پر ہندوستانی رہنماؤں کا تعاون حاصل کرنا چاہتی تھی۔

---

[1] واضح رہے یہ وہی گاندھی جی ہیں جو خلافت تحریک کے دوران ۵ فروری ۱۹۲۱ء کو چوری چورا میں مشتعل دیہاتیوں نے جب پولیس تھانہ پر حملہ کر دیا تھا۔ تو ان کی اہنسا اس تشدد کے واقعہ کو برداشت نہ کر سکی اور انہوں نے شباب پر آئی ہوئی خلافت تحریک کو ختم کر دیا تھا اور اب ۱۹۴۲ء میں وہ خود تشدد پر ابھار رہے ہیں۔ ان کے دیوتا گنیش مہاراج کی طرح مہاتما گاندھی کے بھی کئی چہرے ہیں اور کئی روپ ہیں۔

اس مقصد کے لیے برطانوی کابینہ نے ایک وزیر کرپس کو ہندوستان بھیجا۔ انھوں نے جائزہ لے کر ۱۹۴۲ء میں اپنی تجاویز پیش کیں۔

- جنگ کے خاتمہ پر ایک منتخب دستوریہ آزاد ہندوستان کا دستور بنائے نوآبادیاتی نظام کے تحت اقتدار ہندوستان کو منتقل کر دیا جائے گا۔
- اس نظام سے اگر کوئی صوبہ علیحدگی اختیار کرنا چاہے تو کر سکتا ہے۔
- یہ اسکیم یا پوری قبول کی جائے یا پوری رد کی جائے۔

میدان جنگ میں برطانیہ پے در پے شکستیں کھا رہا تھا۔ اس لیے گاندھی جی نے ان تجاویز کو رد کر دیا۔ اور کہا "یہ دیوالیہ بنک کے نام بعد کی تاریخ کا چیک ہے"۔ اس میں صوبوں کے لیے علیحدگی کی گنجائش رکھی گئی تھی اس لیے کانگریس نے اور مہاسبھا نے ان کو رد کر دیا۔

مسلم لیگ کے دو مطالبات ان تجاویز میں تسلیم کر لیے گئے تھے۔

۱۔ یہ تجاویز تھیں جو پارٹیوں کے سامنے منظوری کے لیے پیش کی گئی۔

۲۔ علیحدگی کا حق پہلی مرتبہ تسلیم کر لیا گیا۔ اگرچہ یہ حق بجائے مسلمانوں کو ملنے کے صوبوں کو ملا تھا۔

چونکہ ان تجاویز میں جداگانہ انتخاب ختم کر دیا گیا تھا۔ اس لیے مسلم لیگ نے بھی ان کو رد کر دیا۔ مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ مسلم لیگ کے مطالبات کو تسلیم کیا گیا تھا یہ اس کی بڑی کامیابی تھی۔ ان تجاویز کا ایک شاخسانہ یہ ہے کہ مشہور کانگریسی لیڈر مجلس عاملہ کے رکن راجہ گوپال اچاریہ نے صوبوں کی علیحدگی کا اصول قبول کر لیا۔ انھوں نے مدراس اسمبلی کے کانگریسی ممبروں سے ایک قرارداد بھی پاس کرائی جس میں علیحدگی کا اصول تسلیم کرنے کی سفارش کی گئی۔ مگر آل انڈیا کانگریس نے اس کو رد کر دیا۔ (۲۹ اپریل ۱۹۴۲ء الہ آباد) اس پر راجہ جی نے کانگریس سے ہی استعفیٰ دے دیا۔ علیحدگی کے مسئلہ پر کانگریس کے اندر اختلاف رائے ایک لحاظ سے مسلم لیگ کی کامیابی ہے۔

# گاندھی جناح گفت وشنید

راجہ گوپال اچاریہ نے قائداعظم سے مراسلت شروع کی۔ ۱۹ اپریل ۱۹۴۳ء کو انھوں نے تقسیم کا ایک فارمولا پیش کیا۔ وہ بھی پُرپیچ انداز میں تھا۔ شرط یہ تھی کہ اس کو یوں ہی قبول کر لیا جائے۔ ترمیم یا اضافہ کا کوئی حق نہیں ہے۔ حتیٰ کہ مسلم لیگ کونسل میں بھی پیش کرنے کی اجازت نہیں۔ اور پھر خود ہی اس کو پریس میں دے دیا۔ اور ان کے قول کے مطابق اس تجویز کو گاندھی جی کی بھی حمایت حاصل تھی۔ اس کی اہمیت صرف اس لیے ہے کہ ایک ہندو لیڈر نے تقسیم کا اصول تسلیم کر لیا۔ خواہ وہ کسی انداز میں ہو۔

اس کے بعد گاندھی جناح گفتگو شروع ہوئی۔ ۱۷ جولائی ۱۹۴۴ء تا ۲۶ دسمبر ۱۹۴۴ء گفتگو راجہ جی کے مذکورہ بالا فارمولے پر ہوئی۔ ساری گفتگو خط و کتابت کے ذریعہ ہوئی۔ بالآخر نتیجے پر پہنچے بغیر ختم ہوگئی۔ اس لیے کہ آخر میں گاندھی جی نے فرمایا "کل شب کی گفتگو نے بدمزہ کر دیا۔ گاندھی جی کی شخصیت اور ان کی شاطرانہ چالوں کے متعلق قائداعظم نے لکھا۔

"سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس (راجہ جی فارمولا) سے مسٹر گاندھی کا تعلق کس حیثیت سے سمجھا جائے۔ کیونکہ وہ تو کانگریس کے چار آنے والے ممبر تک نہیں ہیں۔ ان کی حیثیتیں متعدد ہیں۔ ان کی ذاتی حیثیت، ان کی کانگریس کے ڈکٹیٹر کی حیثیت اور ان سب سے بلند و بالا ان کا مہاتمائی اور دیوتائی منصب جس میں وہ اپنی اندرونی آواز پر عمل کرتے ہیں۔ پھر وہ ستیہ گرہی بھی ہیں اور اس کے معانی و مقاصد کے واحد شارح بھی ہیں۔ وہ ہندو نہیں لیکن سناتنی ہیں۔ اور اپنے ایجاد کردہ ہندو مت کے پیرو ہیں۔ یہ پتہ لگانا بہت دشوار ہے کہ مسٹر گاندھی کس خاص موقع پر کس حیثیت کو کام میں لائیں گے۔ خط ۳۰ جولائی ۱۹۴۴ء ........

میرے خیال میں ان میں (گاندھی تجاویز۔ اور راجہ جی فارمولا) نہ تو قرارداد لاہور کا لب لباب ہے اور نہ اس کی رُوح۔ اس کے برعکس دونوں کی غایت یہ ہے کہ مسلم لیگ کے مطالبہ پاکستان کا اندر ہی اندر سے بیڑہ غرق کر دیا جائے۔"

(آخر خط ۔ ۲۶ر دسمبر ۱۹۴۴ء)

## شملہ کانفرنس

۱۹۴۵ء میں جنگ آخری مرحلہ میں داخل ہو گئی تھی۔ اتحادیوں ۔ برطانیہ کی جیت کے آثار بالکل نمایاں نظر آ رہے تھے۔ جنگ ختم ہو جانے کے بعد "جنگی صنعت" اور "جنگی معیشت" ختم ہونے والی تھی۔ ان سے متعلق لاکھوں افراد بے روزگار ہونے والے تھے جن کی بے چینی اور اضطراب سے کوئی بھی سیاسی جماعت فائدہ اُٹھا سکتی تھی۔ اور ملک میں شورش پیدا کر سکتی تھی۔ اس لیے برطانیہ اپنے وعدے پورے کرنا چاہتا تھا۔ ۱۴ر جون ۱۹۴۵ء لارڈ ویول وائسرائے ہندوستان نے ایک نیا منصوبہ پیش کیا۔

- موجودہ کونسل کی جگہ ایک نمائندہ کونسل حکومت کی ذمہ دار ہو۔ بجز جنگ تمام اختیارات اس کو حاصل ہوں۔
- اعلیٰ ذات کے ہندوؤں اور مسلمان نمائندوں کی تعداد مساوی ہو۔
- اگر صوبوں میں مجوزہ حکومتیں بن جائیں تو مرکز میں بھی مخلوط حکومت قائم کی جائے۔

منصوبہ پر گفتگو کرنے کے لیے ۲۵ر جون کو شملہ میں کانفرنس ہوئی جس میں تمام پارٹیوں کے نمائندے جمع تھے۔ اس مرتبہ کانگریس کی نمائندگی گاندھی نے نہیں کی بلکہ مولانا ابوالکلام آزاد نے کی۔ اور سر فضل حسین نے یونینسٹ پارٹی کی نمائندگی کی۔ سب سے زیادہ جھگڑا کونسل کی تشکیل پر ہوا۔ مولانا آزاد کا اصرار تھا کہ کانگریس سارے ہندوستان کی نمائندہ جماعت ہے۔

اس میں مسلمان بھی شامل ہیں۔ جب کہ قائداعظم مسلمانوں کی نمائندہ جماعت مسلم لیگ کو کہتے تھے۔ جناح کا مطالبہ تھا کہ مسلمان نمائندوں کے نام وائسرائے مسلم لیگ کے مشورے سے طے کرے۔ جب کہ وائسرائے چاہتے تھے کہ وہ خود آزادانہ طور پر جس کو چاہیں مقرر کردیں۔ ویول منصوبہ بھی ناکام ہوگیا۔ یہ بھی ہندوؤں اور انگریزوں کی ایک چال تھا بقول قائداعظم جب یہ منصوبہ ترک کردیا گیا تو قوم پرست مسلمانوں کا وقار خاک میں مل گیا۔ اس لیے کہ حکومت کے یہاں بات مسلم لیگ کی تسلیم کی گئی۔ ایک مرتبہ قائداعظم نے فرمایا تھا کہ جتنا نقصان مسلمانوں کو ان قوم پرست مسلمانوں سے پہنچا ہے جو کانگریس کے حاشیہ بردار تھے۔ اتنا نقصان خود ہندوؤں سے نہیں پہنچا۔

## عام انتخابات

شملہ کانفرنس کے آخر میں قائداعظم نے عام انتخابات کا مطالبہ کردیا۔ ان کی بات میں وزن محسوس کیا گیا کہ جن لوگوں نے نو سال قبل انتخاب جیتا تھا وہ اب بدلے ہوئے حالات میں قوم کی نمائندگی کا حق نہیں رکھتے ہیں اس لیے وائسرائے نے یہ مطالبہ منظور کرلیا۔ ۲۱ اگست ۱۹۴۵ء کو انتخاب کا اعلان کردیا۔ تمام پارٹیوں نے زور شور سے انتخابات کی تیاری شروع کردی۔

قائداعظم محمد علی جناح نے مسلم لیگ کا جو انتخابی منشور جاری کیا اس میں صرف تین نکتے تھے۔

۱۔ دو قومی نظریہ

۲۔ ہندوستان اور پاکستان کے لیے جدا جدا دستور ساز اسمبلیاں۔

۳۔ پاکستان کی تشکیل۔

اس کے برخلاف کانگریس نے ایک قوم اور ایک ملک کا پروپاگنڈا کیا۔ کانگریس کے رہنماؤں نے قائداعظم کی ذات کو طعن وتشنیع کا ہدف بنایا۔ اور ہر قسم کے مذموم خطابات سے نوازا۔

دوسری جانب اس نے مسلمانوں کے اندر مومن گروپ، مجلس احرار، شیعہ کانفرنس، جمعیۃ العلماء ہند، یونینسٹ پارٹی اور دوسرے قوم پرست مسلمانوں کو اُبھارا۔ ان سب کو مسلم لیگ کی مخالفت کے لیے تیار کیا۔ لیکن انتخاب سے قبل مسلمان عوام نے جگہ جگہ قائد اعظم کا شاندار استقبال کر کے اپنا اظہار خیال کر دیا۔ انھوں نے مسلم لیگ کو انتخابات کے لیے کھل کر چندہ دیا۔ ہزاروں لاکھوں کارکن نکل کھڑے ہوئے جنھوں نے مسلم لیگ کا پیغام گاؤں گاؤں اور قریہ قریہ پہنچا دیا۔ اس زمانہ میں مسلمانوں پر خلافت تحریک کے دور کی ہیجانی کیفیت طاری تھی۔ وہ تحریک پاکستان کے لیے بڑی سے بڑی قربانیاں دینے کے لیے تیار تھے۔ ہندوستان کے طول و عرض میں ایک عجیب فضا اور عجیب روچل پڑی تھی۔

دسمبر ۱۹۴۵ء میں قومی اسمبلی کے انتخابات ہوئے۔ اس میں مسلمانوں کے لیے ۳۰ نشستیں مخصوص تھیں۔ مسلم لیگ کے اُمیدواروں نے تیسوں نشستوں پر کامیابی حاصل کی۔ اس میں مسلم لیگ کو سو فیصد کامیابی حاصل ہوئی۔ قوم پرست، کانگریس کے حمایت یافتہ اُمیدوار ہر جگہ شکست کھا گئے۔ بعض کی تو ضمانتیں بھی ضبط ہو گئیں۔ نتائج ظاہر ہونے کے بعد ۱۱ جنوری ۱۹۴۶ء کو مسلم لیگ نے یوم فتح منایا۔ اس کے بعد قائد اعظم نے مطالبہ کیا کہ اب جنگ ختم ہو چکی ہے۔ اب عارضی حکومت قائم کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اب ہندوستان کو تقسیم کر دو۔ اس انتخاب نے مسلم لیگ کی اور قائد اعظم کی پوزیشن کو بے حد مستحکم کر دیا تھا۔ اندرون ملک اور بیرون ملک ان کا وقار بلند ہو گیا۔ اس کے بعد صوبائی انتخابات ہوئے۔ (فروری ۱۹۴۶ء) اس میں مسلم لیگ نے بحیثیت مجموعی ۴۹۲ مسلم نشستوں میں سے ۴۲۸ پر کامیابی حاصل کی[1]۔ صوبہ سرحد کے علاوہ سب جگہ کانگریسی اُمیدوار شکست کھا گئے۔ اقلیتی صوبوں میں مسلم لیگ نے پھر سو فیصد کامیابی حاصل کی۔ ان دونوں انتخابوں نے ثابت کر دیا کہ مسلمانوں کی نمائندہ جماعت مسلم لیگ ہے اور کانگریس کا دعویٰ کہ وہ پورے ملک کی نمائندہ جماعت ہے بے بنیاد ہے۔

---

[1] یعنی ۸۷ فی صد۔

## کابینہ مشن کا منصوبہ

جنگ کے خاتمہ کے بعد انگلستان میں لیبر پارٹی کی حکومت قائم ہوئی۔ اس نے ہندوستان کا مسئلہ حل کرنے کے لیے کابینہ کے تین ممبروں کو ہندوستان بھیجا کہ وہ وہاں مختلف لیڈروں سے مل کر کوئی قابلِ عمل فارمولا پیش کریں۔ لیبر حکومت کے تعلقات کانگریس پارٹی سے تھے۔ وزیراعظم انگلستان مسٹر اٹیلی نے آغاز ہی میں کانگریس کی جانب اپنے رجحان کا اظہار کر دیا تھا۔ اس نے ایک تقریر میں کہا "مگر کسی اقلیت کو اس بات کی اجازت نہیں دے سکتا کہ وہ اکثریت کی راہ ترقی میں حق استرداد Veto استعمال کرے۔ اور روڑے اٹکائے" قائداعظم نے وزیرِاعظم کو جواب دیتے ہوئے ایک بیان دیا۔ ۱۷ مارچ ۱۹۴۶ء۔ یہاں ویٹو استعمال کرنے یا اکثریت کی ترقی روکنے کا کوئی سوال نہیں ہے۔ یہ وہ مسئلہ ہے جس پر ایک مثال چسپاں ہوتی ہے۔

"مکڑی نے مکھی سے کہا کہ میرے محل میں آرام کریں۔ اب اگر مکھی انکار کرتی ہے تو کہا جاتا ہے کہ ویٹو استعمال کیا جا رہا ہے"۔[1]

لیبٹ ۲۴ مارچ کو لارڈ پیتھک لارنس، سر اسٹیفورڈ کرپس، اور اے وی الیگزانڈر دہلی پہنچے۔ آنے کے بعد لارنس نے اٹیلی کے بیان سے پیدا شدہ غلط فہمی کو دور کیا۔ اس نے کہا جہاں کانگریس زیادہ بڑی تعداد کی نمائندہ ہے۔ وہاں مسلم لیگ کو بھی یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ وہ محض اقلیت کی سیاسی پارٹی ہے۔ وہ عظیم مسلم جماعت کی ایسی نمائندہ جماعت ہے جو صاف اکثریت میں ہے۔ کرپس نے کہا وہ ہم کوئی طے شدہ منصوبہ لے کر نہیں آئے ہیں۔ بلکہ یہاں ہی گفتگو کے بعد وضع کریں گے۔ یہاں انھوں نے سرکاری حکام اور بڑی بڑی جماعتوں کے رہنماؤں سے ملاقاتیں کیں۔ انھوں نے ۴ اپریل کو قائداعظم سے ملاقات کی۔ اس میں قائداعظم نے دوقومی نظریہ کی تفصیل

---

[1] پاکستان ناگزیر تھا۔ سید حسن ریاض، ص ۳۸۴۔

سے سمجھایا۔

اس عرصہ میں مسلم لیگ نے ملک کے تمام مسلمان منتخب نمائندوں کو صوبائی ہوں یا مرکزی دہلی میں جمع کیا۔ اس مرکزی کنونشن نے ایک قرارداد منظور کی۔ اگر کوئی دستور مسلمانوں پر مسلط کیا گیا۔ یا مسلم لیگ کے مطالبہ کے خلاف مرکز میں عبوری حکومت بنانے کی کوشش کی گئی تو مسلمان عوام اپنے حقوق حاصل کرنے کے لیے سب کچھ کر گزریں گے۔

## منصوبہ

کابینہ مشن نے ۱۶ رمئی ۱۹۴۶ء کو ایک منصوبہ کا اعلان کیا جس کے اہم نکات یہ تھے۔

۱۔ ہندوستان ایک وفاقی حکومت ہو گا۔ دفاع، خارجہ اور مواصلات کے شعبے اس کے پاس ہوں گے۔ فرقہ وارانہ اختلافی مسائل میں پارلیمنٹ کی اکثریت کے علاوہ بڑے فرقوں کے نمائندوں کی اکثریت بھی لازمی ہو گی۔

۲۔ وفاقی کابینہ میں مسلم لیگ اور کانگریس کے نمائندے برابر ہوں گے۔

۳۔ مذہبی بنیادوں پر صوبوں کے تین گروپ ہوں گے۔

(ا) ہندو اکثریت کے صوبے۔ یوپی، سی پی، بہار، اڑیسہ، مدراس، بمبئی۔

(ب) مسلمان اکثریت کے صوبے۔ پنجاب، سرحد، سندھ، بلوچستان۔

(ج) مشترکہ آبادی کے صوبے۔ بنگال، آسام۔

۴۔ ہر گروپ اپنی مشترکہ حکومت قائم کر سکتا ہے۔

۵۔ دس سال کے بعد صوبے چاہیں تو اپنی حیثیت تبدیل کر سکتے ہیں۔

۶۔ ہر گروپ اپنا آئین خود وضع کرے گا۔

۷۔ ہر پارٹی اس کو مجموعی طور پر قبول کرے یا رد کرے۔ جو پارٹی رد کر دے گی اس کو عبوری حکومت میں نہیں شریک کیا جائے گا۔

## ردِ عمل

گاندھی جی نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ کوئی فیصلہ نہیں ہے۔ بلکہ ایک مشورہ ہے۔ دوسری بات یہ کہی کہ آئین ساز اسمبلی خود مختار ادارہ ہوگی وہ حسب منشا اس میں تبدیلیاں کر سکتی ہے۔ ان تعبیروں کے ساتھ یہ ایک اچھی اسکیم ہے۔ گاندھی کی اس تعبیر نے اسکیم کا حلیہ بگاڑ دیا۔ اس لیے لارنس اور کرپس دونوں نے گاندھی کی تعبیر کی تردید کی۔ اُنھوں نے کہا یہ اسکیم اپنے تمام اجزاء کے ساتھ ایک وحدت ہے۔ اور اسی صورت میں کامیاب ہو سکتی ہے۔ مگر کانگریس نے وفاقی حکومت کی تشکیل میں اصرار کر کے تبدیلی کرائی۔ اعلیٰ ذات ہندو (۵) مسلمان (۵) سکھ (۱) اچھوت (۱) پارسی (۱)۔ ان ترمیمات کے باوجود کانگریس پارٹی نے اس کو رد کر دیا (۲۶۔جون ۱۹۴۶ء) لیکن مسلم لیگ نے اس کو قبول کر لیا۔ منصوبہ کی آخری دفعہ کے مطابق اب تھا مسلم لیگ کو حکومت بنانے کا حق ملنا چاہیے تھا۔ لارڈ ویول وائسرائے ہند نے ایسا نہیں کیا۔ اگرچہ مسلم لیگ اور آزاد اخباروں نے وائسرائے پر وعدہ خلافی کا الزام لگایا۔ اس پر شدید تنقید کی۔ بددل ہو کر کابینہ کے ممبر واپس انگلستان چلے گئے۔ کانگریس کا رویہ عجیب تھا اس نے وفاق میں شرکت کرنے سے انکار کر دیا۔ البتہ دستور ساز اسمبلی میں شرکت کرنے پر آمادگی ظاہر کی "تاکہ ایک آزاد، متحد اور جمہوری ریاست ہندوستان کے دستور کی تشکیل کی جا سکے۔"

"کانگریس کیبنٹ مشن سے بہت پُر اُمید تھی۔ گاندھی جی نے سدھیر گھوش کے ذریعہ کر اس کو ہموار کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہ ساری کوششیں پس پردہ تھیں۔ اس لیے ان کو یقین تھا کہ تجاویز مُسلم لیگ کے خلاف ہوں گی۔ وہ اس کو رد کر دے گی اور کانگریس کو تنہا حکومت تشکیل دینے کا موقع مل جائے گا۔ اختیارات مل جانے کے بعد پھر وہ مسلم لیگ سے اچھی طرح نپٹ لے گی خواہ اس میں خانہ جنگی کی نوبت ہی کیوں نہ آ جائے۔" (پیارے لال

پرائیویٹ سیکرٹری گاندھی)۔ اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے چودھری محمد علی بجا طور پر لکھتے ہیں۔

> اہنسا کا علمبردار، جنگ میں برطانیہ کو ہٹلر کے سامنے ہتھیار نہ استعمال کرنے کا مشورہ دینے والا اب اس بات پر تل گیا ہے کہ مسلم لیگ سے براہِ راست نپٹ لیا جائے خواہ اس کا مطلب خانہ جنگی ہی کیوں نہ ہو۔[1]

## راست اقدام

اس مرتبہ کانگریس کے صدر پنڈت جواہرلال نہرو بن گئے۔ انھوں نے ۱۰ جولائی ۱۹۴۶ء کو اعلان کیا کہ کانگریس نے آئین ساز اسمبلی میں شرکت قبول کی ہے۔ مگر وہ معاہدوں کی پیروی سے بالکل آزاد ہے جو بھی صورت پیش ہوگی اس کا بروقت فیصلہ کیا جائے گا۔ نہرو کا یہ بیان معاہدوں کی صریح خلاف ورزی تھا۔ اس کے بعد مسلم لیگ کونسل کا اجلاس بمبئی میں ہوا جس میں ملک کی پوری صورت حالات کا جائزہ لیا گیا۔ کہ کانگریس معاہدوں کی خلاف ورزی کر رہی ہے اور کابینہ مشن کے ارکان غلوج نظر آتے ہیں۔ مسلم لیگ نے بھی منصوبہ کی اپنی منظوری کو منسوخ کر دیا۔[2] اور ایک دوسری قرارداد میں مسلم لیگ نے راست اقدام کا فیصلہ کیا۔ قائداعظم نے کہا: "یہ بہت اہم فیصلہ ہے۔ آج تک ہم نے قانونی اور آئینی ذرائع استعمال کیے ہیں۔ مگر اب جب کہ ایک فریق وعدہ خلافی کر رہا ہے اور دوسرا فریق من مانی تاویلات سے اس کی خوشنودی حاصل کر رہا ہے اس لیے ہمارے لیے اب کوئی چارہ کار نہیں رہا کہ ہم راست اقدام کریں۔ ساتھ ہی انھوں نے مسلمانوں سے اپیل کی کہ حکومت کے عطا کردہ تمام خطابات حکومت کو واپس کر دیں۔

---

۱؎ ظہور پاکستان۔ از چودھری محمد علی ص ۸۹۔

۲؎ [illegible]

۱۶ اگست ۱۹۴۶ء کو سارے ملک میں یوم راست اقدام منایا۔ غیر منصفانہ پالیسی برطانیہ کا برملا تذکرہ کیا۔ جلسے کیے اور جلوس نکالے۔ زوردار تقریریں کیں۔ اس موقع پر ہندوؤں نے کلکتہ میں مسلمانوں پر حملے کیے۔ اوران کو قتل کیا۔ اس کے متعلق مشرقی کمان کے انچارج کمانڈر فرانسس ٹکر Tucker نے اپنی یادداشت میں لکھا ہے۔

"یہ تو بے لگام خوں ریزی تھی........ صرف ایک رات کے اندر ہمیں انگریز بٹالین نے گلی کوچوں سے ساڑھے چار سو نعشیں ہٹائیں"۔[1]

لارڈ ویول خود کلکتہ گئے۔ وہاں انھوں نے وحشت و بربریت کے مناظر اپنی آنکھ سے دیکھے اور اس کے بعد انھیں یقین ہو گیا کہ کانگریس اور لیگ کے درمیان سمجھوتہ ممکن نہیں ہے۔

## کانگریسی وزارت

ساری وعدہ خلافیوں، من مانی تاویلات اور اسکیم مسترد کر دینے کے باوجود وائسرائے نے پنڈت نہرو کو حکومت بنانے کی دعوت دی۔ کانگریس نے تنہا وزارت تشکیل کی۔ دو چار قوم پرست مسلمانوں کو البتہ شامل کر لیا۔ مسلم لیگ کی نشستیں خالی چھوڑ دیں۔ لارڈ ویول نے کانگریس پر زور دیا کہ وہ مسلم لیگ سے مفاہمت کر لے۔ اس پر گاندھی اور نہرو ناراض ہو گئے اور انھوں نے براہ راست اٹیلی کو لکھا کہ ویول کے اعصاب پر کلکتہ کے فسادات کا اثر ہو گیا ہے۔ اس لیے کسی دوسرے شخص کو یہاں وائسرائے بنا کر بھیجا جائے۔ ۲۰ فروری ۱۹۴۷ء کو نیا وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن مقرر ہوا۔ کلکتہ کے فسادات پر حزب اختلاف کے لیڈر چرچل نے اٹیلی پر سخت تنقید کی۔ اٹیلی نے وائسرائے پر زور دیا کہ کسی بھی قیمت پر مسلم لیگ کو وزارت میں داخل کرو۔ ۲ ستمبر کو کانگریس نے وزارت کا حلف اٹھایا تھا اور مسلم لیگ نے اس دن یوم سیاہ منایا تھا۔ مگر بعد

---

[1] ظہور پاکستان ص ۱۰۲

میں وہ شامل ہونے کے لیے تیار ہوگئی۔ لہٰذا ۲۵۔ اکتوبر ۱۹۴۶ء کو پوری طرح عارضی حکومت تشکیل پاگئی جس میں مسلم لیگ کے پانچ سرکردہ لیڈروں نے شرکت کی۔ لیاقت علی خاں ان کے سربراہ تھے۔

## دستور ساز اسمبلی ناکام

کیبنٹ مشن کے سارے منصوبے کو تو کانگریس نے رد کر دیا البتہ دستور ساز اسمبلی میں شرکت انھوں نے قبول کی۔ اور کسی پابندی کو یہاں ماننے سے انکار کر دیا۔ اس سب کے باوجود ۹ دسمبر کو لارڈ ویول نے دستور ساز اسمبلی کا اجلاس بلایا۔ مسلم لیگ نے وائسرائے کے طرزِ عمل پر شدید گرفت کی۔ اور مسلم ممبران نے اس میں شرکت کرنے سے انکار کر دیا۔ مزید برآں رائے شماری کے طریقے میں بھی اختلاف تھا۔ برطانوی کابینہ نے دونوں جماعتوں کو لندن طلب کیا۔ اور وزیرِ اعظم اٹیلی نے براہِ راست مسئلہ کو حل کرانے کی کوشش۔ مگر وہ بھی ناکام ہوا۔ بالآخر برطانوی حکومت نے اعلان کر دیا "حکومت کسی ایسے دستور کو جسے ملک کا ایک حصہ ماننے کو تیار نہ ہو، زبردستی مسلط کرنے کے مخالف ہے" اس کے بعد کانگریس کے لیے من مانی کرنے کا راستہ بند ہو گیا۔ قائدِ اعظم نے ایک بیان میں دستوریہ کی ناکامی کا الزام کانگریس کی ہیجانی اور من مانی کارروائی کرنے کے سر تھوپا اور ساتھ ہی انھوں نے مطالبہ کیا کہ دستوریہ توڑ دی جائے۔ اس طرح نہ صرف کابینہ کا منصوبہ بلکہ دستوریہ سب مردہ ہو گئے۔ اس کے بعد سے مسلمان ممبروں نے دستوریہ میں شرکت کرنے سے انکار کر دیا۔

## تاریخ ساز اعلان

انگلستان کی حکومت چند سالوں سے ہندوستان کے مسئلہ کو براہِ راست حل کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کے سامنے یہ بحرانی اور وعدہ خلافی کی داستان ... اب اس نے آخری فیصلہ کر ڈالا۔ ۲۰۔ فروری ۱۹۴۷ء کو وزیرِ اعظم اٹیلی نے اعلان کیا کہ موجودہ بحرانی کیفیت

کو غیر محدود عرصہ تک جاری رہنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ اس لیے ہز میجسٹی کی حکومت چاہتی ہے کہ جون ۱۹۴۸ء تک بہر صورت اقتدار ہندوستانیوں کو منتقل کر دیا جائے۔ اگر کوئی پوری طرح نمائندہ حکومت متفق علیہ دستور بنانے میں کامیاب نہ ہو سکی تو برطانوی حکومت کو فیصلہ کرنا ہو گا کہ وہ اقتدار کس کو منتقل کرے۔ وفاقی ہندوستانی حکومت کو یا بعض حصوں میں موجودہ صوبائی حکومتوں کو یا پھر ہندوستانیوں کی فلاح کے پیش نظر کوئی اور بہتر طریقہ اختیار کیا جائے۔" یہ بہت اہم اعلان تھا۔ آزادی بہت قریب آ گئی تھی۔ اس لیے فریقین کو کوئی نہ کوئی متفقہ حل پیش کرنا ہی پڑا۔

## تقسیم ملک پر رضامندی

عارضی حکومت میں شامل ہو جانے کے بعد مسلم لیگ کے وزراء کو بجز وزارت خزانہ کے سب غیر اہم شعبے دیے گئے تھے۔ لیاقت علی خاں وزیر خزانہ مقرر ہوئے۔ انھوں نے نیا قومی بجٹ پیش کیا جس میں غریب آدمیوں کے لیے سہولت اور سرمایہ داروں پر ٹیکس عائد کیے گئے تھے۔ ہندو سرمایہ دار کانگریس کے پشت پناہ تھے۔ اس بجٹ کی وجہ سے وہ سب ناراض ہو گئے۔ مگر بجٹ بہرحال پاس ہو گیا۔ دوسری اہم بات یہ ہوئی کہ وزیر خزانہ کی منظوری کے بغیر دوسرا کوئی وزیر کوئی رقم خرچ نہیں کر سکتا تھا۔ سب وزیر اس طرح لیاقت علی خاں کے دستِ نگر بن گئے۔ پٹیل جیسا سخت مزاج اور متعصب ہندو جس نے وزارت داخلہ پر قبضہ کر رکھا تھا وہ بھی لیاقت علی خاں کے سامنے بے بس نظر آتا تھا۔ ایک ہفتہ ہی مشکل سے گزرا ہو گا کہ وہ انتہائی دل برداشتہ ہو گیا۔ سب سے پہلے اس نے کہا۔ "ان کو پاکستان دے کر جان چھڑاؤ۔"

۱۸ مارچ ۱۹۴۷ء کو کانگریس کمیٹی نے تقسیم ملک کا مطالبہ مان لیا۔ البتہ پنجاب اور بنگال کی تقسیم کا مطالبہ کیا۔ نہرو بھی پٹیل کا ہمنوا بن چکا تھا۔ انھوں نے اپنا فیصلہ وائسرائے کو بھیج دیا۔ اب تقسیم ملک کے راستے میں کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہی۔ اب دونوں قومیں تقسیم ملک

پر رضامند ہوگئیں۔ اس لیے وائسرائے ہند لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ۳ مئی ۱۹۴۷ء کو تقسیم کی ایک اسکیم منظوری کے لیے لندن روانہ کی۔ اس عرصہ میں پنڈت نہرو نے اور کرشنا مینن نے ماؤنٹ بیٹن سے دوستی بڑھالی۔ اس حد تک کہ وہ اسکیم جو لندن سے منظور ہو کر آئی اس کو پہلے ہی نہرو نے دیکھ لیا اور حسب منشاء اس میں چند ترامیم کرالیں[1] یہ امر رازداری کے سخت خلاف تھا جس کا مرتکب حکومت ہند کا ذمہ دار ترین فرد وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن ہوا تھا۔ وہ ایک خود سر شخص تھا اور ہندوؤں کی طرف مائل تھا۔ نئی مرمت شدہ اسکیم کو پھر وہ خود لے کر لندن گیا اور منظور کرا کے لے آیا۔ لندن میں بعض وزراء نے اس تبدیلی کی بات کی تو اس نے استعفٰی کی دھمکی دی۔ اس خوف سے کسی نے کچھ نہیں کہا۔ منظوری کی ساری کارروائی برطانوی کابینہ نے پانچ منٹ میں دے دی۔ مسلم لیگ کے رہنما قائد اعظم محمد علی جناح سے کہا آپ خود منظور کریں۔ ان کو مسلم لیگ کونسل سے مشورہ کرنے کی بھی مہلت نہیں دی۔ اور دھمکی یہ دی کہ بصورت دیگر ہم اقتدار صوبوں کو منتقل کر دیں گے۔ یہاں مسلم لیگ کی پوزیشن کمزور تھی۔ جہاں پاکستان بننے والا تھا وہاں کے صوبوں میں غیر مسلم لیگی حکومتیں قائم تھیں۔ پنجاب میں یونینسٹ حکومت تھی۔ بنگال اور سرحد میں کانگریس کی حکومتیں تھیں۔ اس لیے قائد اعظم کے سامنے منظور کرنے کے علاوہ دوسرا کوئی چارہ کار نہیں تھا۔

## پاکستان کا اعلان

۳۔ جون کو وائسرائے ہندوستان لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے تقسیم ملک کے منصوبہ کا اعلان کر دیا۔ جس کی منظوری کانگریس، مسلم لیگ اور برطانوی حکومت دے چکی تھی۔ مگر پاکستان میں شامل ہونے والے صوبوں میں پنجاب اور بنگال کو ہندو مسلم آبادی کی بنیاد پر تقسیم ہونا تھا۔

---

[1] پاکستان ناگزیر تھا۔ ص ۵۰۔

سلہٹ میں استصواب ہُوا۔ پاکستان کے حق میں ۲ لاکھ ووٹ آئے اور مخالفت میں ۸ لاکھ ووٹ آئے۔ صوبہ سرحد میں استصواب ہُوا۔ موافقت میں پونے تین لاکھ ووٹ آئے اور مخالفت میں پونے تین ہزار ووٹ آئے۔ وہاں خان عبدالغفار خاں نے اور جمعیۃ العلماء ہند نے پاکستان کے خلاف سخت مہم چلائی مگر سخت ناکامی اٹھائی۔ مگر خان صاحب نے معاف نہیں کیا۔ ان کی مخالفت آج تک جاری ہے۔

## ریڈکلف اوارڈ

پنجاب اور بنگال کو تقسیم کرنے کے لیے ایک باؤنڈری کمیشن مقرر ہُوا تھا جس کا سربراہ ایک انگریز وکیل ریڈکلف تھا۔ ریڈکلف نے تقسیم کی اسکیم ماؤنٹ بیٹن کو پیش کر دی۔ اس موقع پر اس نے برا بے ایمانی از دفت، پنڈت نہرو کو دکھا دی۔ جس میں انھوں نے حسب منشاء ترمیم کر دی۔ اور پاکستان کو اس کے جائز حق سے محروم کر دیا۔ گورداسپور ہندوستان کو دیدیا۔

## پاکستان بن گیا

تمام مراحل جب پُورے ہو چکے تو لارڈ ماؤنٹ بیٹن وائسرائے ہندوستان کراچی آئے اور ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء[1] کو ایک رنگا رنگ تقریب میں اقتدار اعلیٰ پاکستان کے گورنر جنرل قائداعظم محمد علی جناح کو منتقل کر دیا۔ ہز مجسٹی جارج ششم انگلستان کا فرمان منتقلی اقتدار اعلیٰ وائسرائے نے پڑھ کر سنایا۔ اس طرح ۹۰ سالہ برطانوی شہنشاہیت کا دور حکومت ختم ہو گیا۔

## مخالفین کا رویہ

انگریز نے اور ہندو نے بادل ناخواستہ پاکستان کی منظوری دی۔ اعلان پاکستان

---

[1] ۲۷ رمضان ۱۳۶۶ھ

کے بعد بھی دل میں وہ یہی آرزو پالتے رہے کہ بہر کیف پاکستان پھر دوبارہ ہندوستان سے مِل جائے گا۔

اٹیلی وزیر اعظم برطانیہ جنھوں نے منظوری دی تھی۔ وہ فرماتے ہیں :

"ہندوستان تقسیم ہو رہا ہے۔ لیکن مجھے امید واثق ہے کہ یہ تقسیم زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہ سکے گی اور یہ دونوں مملکتیں جنھیں ہم اس وقت الگ کر رہے ہیں، ایک دن پھر آپس میں مِل کر رہیں گی۔"

پنڈت نہرو ایک طرف تو تقسیم ہند کے فیصلے پر دستخط کر رہے تھے دوسری طرف اپنی قوم سے کہہ رہے تھے۔

"ہماری اسکیم یہ ہے کہ ہم اس وقت جناح کو پاکستان بنا لینے دیں۔ اور اس کے بعد معاشی طور پر یا دیگر انداز سے ایسے حالات پیدا کر دیئے جائیں۔ جن سے مجبور ہو کر مسلمان گھٹنوں کے بل جھک کر ہم سے درخواست کریں کہ ہمیں پھر سے ہندوستان میں مدغم کر لیجئے۔"

## قتل و غارت گری

آزادی کی پوری جدوجہد میں قائداعظم محمد علی جناح کے قانونی ذہن میں یہ بات نہیں آئی کہ تنگ نظر اور انتہا پسند ہندو قتل و غارت گری بھی کر سکتا ہے۔ حالانکہ ہندو تنظیموں نے اس مذموم کام کی ایک مدت سے تیاری کر رکھی تھی۔ مسلمانوں نے کسی قسم کی کوئی تیاری نہیں کی۔ جون میں اعلان پاکستان کے بعد سے ان تنظیموں نے قتل و غارت گری مسلمانوں پر حملے کرنے اور بستیوں کو آگ لگانے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ مشرقی پنجاب میں سکھوں نے اور راور بھرت پور میں راشٹریہ سیوک سنگھ کے مسلح دستوں نے مسلمانوں کا قتل عام شروع کر دیا۔ بستیوں کو نذر آتش کر دیا۔ مسلمان عورتوں کو اغوا کیا گیا۔ ان حالات میں بے بس مسلمانوں کے ہزاروں پر مشتمل قافلے مختلف سواریوں کے

ذریعے اور پیدل بہ ہزار تکلیف و پریشانی بے سر و سامانی کے عالم میں سرزمین پاکستان میں داخل ہونے شروع ہو گئے۔ نئی حکومت جس کا ابھی دفتر بھی پوری طرح قائم نہیں ہوا تھا مہاجرین کی اتنی بڑی تعداد کے آجانے سے ایک نئی مصیبت سے دوچار ہو گئی۔ جن کو ہندو مسلح دستوں نے ان کے گھروں اور بستیوں سے نکال دیا تھا۔

صبر و رضا، توکل و تسلیم ایمان باللہ کا خاصہ ہے۔ اس کی بنیاد پر مسلمان مصیبت زدہ عوام نے قتل و غارت گری کے غیر معمولی مصائب برداشت کیے۔ مسلمانوں نے نہ جزع فزع کی نہ خودکشی کی صورت کو ترجیح دی۔ کوئی اور قوم ہوتی تو اس میں خودکشیوں کے واقعات بڑی تعداد میں پیش آتے۔ کوئی اور حکومت ہوتی تو فیل ہو جاتی۔ جو ہندو سازشیوں کا مقصد تھا۔ مگر پاکستان کی مسلمان حکومت نے یہ تمام غیر معمولی حالات برداشت کیے۔ بہرکیف ان انتہائی ناسازگار حالات میں جبکہ پاکستان حکومت کو ہندوستان نے برطانوی خزانہ سے اس کا حصہ بھی نہیں دیا تھا۔ حکومت ہمت و حوصلہ سے مہاجرین کی آبادکاری بھی کرتی رہی۔ اور انہی ایام میں حکومت کی مشینری بھی تشکیل پذیر ہوئی۔ ایک سال بعد ہی ۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء کو بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کا انتقال ہو گیا۔ بہرکیف پاکستان کا قیام انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔

*****

## چودھواں باب

# اللہ کی حاکمیت اور شریعت کی بالادستی کا اعلان

## مسودہ قرارداد مقاصد

۷ مارچ ۱۹۴۹ء کو لیاقت علی خاں وزیر اعظم پاکستان نے دستور ساز اسمبلی کے سامنے مندرجہ ذیل مسودہ قرارداد مقاصد پیش کیا۔

صدر محترم! میں ذیل میں قرارداد مقاصد Objectives Resolution پیش کرتا ہوں۔ یہ قرارداد مقاصد ان اصولوں پر مبنی ہے جن پر پاکستان کا دستور اساسی مبنی ہوگا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

چونکہ اللہ تبارک و تعالیٰ ہی کل کائنات کا بلاشرکت غیرے حاکم مطلق ہے اور اسی نے جمہور کی وساطت سے مملکت پاکستان کو اختیار حکمرانی اپنی مقرر کردہ حدود کے اندر استعمال کرنے کے لیے نیابتاً عطا فرمایا ہے اور چونکہ یہ اختیار حکمرانی ایک مقدس امانت ہے۔

لہٰذا جمہور پاکستان کی نمائندہ مجلس دستور ساز فیصلہ کرتی ہے کہ آزاد و خودمختار مملکت پاکستان کے لیے ایک دستور مرتب کیا جائے۔

جس کی رو سے مملکت جملہ حقوق و اختیارات حکمرانی جمہور کے منتخب نمائندوں کے ذریعے سے استعمال کرے۔ جس میں اصول جمہوریت و حریت و مساوات و رواداری اور عدل عمرانی کو جس طرح اسلام نے ان کی تشریح کی ہے پورے طور پر ملحوظ رکھا جائے۔

جس کی رو سے انسان کو اس قابل بنایا جائے کہ وہ انفرادی اور اجتماعی طور پر

اپنی زندگی کو اسلامی تعلیمات و مقتضیات کے مطابق جو قرآن مجید اور سنت رسولؐ میں متعین ہیں، ترتیب دے سکیں۔

جس کی رُو سے اس امر کا قرار واقعی انتظام کیا جائے کہ اقلیتیں آزادی کے ساتھ اپنے مذہبوں پر عقیدہ رکھ سکیں اور ان پر عمل کر سکیں اور اپنی ثقافت کو ترقی دے سکیں۔

جس کی رُو سے وہ علاقے جو اب تک پاکستان میں داخل یا شامل ہو گئے ہیں اور ایسے دیگر علاقے جو آئندہ پاکستان میں داخل یا شامل ہو جائیں ایک وفاقیہ بنائیں جس کے ارکان مقرر کردہ حدود و اربعہ و متعینہ اختیارات کے ماتحت خود مختار ہوں۔

جس کی رُو سے بنیادی حقوق کی ضمانت دی جائے اور ان حقوق میں قانون اور اخلاق عامہ کے ماتحت مساوات حیثیت و مواقع، قانون کی نظر میں برابری، عمرانی، اقتصادی اور سیاسی عدل، خیال، اظہار عقیدہ و دین و عبادات اور ارتباط کی آزادی شامل ہوں۔

جس کی رُو سے اقلیتوں اور پس ماندہ و پست طبقوں کے جائز حقوق کے تحفظ کا قرار واقعی انتظام کیا جائے۔ جس کی رُو سے نظام عدل کی آزادی کامل طور پر محفوظ ہو۔

جس کی رُو سے وفاقیہ علاقوں کی صیانت اس کی آزادی اور اس کے جملہ حقوق کا جن میں اس کی بر و بحر اور فضا پر سیادت کے حقوق شامل ہیں تحفظ کیا جائے۔

تاکہ اہلِ پاکستان فلاح و خوشحالی کی زندگی بسر کر سکیں۔ اقوام عالم کی صف میں اپنا جائز اور ممتاز مقام حاصل کر سکیں اور امن عالم کے قیام اور بنی نوع انسان کی ترقی و بہبود میں کماحقہٗ اضافہ کر سکیں۔

## لیاقت علی خاں کی تقریر:۔

## اسلام اکسیرِ اعظم

جناب والا! میں اس موقع کو ملک کی زندگی میں بہت اہم سمجھتا ہوں۔ باعتبار اہمیت

صرف حصولِ آزادی ہی اس سے بلند تر ہے، کیونکہ حصولِ آزادی سے ہمیں اس بات کا موقع ملا کہ ہم ایک مملکت کی تعمیر اور اس کے نظامِ سیاست کی تشکیل اپنے نصب العین کے مطابق کر سکیں۔

میں ایوان کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ بابائے ملت قائداعظم نے اس مسئلے کے متعلق اپنے جذبات کا متعدد موقعوں پر اظہار کیا تھا اور قوم نے ان کے خیالات کی تائید غیر مبہم الفاظ میں کی تھی۔ پاکستان اس لیے قائم کیا گیا کہ اس برصغیر کے مسلمان اپنی زندگی کی تعمیر اسلامی تعلیمات و روایات کے مطابق کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے کہ وہ دنیا پر عملاً واضح کر دینا چاہتے تھے کہ آج حیاتِ انسانی کو جو طرح طرح کی بیماریاں لگ گئی ہیں ان سب کے لیے اسلام اکسیرِ اعظم کا حکم رکھتا ہے۔ ساری دنیا تسلیم کرتی ہے کہ ان بحرانوں کا اصل سبب یہ ہے کہ انسان اپنی مادی ترقی کے ساتھ قدم نہ بڑھا سکا۔ اور انسانی دماغ نے سائنسی ایجادات کی شکل میں جو جن اپنے اوپر مسلط کر لیا ہے۔ اب اس سے نہ صرف انسانی زندگی کے سارے نظام اور اس کے مادی ماحول کی تباہی کا خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ بلکہ اس کرۂ ارضی کے بھی تباہ ہو جانے کا اندیشہ ہے جس پر انسان آباد ہے۔

یہ عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے کہ اگر انسان نے زندگی کی روحانی قدروں کو نظر انداز نہ کیا ہوتا اور اگر خدا کی نسبت اس کا اعتقاد کمزور نہ ہو گیا ہوتا تو اس سائنسی ترقی سے خود اس کی ہستی ہرگز خطرہ میں نہ پڑتی۔ محض وجودِ باری کا احساس انسانیت کو اس تباہی سے بچا سکتا ہے جس کا نشانہ وہ یہ ہے کہ انسان کو جو قوتیں حاصل ہیں۔ ان سب کو ان اخلاقی معیاروں کے مطابق استعمال کرنا لازمی ہے جو وحی سے فیضیاب ہونے والے ان معلموں نے معین کر دیے ہیں جنھیں ہم مختلف مذاہب کے جلیل القدر بانی سمجھتے ہیں۔

## مقتدر اعلیٰ اللہ تعالیٰ

ہم پاکستانی ہونے ہوتے اس بات پر شرمندہ نہیں ہیں کہ ہماری غالب اکثریت مسلمان ہے۔ اور ہمارا اعتقاد ہے کہ ہم اپنے ایمان اور نصب العین پر قائم رہ کر ہی دنیا کے فوز و فلاح میں حقیقی اضافہ کر سکتے ہیں۔ لہٰذا جناب والا! آپ ملاحظہ فرمائیں گے کہ اس قرار داد کی تمہید میں صاف اور صریح الفاظ میں یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ تمام اختیار و اقتدار کا ذات الٰہی کے تابع ہونا لازمی ہے۔ یہ بالکل درست ہے کہ یہ نظریہ مغربی حکیم مکیاویلی کے خیالات کے بالکل برعکس ہے جس کا تصور مملکت یہ ہے کہ اس کے نظام حکومت میں روحانی اور اخلاقی قدروں کو مطلق دخل نہیں ہونا چاہیے۔ اس لیے شاید اس بات کا خیال بھی رواج کے کسی قدر خلاف ہی سمجھا جاتا ہے کہ مملکت کو خیر کا آلہ ہونا چاہیے نہ کہ شر کا۔ لیکن ہم پاکستانیوں میں اتنی جرأت ایمانی ہے کہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ تمام اقتدار اسلام کے قائم کردہ معیاروں کے مطابق استعمال کیا جائے تاکہ اس کا غلط استعمال نہ ہو سکے۔ اقتدار تمام تر ایک مقدس امانت ہے جو خداوند تعالیٰ کی طرف سے ہمیں اس لیے تفویض ہوا ہے کہ ہم اسے نوع انسانی کی خدمت کے لیے استعمال کریں۔ اور یہ امانت ظلم و تشدد اور خود غرضی کا آلہ نہ بن جائے۔

## جمہوریت

بہر صورت میں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ اس سے ہرگز مراد یہ نہیں ہے کہ ہم حکمرانوں اور بادشاہوں کے ظل الٰہی ہونے کے فرسودہ نظریہ کو پھر سے زندہ کریں۔ کیونکہ جذبہ اسلامی کے تحت تمہید قرار داد میں اس حقیقت کو کلی طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے کہ خدا نے اختیارات سوائے جمہور کے کسی اور کو تفویض نہیں کیے اور اس کا فیصلہ خود جمہور کو ہی کرنا ہو گا کہ یہ اقتدار کن لوگوں کے ذریعہ استعمال کیا جائے گا۔ اس لیے قرار داد میں یہ بات واضح کر دی

گئی ہے کہ مملکت، تمام حقوق و اختیارات کو عوام کے منتخب کردہ نمائندوں کے ذریعہ کام میں لائے گی۔ یہی جمہوریت کا نچوڑ ہے۔ کیونکہ جمہور کو ہی اختیارات کی امانت کا حامل تسلیم کیا گیا ہے۔ پھر جمہور ہی کو ان اختیارات کے استعمال کا مجاز ٹھہرایا گیا ہے۔

## تھیا کریسی کی نفی

جناب والا! میں نے ابھی عرض کیا تھا کہ اختیارات کے حقیقی حامل جمہور ہیں چنانچہ قدرتی طور پر "تھیوکریسی" کے لغوی معنی "خدا کی حکومت" ہیں اور اس اعتبار سے تو کل کائنات ہی "تھیوکریسی" ہوئی۔ کیونکہ کائنات کا کون سا گوشہ ایسا ہے جہاں اسے قدرت حاصل نہیں۔ لیکن اصطلاح میں "تھیوکریسی" کلیسائی حکومت کو کہتے ہیں۔ یعنی برگزیدہ پادریوں کی حکومت، جو محض اس بنا پر اختیار رکھتے ہوں کہ وہ ایسے اہل تقدس کی طرف سے خاص طور پر مقرر کئے گئے ہیں جو اپنے مقام تقدس کے اعتبار سے ان حقوق کے دعویدار ہیں۔ اور میں اس امر پر جتنا بھی زور دوں کم ہوگا کہ یہ تصور اسلام سے قطعاً بعید ہے۔ اسلام ملائیت یا کسی حکومت مشائخ کو تسلیم نہیں کرتا۔ اس لئے اسلام میں "تھیوکریسی" کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اگر کوئی شخص اب بھی پاکستان کے نظام حکومت کے ضمن میں "تھیوکریسی" کا ذکر کرتا ہے تو وہ یا تو کسی شدید غلط فہمی کا شکار ہے یا شرارت سے ہمیں بدنام کرنا چاہتا ہے۔

## مساوات و عدل عمرانی

جناب والا! اب میں آپ کی توجہ اس امر کی طرف مبذول کراتا ہوں کہ قرارداد مقاصد میں جمہوریت، حریت، مساوات، رواداری اور عدل عمرانی کے اصولوں پر زور دیا گیا ہے اور اس کی مزید صراحت یہ کر دی گئی ہے کہ دستور مملکت میں ان اصولوں کو اس تشریح کے مطابق ملحوظ رکھا جائے جو ان الفاظ کی اسلام نے کی ہے۔ ان الفاظ کی صراحت

کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ یہ بالعموم مبہم طور پر استعمال کیے جاتے ہیں۔ مثلاً مغربی حکومتیں اور اشتراکی روس دونوں اس امر کا دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کے نظام حکومت جمہوریت پر مبنی ہیں۔ لیکن ہر شخص جانتا ہے کہ وہ کس قدر مختلف ہیں۔ اس لیے ضروری سمجھا گیا کہ ان الفاظ کے مفہوم کا تعین کر دیا جائے تاکہ ہر شخص کے ذہن میں ان کا مفہوم آجائے۔ جس وقت ہم جمہوریت کا لفظ اس کے اسلامی مفہوم میں استعمال کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جمہوریت ہماری زندگی کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہے اور اس کا اطلاق جتنا ہمارے نظام حکومت پر ہے اتنا ہی ہمارے معاشرے پر بھی ہے۔ کیونکہ اسلام نے دنیا کو جن عظیم الشان صفتوں سے مالا مال کیا ہے۔ ان میں سے ایک عام انسانوں کی مساوات ہے۔ اسلام نسل، رنگ اور نسب کے امتیازات کو تسلیم نہیں کرتا۔ انحطاط کے دور میں بھی اسلامی معاشرہ ان تعصبات سے نمایاں طور پر پاک رہا۔ جنھوں نے دنیا کے دوسرے انسانوں کے باہمی تعلقات کو زہر آلود کر دیا تھا۔

اسی طرح ہماری رواداری کی روایات بھی عظیم الشان ہیں۔ کیونکہ قرون وسطیٰ میں اقلیتوں کو کسی نظام حکومت کے تحت وہ مراعات حاصل نہیں ہوئیں جو مسلمان ملکوں میں ان کو حاصل تھیں جس زمانہ میں کلیسا سے اختلاف رکھنے والے مسیحیوں اور مسلمانوں کو اذیتیں دی جاتی تھیں اور انھیں گھروں سے نکالا جاتا تھا۔ اسلام ان سب کا مامن و ملجا ثابت ہوا جنھیں مظالم کا نشانہ بنایا جا رہا تھا۔ اور جو تنگ آکر بھاگ نکلنے پر مجبور ہوتے تھے۔ زندہ جلانے کا تو تصور بھی اسلام میں کبھی نہیں آیا۔ تاریخ کا یہ مشہور واقعہ ہے کہ جب سامیوں سے نفرت کے تحت بہت سے یہودیوں کو یورپ کے ممالک سے نکال دیا گیا تو سلطنت عثمانیہ نے انھیں اپنے یہاں پناہ دی۔ مسلمانوں کی رواداری کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ دنیا میں کوئی اسلامی ملک ایسا نہیں ہے جہاں اقلیتیں کافی تعداد میں موجود نہ ہوں اور جہاں وہ اپنے مذہب اور ثقافت کو برقرار نہ رکھ سکی ہوں۔ ہندوستان کے اس برصغیر میں جہاں کبھی مسلمانوں کو محدود اختیارات حاصل تھے، غیر مسلموں کا پاس و لحاظ رکھا گیا اور ان کا ہمیشہ تحفظ کیا گیا۔

جناب والا! میں آپ کی توجہ اس طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ مسلمانوں ہی کی سرپرستی میں ہندوستان کی بہت سی زبانوں کو فروغ حاصل ہوا۔ میرے بنگال سے آنے والے دوستوں کو یاد ہوگا کہ یہ صرف مسلمان حکمرانوں کی حوصلہ افزائی کا ہی نتیجہ تھا کہ سب سے پہلے ہندوؤں کی مقدس کتابوں کا ترجمہ سنسکرت سے بنگالی میں کیا گیا۔ یہی وہ رواداری ہے جس کا دستور ہمیشہ اسلام نے پیش کیا ہے۔ جس میں اقلیتیں ذلت و رسوائی کی حالت میں نہیں رہتیں بلکہ باعزت طریقہ پر زندگی بسر کرتی ہیں۔ اور انھیں اپنے نظریات اور اپنی ثقافت کو فروغ دینے کے مواقع دیے جاتے ہیں، تاکہ وہ پوری قوم کی عظمت میں اضافہ کرسکیں۔

جناب والا! جہاں تک عدل عمرانی کا تعلق ہے میں کہوں گا کہ اسلام اس میں امتیازی اضافہ کرتا ہے۔ اسلام ایک ایسے معاشرے کے قیام کا حامی ہے جس میں عدل عمرانی کا دستور خیرات پر مبنی ہے نہ تشدد پر۔ اسلام جو عمرانی عدل قائم کرنا چاہتا ہے وہ ان بنیادی ضابطوں اور تصورات پر مبنی ہے جو انسان کی زندگی کو احتیاج سے پاک رکھنے کے ضامن ہیں اور جو دولت آزادی سے مالا مال کر دینے والے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جمہوریت، آزادی، مساوات، رواداری اور عدل عمرانی کی ایسی تعریف کی گئی ہے جس کی وجہ سے ہمارے خیال کے مطابق ان الفاظ کے عام معانی کی بہ نسبت زیادہ گہرے اور وسیع معانی پیدا ہو گئے ہیں۔

## اسلامی زندگی کے لیے تیاری

قرارداد کی اس دفعہ کے بعد یہ دفعہ درج ہے کہ مسلمانوں کو اس قابل بنایا جائے کہ وہ انفرادی اور اجتماعی طور پر اپنی زندگی کو اسلامی تعلیمات و مقتضیات کے مطابق جو قرآن مجید اور سنت رسول میں متعین ہیں ترتیب دے سکیں۔ یہ امر بالکل ظاہر ہے کہ اگر مسلمانوں کو اس قابل بنایا جائے کہ وہ اپنی زندگی اپنے مذہب کی تعلیمات کے مطابق بنالیں تو اس پر کسی غیر مسلم کو اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔

جناب والا! حکومت ایک غیر جانبدار تماشائی کی حیثیت سے اس امر پر اکتفا نہیں کرے گی کہ مسلمانوں کو اس مملکت میں صرف اپنے مذہب کو ماننے اور اس پر عمل کرنے کی آزادی حاصل ہو کیونکہ حکومت کے اس طریق عمل کا مطلب یہ ہو گا کہ جو مقاصد پاکستان کے مطالبہ کے محرک تھے انہی کی خلاف ورزی ہو۔ حالانکہ یہ مقاصد اس مملکت کا سنگِ بنیاد ہونے چاہئیں جسے ہم تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔ یہ مملکت ایک ایسا ماحول پیدا کرے گی جو ایک حقیقی اسلامی معاشرہ کی تعمیر میں ممد و معاون ہو۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ مملکت کو اپنی مساعی میں مثبت طرز عمل اختیار کرنا ہو گا۔

جناب والا! آپ کو یاد ہو گا کہ قائد اعظم اور مسلم لیگ کے دوسرے رہنماؤں نے ہمیشہ یہ واضح اور غیر مبہم اعلانات کیے کہ پاکستان کے قیام کے لیے مسلمانوں کے ہاں اپنا طریق زندگی اور ضابطہ اخلاق موجود ہے۔ انھوں نے بار بار اس امر پر بھی زور دیا کہ اسلام کا مطلب صرف یہ نہیں ہے کہ خدا اور بندہ کے درمیان ایک ایسا تعلق قائم ہو جسے مملکت کے کاروبار میں کسی قسم کا دخل نہ ہو۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اسلام میں عمرانی اخلاق کے متعلق مخصوص ہدایات ہیں اور اسلام روزمرہ پیش آنے والے مسائل کے متعلق معاشرے کے طرز عمل کی رہنمائی کرتا ہے۔ اسلام صرف ذاتی عقائد اور اخلاق کا نام نہیں ہے بلکہ اپنے پیروؤں سے توقع کرتا ہے کہ وہ ایک ایسے معاشرے کی تعمیر کریں جس کا مقصد حیات صالح ہو۔ یونانیوں کے برخلاف اسلام نے صالح زندگی کا جو تصور پیش کیا ہے اس کی اساس لازماً روحانی اقدار پر قائم ہے۔ ان اقدار کو اہمیت دینے اور انھیں نافذ کرنے کے لیے مملکت پر لازم ہو جاتا ہے کہ وہ مسلمانوں کی سرگرمیوں کی اس طریقہ پر ہم نوائی کرے کہ ایک ایسا نیا عمرانی نظام قائم ہو جائے جو اسلام کے بنیادی اصولوں پر مبنی ہو۔ جن میں جمہوریت، حریت، رواداری اور عمرانی عدل شامل ہیں۔ ان کا ذکر تو میں نے تمثیلاً کیا ہے۔ کیونکہ وہ اسلامی تعلیمات جو قرآن اور سنت نبوی پر مشتمل ہیں محض اس پر ختم نہیں ہو جاتیں۔ کوئی مسلمان

ایسا نہیں ہو سکتا جس کا اس پر ایمان نہ ہو کہ کلام اللہ اور اسوۂ رسولؐ ہی اس کے رُوحانی فیضان کے بنیادی سرچشمے ہیں۔ ان کے متعلق مسلمانوں کے مابین کوئی اختلاف رائے نہیں ہے۔ اور اسلام کا کوئی فرقہ نہیں ہے جو ان کے وجود کو تسلیم نہ کرتا ہو۔

## فرقہ پرستی نہیں

لہٰذا کسی ایسے فرقے کو جو پاکستان میں اقلیت میں ہو، اس مملکت کی نیت کی طرف سے اپنے دل میں غلط فہمی نہیں رکھنا چاہیے۔ یہ مملکت ایک ایسا اسلامی معاشرہ پیدا کرنے کی سعی کرے گی جو باہمی تنازعات سے مبرا ہو۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اعتقادات کے معاملہ میں وہ مسلمانوں کے کسی طبقے کی آزادی سلب کرے گا۔ کسی فرقہ کو خواہ وہ اقلیت میں ہو یا اکثریت میں یہ اجازت نہیں ہو گی کہ وہ دوسروں کو اپنا تحکم قبول کرنے پر مجبور کرے۔ اور اپنے اندرونی معاملات اور فرقہ وارانہ اعتقادات میں تمام فرقوں کو کامل آزادی اور وسعت خیال و مشرب حاصل ہو گی۔ درحقیقت ہمیں یہ اُمید ہے کہ مختلف فرقے اس منشا کے مطابق عمل کریں گے۔ جو اس حدیث میں مذکور ہے کہ میری اُمت کے لوگوں میں اختلاف رائے ایک نعمت ہے۔ اب یہ ہمارا کام ہے کہ اپنے اختلافات کو اسلام اور پاکستان کے لیے باعث استحکام بنائیں اور چھوٹے موٹے مفادات کے لیے ناجائز فائدہ نہ اُٹھائیں۔ کیونکہ اس طرح پاکستان اور اسلام دونوں کمزور ہو جائیں گے۔ بسا اوقات اختلافات رائے ہم آہنگی اور ترقی کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ لیکن یہ صرف اسی طرح ہو سکتا ہے کہ رائے کے اختلافات میں اس امر کی اجازت نہ دی جائے کہ وہ ہمارے حقیقی نصب العین کو جو اسلام کی خدمت اور اس کے مقاصد کو ترقی دینا ہے نظروں سے اوجھل کر دیں۔ بس ظاہر ہے کہ اس دفعہ کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کو ایک ایسا نظام سیاست قائم کرنے کی مہلت حاصل ہو جائے جس کے ذریعے دنیا پر واضح ہو سکے کہ اسلام دُنیا میں نہ صرف ایک ترقی پسند

نا قت ہے بلکہ وہ ان گوناگوں خرابیوں کا علاج بھی مہیا کرتا ہے جن میں بنی نوع انسان مبتلا ہے۔ کیونکہ مسلمانوں کو اپنی پستی اور محکومی کے طویل دَور میں ہمیشہ اس قسم کے موقع کی تلاش رہی ہے۔

## غیر مُسلموں کے حقوق محفوظ

ایک اسلامی معاشرہ تعمیر کرنے کے مقصد میں ہم نے غیر مسلموں کے حقوق کو نظر انداز نہیں کیا۔ اگر ہم اقلیتوں کی آزادی میں مداخلت کرنے کی کوشش کرتے تو یہ ایک غیر اسلامی فعل ہوتا۔ اور ہم یقیناً اپنے مذہبی احکام کی خلاف ورزی کے مرتکب ہوتے۔ اقلیتوں کو اپنے مذہب پر چلنے، اس کی حفاظت کرنے یا اپنی ثقافت کو فروغ دینے سے کسی طرح بھی روکا نہیں جاتے گا۔ اسلامی ثقافت کے نشوونما کی تاریخ بتاتی ہے کہ مُسلمان حکومتوں اور سلطنتوں کے تحت زندگی بسر کرنے والی اقلیتوں کی ثقافتیں میراث کی اس دولت میں اضافہ کرنے کا موجب ہُوئیں جو مُسلمانوں نے اپنے لیے مہیّا کی تھی، مَیں اقلیتوں کو یقین دلاتا ہُوں کہ ہمیں اس امر کا پُورا پُورا احساس ہے کہ اگر اقلیتیں انسانی علم وفکر کی دولت میں اضافہ کرسکیں تو یہ امر پاکستان کی نیک نامی میں اضافہ کا موجب ہوگا اور ہماری قومی زندگی کو چار چاند لگا دے گا۔ اس لیے اقلیتوں کو نہ صرف کامل آزادی کی توقع کرنی چاہیے بلکہ یہ اُمید بھی رکھنی چاہیے کہ اکثریت ان کے ساتھ قدر دانی اور احترام کا وہی برتاؤ کرے گی جو تاریخ میں ہمیشہ مُسلمانوں کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔

## وفاقی حکومت

جناب والا! قرارداد میں وفاقی طرزِ حکومت کا ذکر کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جغرافیائی حالات اس طرزِ حکومت کے ہی مقتضی ہیں۔ اس صورت میں جب کہ ہمارے ملک کے دو حصوں

کے درمیان ایک ہزار میل سے بھی زیادہ فاصلہ ہے۔ وحدانی مرکزی حکومت کے قیام کا خیال بیکار ہے۔ لیکن میں اُمید کرتا ہوں کہ مجلس دستور سازان واحدوں کو ایک دوسرے سے قریب تر لانے اور ایسے رابطے پیدا کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کرے گی۔ جن سے ہماری قوم خوب منظم ہو جاتے ہیں نے ہمیشہ صوبہ پرستی کے جذبات کو دبانے کی حمایت کی ہے۔ مگر میں اس امر کو واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ کسی ایسی بات کی اجازت نہ دینی چاہیے جو کسی طرح قومی اتحاد کو کمزور کرنے کا موجب بنے۔ نیز آبادی کے مختلف فرقوں کے موجودہ باہمی تعلقات کو بہتر بنانے کا بندوبست کیا جائے۔ اس مقصد کے لیے مجلس دستور ساز کو اس مسئلہ پر از سر نو غور کرنا پڑے گا کہ کون سے امور مرکز کے تحت ہونے چاہئیں اور کون سے واحدوں کے پاس رہیں۔ اور یہ کہ ہمارے نظام میں واحدوں کا تعین کس طرح کیا جائے۔

## بنیادی حقوق

صاحب صدر! بعض بنیادی حقوق کے تحفظ کا یقین دلانا بھی ایک رسم سی ہو گئی ہے لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ہمارا مقصد ہرگز یہ نہیں ہے کہ ہم ایک ہاتھ سے حقوق دیں اور دوسرے ہاتھ سے واپس لے لیں۔ میں اس بات کے ثبوت میں بہت کچھ کہہ چکا ہوں کہ ہم ایک حقیقی وسیع الخیال حکومت بنانا چاہتے ہیں۔ جس کے تمام ارکان کو زیادہ سے زیادہ آزادی حاصل ہوگی۔ قانون کی نظر میں سب برابر ہوں گے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان کے پرسنل لا کا تحفظ نہیں کیا جائے گا حیثیت اور مال کے معاملہ میں مساوات ہمارا عقیدہ ہے یہ ہمارا پختہ یقین ہے اور ہم نے اکثر بلکہ اس کا اعلان کیا ہے کہ پاکستان مفاد پرستوں اور مالدار طبقوں کے لیے نہیں بنا ہے۔ ہمارا مقصد اقتصادی نظام کو اسلام کے بنیادی اصولوں پر تعمیر کرنا ہے۔ کیونکہ یہ دولت کی بہتر تقسیم میں اور ناداری کو رفع کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ اپنے پورے عرصہ بر

پہنچنے میں جو وجوہ انسان کے لیے مانع رہے وہ افلاس اور پس ماندگی ہیں۔ اور پاکستان سے ہم ان کو مٹا کر چھوڑیں گے۔ ہمارے عوام اس وقت غریب اور جاہل ہیں۔ لیکن ہمیں ان کا معیارِ زندگی ضرور بلند کرنا اور انھیں افلاس اور جہالت کی زنجیروں سے آزاد کرانا چاہیے۔ جہاں تک سیاسی حقوق کا تعلق ہے حکومت کے پیشِ نظر حکمت عملی کے تعین اور حکومت چلانے کے لیے ان ارکان کا انتخاب کرنے میں ہر شخص کو دخل حاصل ہوگا تاکہ وہ اپنا کام عوام کے مفاد کا خیال رکھ کر کریں۔ چونکہ ہمیں یہ یقین ہے کہ خیالات پر کوئی پابندی نہیں عائد کی جا سکتی اس لیے ہم نہیں چاہتے کہ کسی شخص کو اس کے خیالات کے اعتبار سے باز رکھیں۔ اور نہ ہم کسی کو جائز اور اخلاقی مقاصد کے پیشِ نظر ربط وانتساب سے روکنا چاہتے ہیں مختصر یہ کہ ہم اپنے نظامِ حکومت کی بنیادی آزادی، ترقی اور عدل عمرانی پر رکھنا چاہتے ہیں۔ ہم سماجی تفاریق کو اس طریقہ سے ختم کرنا چاہتے ہیں کہ کسی کو نقصان نہ پہنچے اور انسانی خیالات اور جائز رجحانات پر بھی پابندیاں عائد نہ ہوں۔

## اقلیتوں کا تحفظ

جناب والا! اقلیتوں کے بہت سے مفاد ایسے ہیں جن کا وہ بجا طور پر تحفظ چاہتی ہیں۔ یہ قرارداد اس تحفظ کی ضامن ہے۔ ہماری خاص ذمہ داری پست اور پس ماندہ لوگوں کی نسبت ہے۔ ہم ان کی اس حیثیت سے پوری طرح آگاہ ہیں کہ وہ اپنی موجودہ حالت میں بغیر کسی قصور کے مبتلا ہیں اور یہ بھی حقیقت ہے کہ ہم ان کے حالات اس حالت تک پہنچنے کے کسی طرح بھی ذمہ دار نہیں ہیں۔ لیکن اب چونکہ وہ ہمارے شہری ہیں۔ اس لیے ہماری خاص کوشش یہ ہوگی کہ ہم انھیں دیگر شہریوں کے دوش بدوش لے آئیں تاکہ وہ ان ذمہ داریوں کو سنبھال سکیں جو ایک آزاد اور ترقی پسند مملکت کے شہری ہونے کی حیثیت سے ان پر عاید ہوتی ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ جب تک ہمارے عوام

میں پس ماندہ طبقے موجود ہیں۔ ہمارے معاشرہ کی ترقی کی رفتار سست رہے گی۔ لہٰذا مملکت کی تعمیر کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم ان طبقوں کے مفادات کو ملحوظ رکھیں۔

## روشن مستقبل

میں آخر میں صاحب صدر یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ ہمیں پختہ یقین ہے کہ ہم پاکستان کو ان اصولوں پر ڈھال کے جن کی توضیح کر دی گئی ہے۔ اس مملکت کو ترقی کی راہ پر ڈال دیں گے۔ وہ دن دور نہیں جب پاکستان ایک ایسا ملک بن جائے گا جس کے باشندے بلا تمیز عقائد و حیثیت اس پر فخر کریں گے۔ مجھے یقین ہے کہ ہمارے عوام بڑی صلاحیتوں کے حامل ہیں۔ انھوں نے بے بہا قربانیوں اور اس قابل تعریف ضبط و نظم کی بدولت جس کا مظاہرہ انھوں نے ایک ابتلائی اور نازک دور میں کیا تمام دنیا سے خراج تحسین حاصل کر لیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ایسی قوم نہ صرف زندہ رہنے کی مستحق ہے بلکہ وہ انسانیت کی فلاح و ترقی میں بھی لازمی طور پر اضافہ کرے گی۔ یہ ضروری ہے کہ ہماری قوم اپنے جذبہ قربانی کو زندہ رکھے اور اپنے اعلیٰ نصب العین پر قائم رہے۔ پھر قدرت اسے امور عالم میں ایک عظیم الشان مرتبہ عطا کرے گی۔ اور اسے انسانیت کی تاریخ میں زندہ جاوید بنا دے گی۔

جناب والا! یہ قوم زبردست کامیابیوں کی روایات رکھتی ہے۔ اس کی تاریخ شاندار کارناموں سے بھرپور ہے۔ اس نے زندگی کے ہر شعبہ میں کامیابی کے ساتھ پورا پورا حصہ لیا ہے۔ ہماری قوم کی بہادری کے کارنامے فوجی تاریخ کی زینت ہیں۔ یہ وہ قوم ہے جس کے ارباب نظم و نسق نے ایسی روایات قائم کی ہیں جو زمانہ کی دست برد سے اب تک محفوظ ہیں۔ اس کے تخلیقی فنون میں شعر و شاعری فن تعمیر اور جمالیاتی ذوق کے لیے اسے خراج تحسین ادا کیا گیا۔ روحانی عظمت کے لحاظ سے یہ قوم عدیم المثال ہے۔ اب پھر بھی قوم راہِ عمل میں گامزن ہے اور اگر اسے ضروری مواقع میسر آ جائیں تو وہ اپنی شاندار کامیابیوں کی سابقہ عظیم الشان

روایات کو ماند کر کے ان سے بہتر کام کر دکھائے گی یہ قرار داد مقاصد اس ماحول کے پیدا کرنے کی طرف پہلا قدم ہے جس میں قوم کی رُوح پھر بیدار ہو جائے گی۔ ہم لوگوں کو قدرت نے قوم کی اس نشأۃ ثانیہ کے زبردست ڈرامہ میں حصہ لینے کے لیے خواہ وہ حصہ کتنا ہی حقیر اور غیر اہم ہو منتخب کیا ہے۔ اور ہم ان زبردست گوناگوں مواقع سے جو ہمیں حاصل ہیں، محوِ حیرت ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ ہم ان مواقع سے خردمندی اور دُور اندیشی کے ساتھ فائدہ اُٹھائیں اور مجھے اس میں ذرا بھی شک نہیں ہے کہ اس اللہ کے فضل و کرم سے جس کی رحمت سے پاکستان قائم ہوا ہے۔ ہماری یہ کوششیں ہماری بڑی سے بڑی توقعات سے بڑھ چڑھ کر بار آور ہوں گی۔ بڑی قوموں کو اپنی میراث روز روز نہیں ملتی۔ قوموں کی نشأۃ ثانیہ کا باب ہر روز نہیں کھلتا۔ اور ہر روز قدرت مظلوموں اور محکوموں کو نہیں ابھارتی اور انھیں شاندار مستقبل کی طرف بڑھنے کی بار بار دعوت نہیں دیتی۔ روشنی کی کرنیں افق پر ہو کر طلوع ہونے والے روز روشن کا پیش خیمہ بن رہی ہیں۔ اور ہم اس تحریر کا اس قرارداد کی شکل میں خیر مقدم کرتے ہیں۔

## مولانا شبیر احمد عثمانی کی تقریر

قرار داد مقاصد کی تائید میں مولانا شبیر احمد عثمانی نے ۹ر مارچ ۱۹۴۹ء کو ذیل کی تقریر فرمائی۔

جناب صدر محترم! قرار داد مقاصد کے اعتبار سے جو مقدس اور محتاط تجویز آنریبل مسٹر لیاقت علی خاں صاحب نے ایوان ہذا کے سامنے پیش کی ہے۔ میں نہ صرف اس کی تائید کرتا ہوں بلکہ آج اس بیسویں صدی میں (جب کہ ملحدانہ نظریات حیات کی شدید کشمکش اپنے انتہائی عروج پر پہنچ چکی ہے) اسی چیز کے پیش کرنے پر موصوف کی عزم و ہمت اور جرأت ایمانی کو مبارک باد دیتا ہوں۔

## رُوح انسانیت کی کراہ

اگر غور کیا جائے تو یہ مبارک باد فی الحقیقت میری ذات کی طرف سے نہیں بلکہ پسی ہوئی اور کچلی ہوئی رُوح انسانیت کی جانب سے ہے جو خالص مادہ پرست طاقتوں کی حریفانہ حرص و آز اور رقیبانہ ہولناکیوں کے میدان کارزار میں مدتوں سے پڑی کراہ رہی ہے۔ اس کے کراہنے کی آوازیں اس قدر درد انگیز ہیں کہ بعض اوقات اس کے سنگدل قاتل بھی گھبرا اُٹھتے ہیں۔ اور اپنی جارحانہ حرکات پر نادم ہو کر تھوڑی دیر کے لیے مداوا تلاش کرنے لگتے ہیں۔ مگر پھر علاج و دوا کی جستجو میں وہ اس لیے ناکام رہتے ہیں کہ جو مرض کا اصل سبب ہے اسی کو دوا اور اکسیر سے سوا سمجھ لیا جاتا ہے۔

یاد رکھیے دنیا اپنے خود ساختہ اصولوں کے جس جال میں پھنس چکی ہے اس سے نکلنے کے لیے جس قدر پھڑپھڑائے گی اسی قدر جال کے حلقوں کی گرفت اور زیادہ سخت ہوتی جائے گی۔ وہ صحیح راستہ گم کر چکی ہے۔ اور جو راستہ اب اختیار کر رکھا ہے اس پر جتنے زور سے بھاگے گی وہ حقیقی نور و فلاح کی منزل سے دور ہی ہوتی چلی جائے گی۔

## لائن کی تبدیلی

ہمیں اپنے نظامِ حیات کو درست اور کامیاب بنانے کے لیے ضروری ہے کہ ہمارا انجن جس لائن پر اندھا دھند چلا جا رہا ہے، اسے تبدیل کریں۔ اور جس طرح بعض دفعہ لائن تبدیل کرتے وقت گاڑی کو کچھ پیچھے ہٹانا پڑتا ہے۔ ایسے ہی صحیح لائن پر آگے بڑھنے کی غرض سے ہم کو پیچھے ہٹنا پڑے تو کچھ مضائقہ نہیں۔ اگر ایک شخص کسی راستہ پر بے تحاشا دوڑ رہا ہے اور ہم دیکھیں کہ چند قدم آگے بڑھنے پر وہ کسی ہلاکت کے غار میں جا پڑے گا۔ تو ہم خاموش نہیں رہ سکتے۔ اسے ادھر سے پیچھے ہٹا کر صاف اور سیدھی شاہراہ پر ڈالنے

کی کوشش کریں گے۔ یہی حال آج دنیا کا ہے۔

## تجدید فکر و نظر

اگر ہماری اس تپتی اور بے چین دنیا کو اپنے تباہ کن مصائب سے چھٹکارا حاصل کرنا ہے تو اُسے حالات کا بالکل جڑ بنیاد سے از سرِ نو جائزہ لینا ہوگا۔ کسی درخت کی شاخوں اور پتوں پر پانی چھڑکتے رہنا بیکار ہے۔ اگر اس کی جڑ جو سینکڑوں من مٹی کے نیچے دبی ہوئی ہے مضبوط نہ ہو۔ آج کے بہت سے بکھرے ہوئے مسائل خواہ ان سے آپ کو کتنی ہی دلچسپی اور شغف کیوں نہ ہو، کبھی ٹھیک طور پر سنور اور سلجھ نہیں سکتے جب تک ان کے اصول بلکہ اصل الاصول درست نہ ہو جائے۔ قدامت پرست اور رجعت پرستی کے طعنوں سے نہ گھبرایئے بلکہ کشادہ دل و دماغ کے ساتھ ایک متجسس حق کی طرح الجھی ہوئی ڈور کا سرا کھینچنے کی کوشش کیجیے جو باتیں طاقتور اور ذی اقتدار قوموں کے زبردست پروپاگنڈے یا غیر شعوری طور پر ان کے حاکمانہ اقتدار اور مسحور کن مادی ترقیات کے زور سے بطور مسلمات عامہ، اصول موضوع اور مفروغ عنہا صداقتوں کے تسلیم کر لی گئی ہیں۔ ان پر ہی تجدید فکر و نظر کی ضرورت ہے۔ اس پکے ارادے کے ساتھ کہ جس چیز پر ہم صدیوں کی کاوش کے نتیجے میں اعتقاد جمائے بیٹھے تھے، وضوحِ حق کے بعد ایک لمحہ کے لیے اس پر قائم رہنا ہم جرمِ عظیم سمجھیں گے۔ اگر دنیا کو انسانیت کی حقیقی فلاح کے لیے کسی نتیجہ پر پہنچنا ہے تو اسے ان قدیم اور اٹل نظریات پر ازسرِ نو غور کرنا ہوگا جنھیں مادی اور معاشی مسابقت کی بے تحاشا دوڑ میں بہت سی قومیں پیچھے چھوڑ آئی ہیں۔

اسے یوں خیال کیجیے کہ کتنی صدیوں تک سکونِ ارضی کے متعلق بطلیموس کا نظریہ دنیا پر مستولی رہا۔ فیثاغورث کی آواز پر کسی نے توجہ نہ کی۔ پھر ایک وقت آیا کہ ہزاروں من مٹی کے

نیچے دبا ہوا بیج جو فتنا غورت دبا گیا تھا ۔ زمین کے سینے کو چاک کر کے باہر نکلا اور برگ و بار لا کر رہا۔ سچائی کا پرستار کبھی اس کی پروا نہیں کرتا کہ کسی زمانہ میں طویل عرصہ تک لوگ اس کو ماننے سے آنکھیں چرائیں گے یا ناک بھوں چڑھائیں گے ۔ حق اکیلا رہ کر بھی حق رہتا ہے ۔ اسے یقین ہے کہ ایک دن ضرور آئے گا جب اس کے جھٹلانے والے زمانہ کے دھکے سکے کھا کر اس کے دامن میں پناہ لینے پر مجبور ہوں گے ۔ آج وہ دن قریب آ رہا ہے اور جیسا کہ آنجہانی لیاقت علی خاں نے فرمایا روشنی کی سحر ہر افق پر ظاہر ہو کر طلوع ہونے والے روز روشن کا پیش خیمہ بن رہی ہے ۔

ضرورت ہے کہ ہم اپنے کو خفاش صفت ثابت نہ کریں جو دن کی روشنی کو دیکھنے کی تاب نہیں لا سکتی پاکستان مادیت کے بھنور میں پھنسی ہوئی اور دہریت و الحاد کی اندھیریوں میں بھٹکی ہوئی دنیا کو روشنی کا ایک مینار دکھانا چاہتا ہے ۔ یہ دنیا کے لیے کوئی چیلنج نہیں بلکہ انسانیت کے لیے پُر امن پیغام حیات و نجات ہے اور اطمینان اور خوش حالی کی راہ تلاش کرنے والوں کے لیے سہولت مہیا کرتا ہے ۔

## حدود و اختیارات

ہمارا غیر متزلزل عقیدہ ہے کہ دنیا کے لیے عموماً اور پاکستان کے لیے خصوصاً کسی قسم کا نظام تجویز کرنے سے پہلے پوری قطعیت کے ساتھ یہ جان لینا ضروری ہے کہ اس کائنات کا جس میں ہم سب اور ہماری یہ مملکت بھی شامل ہے ۔ مالک اصلی اور مالک حقیقی کون ہے ؟ اور ہے یا نہیں اب اگر ہم اس کا مالک کسی خالق الکل اور مقتدر اعلیٰ ہستی کو مانتے ہیں (جیسا کہ میں خیال کرتا ہوں کہ اس ایوان کے تمام ارکان و اعضاء کا یہ عقیدہ ہوگا) تو ہمارے لیے یہ تسلیم کرنا ناگزیر ہوگا کہ کسی مالک کی خصوصاً اس مالک علی الاطلاق کی ملک میں ہم اس حد تک تصرف کرنے کے مجاز ہیں جہاں تک کہ وہ اپنی مرضی سے ہمیں اجازت دیدے ملک غیر میں کوئی غاصبانہ تصرف ہمارے لیے جائز نہیں ہو سکتا ۔ پھر ظاہر ہے کہ کسی مالک کی اجازت و مرضی کا علم اس کے بتلانے سے

ین ہوسکتا ہے۔ سو اللہ تعالیٰ نے پیغمبر اسی لیے بھیجے اور وحی ربانی کا سلسلہ اسی لیے قائم کیا کہ انسانوں کو اس کی مرضی اور اجازت کے صحیح حدود معلوم کرا دیے جائیں اس نقطہ خیال کے پیش نظر ریز و پیش ہیں اس کے مقرر کردہ حدود کے اندر کے الفاظ رکھے گئے ہیں اور یہ وہ بنیادی نقطہ ہے جہاں سے دینی اور خالص مادی حکومتوں کی لائنیں ایک دوسرے سے الگ ہوجاتی ہیں۔

## تفریق دین و مذہب کی نفی

یہ نظریہ کہ دین و مذہب کا تعلق انسان اور اس کے مالک سے ہے بندوں کے باہمی معاملات سے اسے کچھ سروکار نہیں اور نہ سیاست میں اس کا کوئی دخل ہے۔ اسلام نے کبھی تسلیم نہیں کیا۔ ممکن ہے دوسرے مذاہب جو آج کل دنیا میں موجود ہیں ان کے نزدیک یہ نظریہ درست ہو اور وہ خود کسی جامع وحاوی نظام حیات سے تہی دامن ہوں۔ مگر جہاں تک اسلام کا تعلق ہے ایسے تصور کی اس میں گنجائش نہیں۔ بلکہ اس کی تمام تر تعلیمات اس باطل تصور کی دشمن ہیں۔

قائدِ اعظم مرحوم نے اگست ۱۹۴۴ء میں گاندھی جی کے نام جو خط لکھا تھا اس میں وہ لکھتے ہیں۔

"قرآن مسلمانوں کا ضابطہ حیات ہے۔ اس میں مذہبی اور مجلسی، دیوانی اور فوجداری، عسکری اور تعزیری، معاشی اور معاشرتی غرض کہ سب شعبوں کے احکام موجود ہیں۔ مذہبی رسوم سے لے کر روزانہ کے امور حیات تک، روح کی نجات سے لے کر جسم کی صحت تک، جماعت کے حقوق سے لے کر جماعت کے حقوق و فرائض تک دنیاوی زندگی میں جزا و سزا سے لے کر عقبیٰ کی جزا و سزا تک، ہر فعل، قول اور حرکت پر مکمل احکام کا مجموعہ ہے۔ لہٰذا جب میں یہ کہتا ہوں کہ مسلمان ایک قوم ہے تو حیات و مابعد حیات کے ہر معیار اور ہر مقدار کے مطابق کہتا ہوں۔"

ایک دوسرے موقعہ پر اُنھوں نے فرمایا۔

"ہر مسلمان جانتا ہے کہ قرآنی تعلیمات محض عبادات و اخلاقیات تک محدود نہیں بلکہ قرآن کریم مسلمانوں کا دین و ایمان اور قانون حیات ہے، یعنی مذہبی، معاشرتی، تجارتی، تمدنی، عسکری، عدالتی، اور تعزیری احکام کا مجموعہ ہے۔ ہمارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہم کو یہ حکم ہے کہ ہر مسلمان کے پاس اللہ کے کلام پاک کا ایک نسخہ ضرور ہو اور وہ اس کو بغور و خوض مطالعہ کرے۔ تاکہ یہ اس کی انفرادی اور اجتماعی ہدایات کا باعث ہو۔"

قائد اعظم نے ان خیالات وعزائم کا بار بار اظہار کیا ہے۔ کیا ایسی واضح اور کھلی تصریحات کے بعد بھی کوئی شخص یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہے کہ سیاست و حکومت مذہب سے کوئی علاقہ نہیں رکھتی۔ یا یہ کہ اگر آج قائد اعظم زندہ ہوتے تو یہ نتیجہ بے مقاصد پلیش نہیں ہو سکتی تھی۔

قرآن حکیم میں صاف صاف ارشاد ہے۔

فلا وربك لا يؤمنون حتى يحكموك فيما شجر بينهم ثم لا يجدوا في أنفسهم حرجا مما قضيت ويسلموا تسليما.

اور ومن لم يحكم بما أنزل الله فأولئك هم الكافرون ........... الظالمون ........ الفاسقون[1]

---

[1] ترجمہ: نہیں، اے محمد تمھارے رب کی قسم یہ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ باہمی اختلافات میں تم کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں، پھر جو کچھ تم فیصلہ کرو اس پر اپنے دلوں میں بھی کوئی تنگی محسوس نہ کریں بلکہ سربسر تسلیم کر لیں۔ (النساء - ۶۴)

"جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی کافر ہیں۔" (مائدہ: ۴۴)

(باقی اگلے صفحہ پر

## پاپائیت کی نفی

اس موقع پر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اسلام میں دینی حکومت کے معنی "پاپائیت" یا کلیسائی حکومت" کے نہیں۔ بھلا جس بُت کو قرآن نے "اتخذوا احبارھم ورھبانھم اربابًا من دون اللہ" کہہ کر[1] توڑا ہے کیا وہ اس کی پرستش کو جائز رکھ سکتا ہے۔

## حقیقی اسلامی حکومت

اسلامی حکومت سے مراد وہ حکومت ہے جو اسلام کے بنائے ہوئے اعلیٰ اور پاکیزہ اصولوں پر چلائی جائے۔ اس لحاظ سے وہ ایک خاص قسم کی اصولی حکومت ہوئی۔ ظاہر ہے کہ کسی اصولی حکومت کو چلانا خواہ مذہبی ہو یا غیر مذہبی (جیسے روس کی اشتراکی حکومت) دراصل ان ہی لوگوں کا کام ہو سکتا ہے ——— جو لوگ ان اصولوں کو مانتے ہوں جو لوگ ان اصولوں کو نہیں مانتے ایسی حکومت اور انتظام مملکت میں ان کی خدمات تو ضرور حاصل کر سکتی ہے مملکت کی جنرل پالیسی یا کلیدی انتظام کی باگ ان کے ہاتھ میں نہیں چھوڑی جا سکتی۔

اسلامی حکومت دراصل انسانی حکومت نہیں بلکہ نیابتی حکومت ہے۔ اصل حاکم خدا ہے۔ انسان زمین پر اس کا خلیفہ (نائب) ہے جو حکومت در حکومت کے اصول پر دوسرے مذہبی فرائض کی طرح نیابت کی ذمہ داریوں کو بھی خدا کی مقرر کردہ حدود کے اندر پورا کرنا ہے

---

(بقیہ صفحہ ۲۹۵)

"اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی ظالم ہیں"۔ (مائدہ: ۴۵)

"اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی فاسق ہیں"۔ (مائدہ: ۴۷)

[1] ترجمہ: انھوں نے اپنے علماء اور مشائخ کو اللہ کے سوا اپنا رب بنا لیا ہے۔ (توبہ: ۳۱)

ہے۔

مکمل اسلامی حکومت حکومت راشدہ ہوتی ہے۔ لفظ "رشد" حکومت کے انتہائی اعلیٰ معیار حسن وخوبی کو ظاہر کرتا ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ حکومت، حکومت کے کارکن اور مملکت کے عوام کو نیکو کار ہونا چاہیے۔ قرآن نے حکومت اسلامی کی یہی غرض وغایت قرار دی ہے کہ وہ انسانوں کو اپنے دائرہ اقتدار میں نیکیوں کا حکم دے اور برائیوں سے روکے۔ اسلام آج کل کی سرمایہ پرستی کے خلاف ہے۔ اسلامی حکومت اپنے خاص طریقوں سے، جو اشتراکی طریقوں سے الگ ہیں، جمع شدہ سرمایہ کی مناسب تقسیم کا حکم دیتی ہے۔ اس کو دائر وسائر رکھنا چاہتی ہے۔ مگر اس کام کو اخلاقی و نیز قانونی طریقہ پر خوشدلی عدل اور اعتدال کے ساتھ کرتی ہے۔ اسلامی حکومت شخصی ملکیت کی نفی نہیں کرتی۔ مناسب حد تک راس المال رکھنے کی اجازت دیتی ہے۔ زائد سرمایہ کے لیے ملی بیت المال قائم کرتی ہے۔ جس میں سب کے حقوق مشترک ہیں۔ اور اس سرمایہ کی تقسیم سے سرمایہ اور افلاس کے درمیان توازن اور اعتدال کو بحال رکھتی ہے۔

## شورائیت

شوریٰ اسلامی حکومت کی اصل ہے۔ (وامرھم شوریٰ بینھم۔ اپنے معاملات آپس کے مشورے سے چلاتے ہیں) اسلامی حکومت دنیا میں پہلا ادارہ جس نے شاہنشاہیت کو ختم کر کے استصواب رائے عامہ کا اصول جاری کیا۔ اور بادشاہ کی جگہ عوام کے انتخاب کردہ امام (قائد حکومت) کو عطا کی۔ محض توریث یا جبر واستبداد کے راستوں سے بادشاہ بن بیٹھنا اسلام کے سراسر خلاف ہے۔ وہ جمہور کی مرضی اور انہی کے ہاتھوں سے اسٹیٹ کو اختیار دلاتا ہے۔ ہاں انھیں یہ حق نہیں کہ وہ امارت کی کوئی تنظیم نہ کریں اور اقتدار اپنے ہی پاس روک کر انتشار، انارکی اور طوائف الملوکی پھیلا دیں۔ یہ اوّلیت کا ایسا شرف ہے جو اسلامی حکومت کو دنیا کی تمام جمہوریتوں پر حاصل ہے

اسلامی سلطنت کا بلند ترین منتہائے خیال یہ ہے کہ سلطنت کی بنا جغرافیائی، نسلی، قومی، حرفتی اور طبقاتی قیود سے بالاتر ہو کر انسانیت اور ان اعلیٰ اصولوں پہ ہو جن کی تشیید و ترویج کے لیے وہ قائم کی جاتی ہے۔

اسلامی حکومت پہلی حکومت ہے جس نے اس منتہائے خیال کو پورا کرنے کے لیے اپنی خلافتِ راشدہ کی بنیاد انسانیت پر رکھی۔ یہ حکومت اپنے کاموں میں، رائے عامہ، مساوات حقوق، آزادیٔ ضمیر اور سادگی کا امکانی حد تک خیال رکھتی ہے۔

## حقوق

اسلامی حکومت کا فرض ہے کہ اپنے قلمرو میں بسنے والے تمام غیر مسلموں سے جو شرائط طے ہوئے ہوں، جان، مال، آبرو، مذہبی آزادی اور عام شہری حقوق کی پوری حفاظت کرے۔ اگر کوئی طاقت ان کے جان و مال وغیرہ پر دست اندازی کرے تو حکومت اس سے جنگ کرے۔ اور ان پر کوئی ایسا بار نہ ڈالے جو ان کے لیے ناقابلِ تحمل ہو۔ جو ملک صلحاً حاصل ہوا ہو وہاں کے غیر مسلموں سے جو شرائط طے ہوں ان کی پوری پوری پابندی کی جائے۔ پھر غیر مسلموں کے یہ حقوق محض اکثریت کے رحم و کرم پر نہیں۔ بلکہ خدا کا عائد کیا ہوا ایک فرض ہے جس سے کسی وقت انحراف جائز نہیں۔

## افضل ترین حکومت

اس کے بعد دینی حکومت کی مزعومہ خرابیوں کا جہاں تک تعلق ہے، جواب میں اتنا کہنا کافی ہو گا کہ علم و تحقیق کی روشنی میں موجودہ ترقی یافتہ حکومتوں کے طور طریقوں کو خلفاء اربعہ کے بے داغ عہد حکومت کے مقابلہ میں رکھ کر مفادِ عامہ کے لحاظ سے وزن کر لیا جائے۔ آج ظلم و جبر، عہد شکنی، مالی دست برد، کشت و خون، بربادی و ہلاکت، انسانی جماعتوں کی

باہمی دشمنی، افراد کی عدم مساوات اور جمہور کے حقوق کی پامالی کی جو مثالیں دُور دین سے دیکھنے میں نظر آرہی ہیں، خلفاء کے ترقی یافتہ عہد میں ان کا خفیف سا نشان بھی نہ ملے گا۔ غرض کہ بیان کردہ خرابیاں مذہبی طرزِ حکومت کی خرابیاں نہیں ہیں۔ بلکہ ان انسانی گمراہیوں سے اخذ کی گئی ہیں، جنھوں نے خالص مادی طرزِ حکومت کی داغ بیل ڈالی ہے۔

مَیں سمجھتا ہوں کہ گاندھی جی نے اسی نکتہ کی طرف اشارہ کیا تھا جب ۱۹۳۷ء میں آپ نے کانگریسی وزراء کو یہ ہدایات دیں کہ "تم ابوبکرؓ اور عمرؓ کی سی حکومت قائم کرو"۔ نیز قائداعظم مرحوم نے دستور کی اسی اساس کی طرف اشارہ کیا تھا جب ۱۹۴۳ء میں بمقام جالندھر آل انڈیا مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کی صدارت کرتے ہُوئے فرمایا کہ "میرے خیال میں مسلمانوں کا طرزِ حکومت آج سے ساڑھے تیرہ سو سال قبل قرآن حکیم نے فیصلہ کر دیا تھا"۔ انھوں نے نومبر ۱۹۴۵ء میں پیر صاحب مانکی شریف کے نام جو خط لکھا اس میں صاف لکھ دیا تھا "اس بات کے کہنے کی ضرورت ہی نہیں کہ قانون بنانے والی جماعت جس میں بہت زیادہ اکثریت مسلمانوں کی ہوگی، پاکستان کے لیے ایسے قانون بنا سکے گی جو اسلامی قانون کے خلاف ہوں اور نہ ہی پاکستانی غیر اسلامی قانون پر عمل کر سکیں گے"۔ اس قسم کے اعلانات قیامِ پاکستان سے پہلے قائداعظم اور دوسرے زعماء لیگ کی طرف سے برابر ہوتے رہے جن کا بوجہ طوالت ہم استیعاب نہیں کر سکتے۔

## محرک قومی خصائص کا تحفظ

بہرحال ان بیانات کے پڑھنے کے بعد کسی مسلم یا غیر مسلم کو ہمارے مقصد اور مطمح نظر کے سمجھنے میں کوئی ابہام و اشتباہ نہیں رہ سکتا۔ اور جس قدر باتیں آئین اور نظامِ اسلامی کے متعلق بطور اعتراض آج کہی جا رہی ہیں، ان سب کے سوچنے کا وقت وہ تھا جب پوری صراحت کے ساتھ یہ اعلانات کیے جا رہے تھے۔ جب یہ سب کچھ جان کر اور سمجھ کر دوسری قوم نے

تقسیم سند کے فیصلے پر دستخط کیے اور پاکستان کی اقلیت نے ان مقاصد کو مانتے ہوئے ہمارے ساتھ اشتراک عمل کیا، اب پاکستان قائم ہونے کے بعد اس نقطہ سے انحراف کی کوئی وجہ جواز ان کے پاس موجود نہیں۔ انھیں یہ بھی معلوم ہے کہ انڈین یونین کا قیام تو ہندو اور نیشنلسٹ مسلمانوں کی مخلوط مساعی سے عمل میں آیا ہے لیکن پاکستان کا حصول خالص مسلم قوم کی مساعی اور قربانیوں کا رہین منت ہے۔ اور ان کے قومی خصائص و ممیزات کے تحفظ کا داعیہ اس کا محرک ہوا ہے۔ اب اگر ایسی سیدھی اور صاف بات کو بھی بھلا دیا جائے تو اس کا کوئی علاج ہمارے پاس نہیں۔

## اشتراکیت کا مقابلہ

اس موقع پر یہ بات بھی فراموش نہ کیجیے کہ آج دنیا میں معاشی اختلال اور اقتصادی عدم توازن کی وجہ سے ملحدانہ اشتراکیت (کمیونزم) کا سیلاب ہر طرف سے بڑھتا چلا آرہا ہے۔ اس کا صحیح اور اصولی مقابلہ اگر دنیا میں کوئی نظام کر سکتا ہے تو صرف اسلام کا اقتصادی نظام ہے۔ اگر ہم پاکستان یا عالم اسلامی کو اس ہیبت ناک خطرہ سے بچانا چاہتے ہیں تو اس کی واحد صورت یہی ہے کہ پاکستان میں صحیح اسلامی نظام کا اعلان اور آغاز کریں۔ اور تمام اسلامی ممالک کو اسلام کے نام پر اس کی دعوت دیں۔ اگر اس طرح تمام اسلامی ممالک آئینی طور پر متحد ہو گئے تو قدرتی طور پر وہ وحدت اسلامی قائم ہو جائے گی جس کی ہم سب شدت سے آرزو رکھتے ہیں۔ اور جو اشتراکیت و سرمایہ پرستی دونوں کی روک تھام کے لیے مضبوط آہنی دیوار کا کام دے گی۔

## واضح نصب العین

بہت سے لوگوں کو یہ خیال گزرتا ہے کہ ابھی تک ہمارا کاروبار جس ڈگر پر چل رہا ہے اسلام اور اسلامی آئین کا اعلان کر کے ہم اسے ایک دم کیسے بدل سکتے ہیں۔ یہ تو ہمارے اجتماعی معاملات میں

ایسا انقلاب عظیم ہوگا جو ہماری قومی زندگی کی کایا پلٹ کر رکھ دے گا اور جس کے لیے ہمیں جدید کانسٹی ٹیوشن کے چلانے کے لیے کثیر تعداد میں مناسب رجال کار تیار کرنے پڑیں گے۔ اور بہت طویل عرصہ درکار ہوگا۔ میں کہتا ہوں کہ ان حضرات کا یہ خیال ایک حد تک صحیح ہے لیکن اسلامی نظام کا مطالبہ کرنے والے بھی اسے بخوبی محسوس کرتے ہیں۔ اسلامی آئین و نظام کے اعلان سے غرض یہ ہے کہ مملکت کا اصل نصب العین اور اس کی انتہائی منزل مقصود واضح اور مستحضر ہو جائے۔ تاکہ اس کی روشنی میں ہمارا جو قدم اُٹھے وہ ہم کو آخری منزل سے قریب تر کرنے والا ہو۔ یہ کام ظاہر ہے کہ بتدریج ہوگا اور بتدریج ہی ہو سکتا ہے۔ جو کام فی الحال کیے جا سکتے ہیں وہ کرنے ہوں گے اور جن کاموں کے لیے سردست حالات سازگار نہیں وہ فوراً نفاذ پذیر نہ ہوں گے۔ بلکہ حکیمانہ اسلوب پر حالات کو سازگار بنانے کی ہر امکانی کوشش عمل میں لائی جائے گی۔ بہرحال انسان اسی چیز کا مکلف ہے۔ جس کی وہ استطاعت رکھتا ہے۔ یہی وہ بات ہے جو میں تقسیم سے قبل اپنے مختلف بیانات و خطبات میں کھول کر کہہ چکا ہوں چنانچہ خطبہ لاہور میں میں نے عرض کیا تھا کہ یہ اعلیٰ اور پاک نصب العین سے قریب تر کرے گا جس طرح رات کی تاریکی آہستہ آہستہ کم ہوتی اور دن کی روشنی بتدریج پھیلتی ہے یا جس طرح ایک پرانا مریض دھیرے دھیرے صحت کی طرف قدم اٹھاتا ہے۔ دفعتہً و بغتتہً بیماری سے چنگا نہیں ہو جاتا۔ اس طرح پاکستان ہماری قومی صحت اور ہماری مکمل ترین آزادی کے نصب العین کی طرف تدریجی قدم اُٹھائے گا۔

## ڈھیلا ڈھالا ریزولیشن

جناب صدر محترم! آخر میں ایوان ہذا کے معزز ممبران کی خدمت میں میں عرض کر دوں تاکہ اس ڈھیلے ڈھالے ریزولیشن سے گھبرانے اور وحشت کھانے کی کوئی وجہ نہیں۔ اسلامی فرقوں کے اختلافات تحریک پاکستان کی برکت سے بہت کم ہو چکے ہیں اور اگر کچھ باقی ہیں تو انشاءاللہ

برادرانہ مفاہمت سے صاف ہو جائیں گے۔ کیونکہ تمام اسلامی فرقے اور ملک آج اسلامی نظام کی ضرورت کو بہت شدت کے ساتھ محسوس کر رہے ہیں۔ اور میں تو سمجھتا ہوں کہ ہمارے غیر مسلم دوست بھی اگر ایک مرتبہ تھوڑا سا تجربہ کر کے دیکھ لیں گے تو اگلی اور پچھلی سب تلخیاں بھول جائیں گے۔ اور بہت مطمئن رہیں گے۔ بلکہ فخر کریں گے کہ ہم سب پاکستانیوں نے مل کر عام ہیجان اور اضطراب کے زمانہ میں انسانیت عامہ کی اس قدر عظیم الشان خدمت انجام دی۔ وما ذلك على الله بعزيز۔

اب بڑا اہم کام ہمارے سامنے یہ ہے کہ دستور ساز اسمبلی کی مہم ایسے قابل فہیم مضبوط اور محتاط ہاتھوں کے سپرد ہو جو اس ریزولیشن کے خاص خاص نکتوں کی حفاظت کر سکیں۔ اس کے فحوا کو بخوبی سمجھ سکیں۔ اور جو دستور تیار ہو جائے وہ صحیح لائن سے ہٹنے نہ پائے۔ یہ بہت کٹھن مرحلہ ہے۔ جو اللہ ہی کی توفیق سے آسان ہو گا بہرحال ہم آئندہ کے لیے کام کرتے ہیں۔ ہر قدم پر اس چیز کے منتظر رہیں گے۔ وباللہ التوفیق

اس کے بعد عام بحث مباحثہ شروع ہوا۔ تقاریر ہوئیں۔ بنگال کے ہندو ممبران نے قرارداد کی مخالفت کی۔

ظفر اللہ خاں وزیر خارجہ

اس تجویز کی تائید چودھری ظفر اللہ خاں وزیر خارجہ نے کی۔ انھوں نے کہا۔

یہ خیال کہ مذہب اور سیاست جدا جدا چیزیں ہیں، مذہب کے غلط تصور سے پیدا ہوتا ہے اسلام انسان اور انسان کے تمام تعلقات کے قواعد وضع کرتا ہے۔ اسلام میں عبادت کے معنی صرف بندگی اور پرستش کے ہی نہیں ہیں بلکہ ان اعمال کو بھی عبادت کہا گیا ہے جو انفرادی اور اجتماعی قومی اور بین الاقوامی مفاد کے لیے کیے جاتے ہیں۔ اسلام نہ شہنشاہیت نہ ملوکیت۔ اسلامی دستور میں فرد کے ووٹ (رائے) کو غیر معمولی اہمیت دی گئی ہے۔ اور اختیارات

کے وارث عوام ہوتے ہیں نہ چند افراد۔ یہ قرارداد تمام مضمرات کی حامل ہے۔

ڈاکٹر عمر حیات ملک نے کہا۔

"دنیا میں صرف دو نظریے ہی کارفرما نہیں ہیں یعنی سرمایہ داری اور کمیونزم بلکہ ایک تیسرا نظریہ حیات بھی ہے اور وہ ہے اسلام جو اس قرارداد کی روح ہے"

ڈاکٹر محمود حسین نائب وزیر خارجہ نے کہا۔

یہ تجویز سیاسی ارتقاء کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے کہا۔

پاکستان میں لادینی حکومت کا تصور کبھی کامیاب ثابت نہیں ہو سکتا۔

بیگم شائستہ اکرام اللہ نے کہا۔

قرارداد مقاصد کے بعد اسلامی حکومت کا قیام ناگزیر ہے۔ لیکن ہمارا فرض ہے کہ ہم نے جو کچھ کہا ہے اس پر عمل بھی کر کے دکھائیں۔

میاں افتخار الدین (حزب اختلاف کے لیڈر اور بائیں بازو کے ترجمان) نے کہا۔

"اگر ہم رومن قوانین، برطانوی پارلیمانی نظام اور ایسی ہی دوسری اصطلاحیں استعمال کرتے ہوئے نہیں شرماتے تو پھر اسلامی قانون کی اصطلاح سے بدکنا کیا معنی۔ اگر ہم دنیا کو ایک مناسب اسلامی دستور دینے میں کامیاب ہو جائیں تو یقیناً یہ ایک بڑا کارنامہ انجام دیں گے۔ اسلام کا تصور ریاست اتنا ہی ترقی پسندانہ، انقلابی، جمہوری اور فعال ہے جتنا کہ شاید ہی دنیا کا کوئی اور تصور ریاست ہو سکتا ہے۔

اس کے بعد یہ قرارداد ۱۲ مارچ ۱۹۴۹ء کو بالاتفاق منظور ہوئی۔

● بنگال کے ہندو ممبران نے البتہ اس کی مخالفت کی تھی۔ [۵]

ان کا جواب دیتے ہوئے وزیرِ اعظم لیاقت علی خاں نے کہا۔

"دُنیا مادیت کا شکار ہے، اور ہم پاکستان میں ایک ایسے معاشرے کو جنم دینا چاہتے ہیں جو انسانیت کے لیے مشعلِ راہ ہو۔ ہم انشاء اللہ اس قرارداد کے مضمرات کو عملی صُورت دینے کی پُوری کوشش کریں گے۔

## قرارداد کی خصوصیت

۱۔ یہ قرارداد اس دستور ساز اسمبلی نے پاس کی جس کے تمام ممبران ہندوستان میں انتخاب کے ذریعہ منتخب ہوئے تھے۔

۲۔ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے پاکستان کے حصول کی جد و جہد میں عملاً حصّہ لیا تھا۔

۳۔ اس قرارداد کو تمام مُسلمان ممبروں نے متفقہ طور پر منظور کیا تھا۔ کسی ایک ممبر نے بھی مخالفت نہیں کی۔ البتہ ہندو ممبروں نے مخالفت کی تھی۔

۴۔ اس لیے یہ قرارداد جد و جہد پاکستان کا مقصود ہے۔ یہ قرارداد مُسلمانانِ ہند و پاکستان کے دل کی آواز ہے۔

## قرارداد کی عالمی اہمیت

اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اعلیٰ کو تسلیم کرنا اور سیاسی، معاشی اور معاشرتی زندگی کو احکام الٰہی کی متابعت میں بسر کرنا ایک مُسلمان کے ایمان کا تقاضا ہے۔ مگر موجودہ سیاسی دنیا میں یہ ایک انقلاب انگیز اعلان ہے۔ قابلِ مُبارک باد ہیں پاکستان کے مُسلمان جنھوں نے ساری دُنیا

---

۵۔ (اخبار زمیندار۔ لاہور۔ ۱۳ مارچ ۱۹۴۹ء)

کے علی الرغم یہ ایمان افروز اعلان کیا۔ اس اعلان کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔

گزشتہ دو صدیوں سے یورپ کا بلکہ تقریباً ساری دنیا کا سیاسی مسلک لادینیت رہا ہے۔ سب سے پہلے فرانس کے فری میسن لاج نے ۱۷۷۶ء میں لادینی طرز زندگی کا نظریہ پیش کیا تھا ــــــــ (سیکیولرزم) اس نے مذہب کو انسانی زندگی میں ایک مؤثر قوت ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ ان کے پروپاگنڈے نے انقلاب فرانس برپا کیا۔ انقلاب فرانس ۱۷۸۹ء کے بعد فرانس کے عوام نے لادینیت کا نظریہ قبول کر لیا وہاں کے فلسفیوں اور مفکروں نے زندگی کے مظاہرات کو لادینی نظریہ کے مطابق مرتب کر ڈالا۔ انقلاب روس ۱۹۱۷ء نے

لا کلیسا، لا سلاطین، لا اِلٰہ

کا نعرہ بلند کیا۔ لادینیت کی اس یلغار کے سامنے عالم اسلام کے قدیم ترین اور مقدس ترین ادارہ "خلافت اسلامیہ" کو بھی مصطفیٰ کمال نے ۱۹۲۴ء میں ختم کر دیا اور ترکیہ نے لادینی نظریہ قبول کر لیا۔ اس کے بعد دوسرے اسلامی ممالک نے بھی ترکی کی تقلید میں دین و دنیا کی تفریق کا نظریہ قبول کر لیا۔

اس پس منظر میں پاکستان کا اس قرارداد کو منظور کرنا بہت بڑا انقلابی قدم ہے۔ یہ قرارداد منظور کر کے پاکستان نے دوبارہ حاکمیت اللہ اور حاکمیت شریعت کا اعلان کر دیا۔ لادینیت کے خلاف زبردست آواز بلند کی۔ لادینیت کی رو کے خلاف پہلی مزاحمت کھڑی کی۔ اس کے بعد ہی دوسرے مسلمان ممالک میں اسلامی حکومت اور اسلامی نظام زندگی کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔[1]

---

[1] پاکستان میں عوام نے اس قرارداد کا کس طرح استقبال کیا۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ راقم مولانا سید وصی مظہر ندوی اور پروفیسر بدر الدین مرحوم (راجہ۔ اے فلاسفی علیگ) مولانا محمود الوری کی نشست گاہ واقع حیدر آباد حیدر آباد میں بیٹھے ہوئے

# مسلمانوں کے اجتماعی ذہن کی تشکیل

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں مسلمان بُری طرح کچلے گئے۔ انگریز نے ان کو سیاسی اور معاشی بُری طرح تباہ و برباد کر ڈالا۔ سرسید احمد خاں آگے بڑھے انھوں نے مسلمانوں کے تحفظ وجود کے لیے جدوجہد کی۔ ان کو افلاس اور ادبار کے گڑھے سے باہر نکالا۔ علماء نے دینی اور علمی سرمایہ کے تحفظ کی کوشش کی اور مدارس قائم کیے۔ جب ذرا حالات میں ٹھہراؤ پیدا ہوا تو مولانا حالی نے پیش قدمی کی۔ مسدس لکھ کر قوم کو پُرانی عظمت یاد دلائی۔ حوصلہ دیا اور ناامیدی دُور کرنے کی کوشش کی۔ مولانا شبلی نے اسلامی تاریخ اور تہذیب کے اسباق قوم کو سنائے۔ ان کے اندر ملی شعور بیدار کیا۔ جدید تعلیم پاکر جب نئی نسل بدراہ ہونے لگی تو اکبرالہ آبادی نے طنز و تعریض کے نشتر چبھوئے اور قوم کو بدراہی سے روکا۔ مغربی طور طریقوں کا مذاق اڑایا۔ اور اسلامی اقدار کو عوامی انداز میں پیش کیا۔ اس دور میں اصل اسلام کی دعوت نہایت زوردار طریقہ سے رسالہ الہلال کے ذریعہ مولانا ابوالکلام آزاد نے پیش کی۔ یہ آواز مدرسوں، خانقاہوں، اور کالجوں میں یک وقت گونجی۔ مگر مولانا نے جلدی ہی خاموشی اختیار کرلی۔ اذان دے کر وہ چلے گئے۔ پھر علامہ اقبال میدان میں آئے۔ مغربی تہذیب پر ان کی تنقید شنید نہیں دید تھی۔ انہوں نے اسلامی عظمت کو اس انداز سے پیش کیا جس نے مسلمانوں کے دلوں میں گھر کرلیا۔ ان کے کلام میں نہایت زوردار عنصر مستقبل بینی کا ہے۔ انہوں نے دوبارہ اسلام کے غلبہ کی

---

(ص)

تھے جب ہا کر نے قرارداد کے منظور ہوجانے کی خبر سنائی۔ خبر سنتے ہی پروفیسر بدرالدین سجدہ میں گر پڑے۔ ان کی آنکھیں اشکبار تھیں۔ اور وہ کہہ رہے تھے۔ بار الٰہا آج تیری حاکمیت کا اعلان ہُوا ہے۔

پیشین گوئی کی۔ آخر میں مولانا مودودی میدان میں آتے۔ انہوں نے اسلام کے نظامِ حیات کو مربوط و منظم انداز میں پیش کیا۔ مغربی تہذیب پر اس کی برتری کو واضح کیا۔ جو بات کی دلیل اور برہان کے ساتھ کی۔ مستقبل کی صورت گری کے لیے اسلامی نظامِ حیات کے اجتماعی پہلوؤں کو نمایاں کیا۔ علمی دنیا میں اسلامی نظامِ حیات کے لیے ایک وقیع مقام پیدا کیا۔

اتنے سارے مختلف افراد کی کوششوں سے ہند و پاکستان کے مسلمانوں کے اجتماعی ذہن کی تشکیل ہوتی ہے۔ بتدریج قدم اسلام کی جانب بڑھتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ قرارداد مقاصد پاس ہوگئی اور اللہ کی حاکمیت کا اعلان ہوگیا۔

---

# مراجع


۱۔ ابوالحسن اصفہانی، قائد اعظم میری نظر میں۔

۲۔ ابوالکلام آزاد، مسئلہ خلافت۔

۳۔ اشتیاق حسین قریشی، نظریہ پاکستان اور اس کے مضمرات۔ آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگریس، لاہور

۴۔ افتخار عالم مارہروی، تاریخ مدرستہ العلوم علی گڑھ، مطبع مفید عالم آگرہ، ۱۹۰۱ء

۵۔ البیرونی، کتاب الہند۔

۶۔ الطاف حسین حالی، حیاتِ جاوید، مطبع مفید عالم آگرہ، ۱۹۰۳ء

۷۔ اللہ بخش یوسفی، سرحد اور جدوجہد آزادی، مرکزی اردو بورڈ لاہور ۱۹۶۸

۸۔ امجد علی مولانا، بہارِ شریعت، جلد نہم، غلام علی اینڈ سنز لاہور، ۱۹۴۸ء

۹۔ امیر علی خاں بہادر، منشی، جہاد جسے کہ شیعہ سمجھتے ہیں بحوالہ ولیم ہنٹر، کلکتہ ۱۸۷۱ء

۱۰۔ امداد صابری دہلوی، فرنگیوں کا جال، مطبع فاروقی پریس، دہلی۔

۱۱۔ انیس شاہ جیلانی، خطوط غلام رسول مہر، لاہور، ۱۹۸۴ء

۱۲۔ انوار الحسن شیرکوٹی، خطباتِ عثمانی، نذر سنز سرکلر روڈ لاہور، ۱۹۷۳ء

۱۳۔ باری علیگ، کمپنی کی حکومت، نیا ادارہ، لاہور، ۱۹۶۵ء

۱۴۔ جواہر لعل نہرو، پنڈت، میری کہانی، جلد دوئم، جامعہ ملیہ دہلی۔

۱۵۔ چراغ علی، مولوی، اعظم الکلام فی ارتقاء الاسلام

۱۶۔ چوہدری محمد علی، ظہورِ پاکستان۔

۱۷۔ حاجی لق لق، افتخارِ پاکستان، سیٹھ آدم ۸۔ نولکھا بازار، لاہور

۱۸۔ حسن ریاض، سید، پاکستان ناگزیر تھا، شعبہ تصنیف و تالیف، جامعہ کراچی، ۱۹۷۰ء

۱۹۔ خلیق احمد نظامی، شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات۔

۲۰۔ خلیل اللہ ربانی، مولانا، خبد حریت، مطبع خیہ نو پریس۔

۲۱۔ خورشید احمد، تحریکِ پاکستان اور مولانا مودودی، جماعت اسلامی صوبہ پنجاب۔

۲۲۔ خورشید احمد، ادبیاتِ مودودی، اسلامک پبلیکیشنز، لاہور، ۱۹۷۶ء

۲۳۔ خورشید احمد، نظریہ پاکستان اور اسلامی آئیڈیالوجی، ادارۂ مطبوعات فورس کراچی، ۱۹۶۵ء

۲۴۔ خوندکر فضل ربی، منشی، حقیقت مسلمانانِ بنگالہ، دیوان سیاست مستند آباد، کراچی، ۱۹۷۲ء۔

۲۵۔ رحمت اللہ کیرانوی، مولانا، میزان الحق۔

۲۶۔ رئیس احمد جعفری، سیرتِ محمد علی۔

۲۷۔ رئیس احمد جعفری، اوراقِ گم گشتہ، محمد علی اکیڈمی، لاہور، ۱۹۶۸ء

۲۸۔ زین الدین جبری، تحفۃ المجاہدین، عربی مخطوطہ، شاہ ولی اللہ اورینٹل کالج، منصورہ۔

۲۹۔ سرسید احمد خاں، اسبابِ بغاوتِ ہند، پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی، کراچی۔

۳۰۔ سرفراز حسین مرزا، تصورِ پاکستان سے قرار دادِ مقاصد تک، لاہور، ۱۹۸۵ء

۳۱۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی، تحریکِ آزادیٔ ہند اور مسلمان، حصہ اول، اسلامک پبلیکیشنز لاہور، ۱۹۷۵ء

۳۱۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی، تحریکِ آزادیٔ ہند اور مسلمان، حصہ دوم، اسلامک پبلیکیشنز لاہور، ۱۹۷۵ء

۳۲۔ سید سلیمان ندوی، خطباتِ مدارس، ناشران قرآن لمیٹڈ، لاہور۔

۲۴۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، فتاویٰ عزیزیہ، مطبع دہلی، ۱۹۰۴ء

۲۵۔ شاہ ولی اللہ دہلوی، ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء (مترجم)، جلد اول، مطبع رشیدیہ، ساہیوال۔

۲۶۔ شبیر احمد عثمانی، علامہ، خطباتِ عثمانی، بازار سریاں والا، لاہور، ۱۹۴۶ء

۲۷۔ شیخ محمد رفیق، پروفیسر، تاریخ پاکستان، کلی بک سنز، لاہور۔

۲۸۔ صدیق علیخاں، نواب، بے تیغ سپاہی، الائیڈ کارپوریشن، کراچی، ۱۹۷۱ء

۲۹ طفیل احمد منگلوری، مولانا سید، مسلمانوں کا روشن مستقبل، بدایوں، ۱۹۳۹ء

۳۰ عاشق الٰہی میرٹھی، تذکرۃ الخلیل، کراچی ۱۹۷۱ء

۳۱ عبدالرشید ارشد، بیس بڑے علماء، مکتبہ رشیدیہ، لاہور۔

۳۲ عبدالرشید، سید، اقبال اور پاکستان، ادارہ تنویرات، پیر الٰہی بخش کالونی، کراچی۔

۳۳ عبداللہ ملک، بنگال مسلمانوں کی صد سالہ جدوجہد آزادی، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۰ء

۳۴ عبداللہ یوسف علی، علامہ، انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ، اردو ترجمہ، کراچی ۱۹۰ء

۳۵ عبدالستار خاں، مولوی، تاریخ مدرسہ عالیہ، ڈھاکہ۔

۳۶ عبدالماجد دریا آبادی، مولانا، تفسیر القرآن، تاج کمپنی، لاہور، ۱۹۰۳ء

۳۷ غلام رسول مہر، مولانا، سرگزشت مجاہدین، غلام علی اینڈ سنز، لاہور۔

۳۸ فاطمہ جناح، میرا بھائی، قائدِ اعظم سوسائٹی، گورنمنٹ کالج باغبانپورہ، لاہور، ۱۹۷۸ء

۳۹ فضل حق خیر آبادی، ترجمہ عبدالشاہد شیروانی، مکتبہ قادریہ، لاہور، ۱۹۷۴ء

۵۰ کمال الدین حیدر رزاز، قیصر التواریخ، نول کشور پریس، لکھنؤ، ۱۹۰۷ء

۵۱۔ مالک رام، خطباتِ آزاد، دہلی ۱۹۷۴ء

۵۲۔ محسن الملک، ایڈریس اینڈ اسپیچس متعلق محمڈن اینگلو اورینٹل کالج، علیگڑھ انسٹیٹیوٹ پریس علیگڑھ ۱۸۸۲ء

۵۳۔ محمد اکرام شیخ، آبِ کوثر، ادارہ ثقافتِ اسلامی، لاہور ۱۹۷۵ء

۵۴۔ محمد اکرام شیخ، موجِ کوثر، ادارہ ثقافتِ اسلامی، لاہور، ۱۹۷۵ء

۵۵۔ محمد اکرام شیخ، رودِ کوثر، ادارہ ثقافتِ اسلامی، لاہور، ۱۹۷۵ء

٥٦۔ محمد حسین بٹالوی، مولوی، اشاعۃ السنہ (ماہنامہ) فروری ١٨٨٧ء

٥٧۔ محمد حسین زبیری و سید ضیاء الحسن زیدی، اینگلو عربک کالج و سکول، کراچی۔

٥٨۔ محمود احمد برکاتی، فضل حق خیر آبادی اور سن ستاون، برکات اکیڈمی، کراچی ١٩٧٥ء

٥٩۔ مسعود عالم ندوی، مولانا، برصغیر ہند و پاکستان میں اسلامی تحریک کی تاریخ، اسلامی پبلیکیشنز، لاہور ١٩٦٧ء

٦٠۔ مسعود عالم ندوی، مولانا، ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک، مطبوعات سلیمان، لاہور ١٩٧٥ء

٦١۔ مظفر حسین، نظریہ پاکستان، آل پاکستان ایجوکیشن کانگرس، لاہور۔

٦٢۔ معین الدین عقیل، ڈاکٹر، تحریک آزادی میں اردو کا حصہ، انجمن ترقی اردو، کراچی ١٩٧٦ء

٦٣۔ منظور نعمانی، مضمون، میثاق، فروری ١٩٨٥ء

٦٤۔ منوچی نیسی، مترجم ملک راج شرما، ہندوستان عہد مغلیہ میں، اسٹیم پریس، لاہور۔

٦٥۔ مولانا محمد اسحاق بھٹی، فقہائے ہند، تیرہویں صدی، ادارۂ ثقافت اسلامیہ لاہور ١٩٧٤ء

٦٦۔ مولانا محمد میاں، ہندوستانی مسلمان اور تحریک آزادی، الجمعیۃ بک ڈپو، دہلی ١٩٧٥ء

٦٧۔ مولانا محمد میاں، علماء کا شاندار ماضی، الجمعیۃ بک ڈپو، دہلی، ١٨٥٧ء

٦٨۔ مولانا عبیداللہ سندھی، شاہ ولی اللہ دہلوی اور سیاسی تحاریک، سندھ ساگر اکیڈمی، لاہور ١٩٥٢ء

٦٩۔ مرزا احمد علی قبلہ، لوح باب و بہا، امامیہ مشن، لاہور۔

٧٠۔ مولوی محمد علی قصوری، مشاہدات کابل و یاغستان، انجمن ترقی اردو، کراچی۔

٧١۔ نذیر احمد دہلوی، ڈپٹی، الحقوق والفرائض، جلد اول، افضل المطابع، دہلی، ١٣٢٢ھ

٧٢۔ نظامی بدایونی، قاموس المشاہیر، بدایوں ١٩٢٤ء

٧٣۔ خطبات سرسید احمد خان، مجلس ترقی ادب، لاہور ١٩٧٥ء

٧٤۔ مقالات سرسید، مجلس ترقی ادب، لاہور، لاہور ١٩٦٤ء

٧٥۔ مقالات محمد حسین آزاد، حصہ دوم، مجلس ترقی ادب لاہور ١٩٦٦ء

٧٦۔ مجلہ علم و آگہی، مولانا محمد علی جوہر نمبر، گورنمنٹ نیشنل کالج، کراچی۔

٧٧۔ مجلہ علم و آگہی، قائداعظم نمبر، گورنمنٹ نیشنل کالج، کراچی۔

۷۸۔ مجلہ علم و آگہی' تحریکات ملی نمبر' گورنمنٹ نیشنل کالج' کراچی' ۱۹۸۳ء

۷۹۔ مجلہ علم و آگہی' تاریخ پاکستان نمبر' گورنمنٹ نیشنل کالج' کراچی' ۱۹۸۴ء

. Allan, O. Hume, Founder of Congress, Madras.

. Aziz-ur-Rehman, Mullick, British Policy and the Muslims in Bengal, Dacca, 1961.

. B.D. Basu, Major, The Rise of Charistian Power in India, Calcatta, 1922.

. Burhan Ahmad Farooqi, Dr. Essentials of ideology of Pakistan, All Pakistan Islamic educational congress, Lahore.

. Father Felix, Mughal Farmans Pervanah & Sanad (with jesuit mission agra) Agra, 1913.

. F.E. Kaly, History of Hindi Literature.

. F.K. Durrani, A Plan of Muslim educational reform, Ghulam Ali & Sons, Lahore.

. Henry Herrington Thomas, Indian rebellion and our policy.

. Ishtiaq Hussain Qureshi, Dr, Education in Pakistan, Aarafat publication, Karachi, 1974.

. Ishtiaq Hussain Qureshi, Dr, Ulema in Politics, Maarif Limited, Karachi, 1972.

1. Jameel-ud-Din Ahmad Khan, Writings and speeches of Mohammad Ali Jinnah.

. **John Clark Marshman, Abridgement of, the History of India, London, 1873.**

. Kamal Yar Jang Educational Report, Calcatta, 1942. Making of India, London, 1915.

4. Lajpat Rai, Young India, Lahore, 1927.

5. Moeemud Din Ahmad Khan, Dr, Muslim Struggle for freedom in Bengal, Dacca, 1960.

6. Mohajin, History of India after 1526, Delhi, 1962.

17. Mohammad Asad, Islam at the cross road, Ashraf publications Lahore, 1963.

18. Mohammad Moeemud Din Ahmad Khan, Faqir movement in Bengal, Dacca.

19. ______________________________, Fraizi movement in Bengal, Dacca.

20. O.K. Nambiar, The Kunjalis, Bombay, 1967.

21. Palme Dutt, Economic History of India.

22. Palme Dutt, India Today.

23. Qadeer-ud-Din Ahmad, Pakistan Facts & Fallacies, Royal Book Co., Karachi, 1979.

24. Rechter, History of Missions in India.

25. Tana Chand Dr., History of freedom movement.

26. W.W. Hunter, The Indian Musalman, Lahore, 1974.

27. Z.A. Ahmad, National language for India, Kitabistan Allahabad, 1951.

# مطبوعاتِ ادارہ تعلیمی تحقیق

| | |
|---|---|
| مسلمان اور مغربی تعلیم (پاک و ہند میں) | پروفیسر سید محمد سلیم |
| تاریخ نظریہ پاکستان | " " " " |
| مسلمان مثالی اساتذہ اور مثالی طلبہ | " " " " |
| اسلام کا نظریۂ تعلیم | " " " " |
| مغربی نظامِ تعلیم، ملی نقطۂ نظر سے | " " " " |
| قرآن کا تصورِ تعلیم | " " " " |
| رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیت معلّم | نعیم صدیقی |
| اسلام کا نظریۂ تعلیم | پروفیسر خورشید احمد |
| نظامِ تعلیم کی اسلامی تشکیلِ جدید | تقاریر کل پاکستان تعلیمی کانفرنس ۱۹۷۸ء |
| آغازِ اسلام میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم (عہد بنی امیہ تک) | پروفیسر سید محمد سلیم |
| مشنری تعلیمی اداروں کا تنقیدی جائزہ۔ | " " " " |
| تعلیمی انحطاط کے اسباب | " " " " |
| مسلمان اساتذہ کا مثالی کردار | " " " " |
| احیائے اسلام اور معلّم | خرم جاہ مراد |
| مغربی فلسفۂ تعلیم کا تنقیدی مطالعہ | پروفیسر سید محمد سلیم |
| مسلمان خواتین کی دینی اور علمی خدمات | " " " |